

# برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

محمد اسحاق بھٹی

[www.ircpk.com](http://www.ircpk.com)

مکتبہ قدوسیہ لاہور

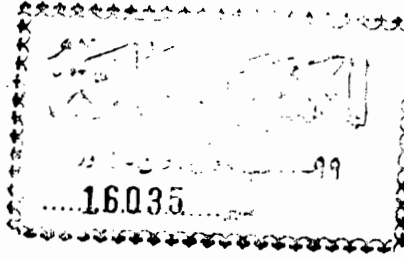
برصغیر میں  
اہل حشر کی آمد

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ  
ساز و بازار  
لاہور

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

کتاب و سنت  
کی  
تشریحات  
کے  
کوشش



اشاعت — 2004ء

ابوبکر قدوسی نے سوئٹس پر پریس سے چھپوا کر شائع کی۔

Ph: 042-7230585-7351124

Email: qadusie@brain.net.pk

مکتبہ قدوسیہ

رحمان مارکیٹ • غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور پاکستان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

## فہرست مضامین

۳۳	خُن ہائے گفتنی	۱۳	اہل حدیث کے متعلق چند اصحاب علم کے ارشادات
۴۲	اہل حدیث اور ان کا شرف و امتیاز	۱۳	اہل حدیث کی تعریف
۵۷	حرف چند	۱۴	برصغیر میں اہل حدیث کی خدمت حدیث
	برصغیر میں اہل حدیث کا پہلا	۱۵	خیر القرون میں صرف اہل حدیث ہی تھے۔
۶۷	کارواں۔۔۔۔۔ صحابہ کرام	۱۶	اہل حدیث کا عقیدہ
۶۸	حضرت عمر فاروق کا عہد خلافت	۱۷	لقب اہل حدیث
۶۸	حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی	۱۸	تحریک اہل حدیث کے اثرات
۶۹	حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی	۱۹	صرف کتاب و سنت
۷۰	حضرت مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی	۲۱	اہل حدیث کا عقیدہ اور نصب العین
۷۱	حضرت ربیع بن زیاد حارثی مدنی	۲۴	اصل اسلام
۷۲	حضرت حکم بن عمرو ثقفی غفاری	۲۵	ساحل ہند پر اہل حدیث کا پہلا قافلہ
۷۳	حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاری	۲۶	قرآن و حدیث کی تعلیم کا اصل مقصد
۷۳	حضرت بہل بن عدی خزرجی انصاری	۲۷	جماعت اہل حدیث کا طرہ امتیاز
۷۴	حضرت شہاب بن حارث بن شہاب حبشی	۲۸	جماعت اہل حدیث۔۔۔ قدیم جماعت
۷۴	حضرت صحر بن عباس عبیدی		پہلا باب
۷۵	حضرت عاصم بن عمر حبشی		عرض ناشر
۷۶	حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی	۳۱	
۷۶	حضرت نسیم بن دہیم بن ثور غلی		



۹۱	حاتم بن قبیصہؓ	۷۷	حضرت عثمان کا دور خلافت
۹۱	حکم بن منذر عابدی	۷۷	حضرت حکیم بن جبلة عابدی
۹۲	راشد بن عمرو بن قیس ازدی	۷۹	حضرت عبید اللہ بن معمر تمیمی
۹۲	زائندہ بن عمیر طائی کوفی	۷۹	حضرت عمیر بن عثمان بن سعد
۹۲	زیادہ بن حواری عی	۷۹	حضرت مجاشع بن مسعود سلیمی
۹۳	ابو قیس زیاد بن ربیع قیس بصری	۸۱	حضرت عبدالرحمن بن سرہ قرشی
۹۳	حکم بن عوانہ کلبی	۸۲	حضرت علی کا عہد خلافت
۹۳	معاویہ بن قرہ مزنی بصری	۸۲	حضرت خریث بن راشد ناجی ساسی
۹۵	مکحول بن عبداللہ سندھی	۸۳	حضرت عبداللہ بن سوید تمیمی
۹۵	عبدالرحمن بن عباس	۸۳	حضرت کلیب ابو اہل
۹۶	عبدالرحمان سندھی	۸۳	حضرت معاویہ کا عہد خلافت
۹۶	قطن بن مدرک کلابی	۸۴	حضرت مہلب بن ابومفرہ ازدی عسکری
۹۷	قیس بن ثعلبہ	۸۵	عبداللہ بن سوار عابدی
۹۷	کبیس بن حسن بصری	۸۵	حضرت یاسر بن سوار عابدی
۹۷	یزید بن ابوکبشہ سکسکی دمشقی	۸۵	حضرت سنان بن سلمہ ہذلی
۹۸	موئیلانی	۸۷	یزید کا زمانہ حکومت
۹۸	موئیل بن یعقوب ثقفی	۸۷	حضرت جارد عابدی
۹۹	عبدالرحمان کندی		دوسرا باب
۹۹	عبدالرحمان ہیلانی	۸۹	برصغیر میں اہل حدیث کا دوسرا کارواں
۱۰۰	عمر بن عبید اللہ قرشی تمیمی	۸۹	تابعین کرام
۱۰۱	شمر بن عطیہ بن عبدالرحمان اسعدی	۹۰	ابن اسید بن انض
۱۰۱	سعید بن اسلم کلابی	۹۰	ابوشیبہ جوہری
۱۰۱	سعید بن کندی قشیری	۹۰	تاغریبن ذمر

۱۱۷	ایک اور فتنہ	۱۰۲	سجد بن ہشام انصاری
۱۱۸	راجہ داکر کے آدمیوں کا کشتیوں پر حملہ	۱۰۲	حباب بن فضال ذہلی
۱۲۰	بری اور بحری فوج	۱۰۳	عبدالرحمان بن عبداللہ
	چوتھا باب	۱۰۳	حارث بن مرہ عبدی
	برصغیر میں اہل حدیث کا	۱۰۵	حارث ہلمانی
۱۲۳	چوتھا کارواں	۱۰۵	ایوب بن زید ہلالی
۱۲۳	تبع تابعین	۱۰۶	حری بن حری ہلالی
۱۲۳	اسرائیل بن موسیٰ بصری	۱۰۶	عباد بن زیاد بن ابوسفیان
۱۲۳	کرز بن ابوجز عبدی	۱۰۷	یزید بن مفرغ حمیری
۱۲۵	معلیٰ بن راشد بصری	۱۰۷	ربیع بن صبیح سعدی بصری
۱۲۷	جنید بن عمرو الہمدانی الکلی	۱۰۹	مجاہد بن سعید حمیری
۱۲۷	محمد بن زید عبدی	۱۰۹	عطیہ بن سعد عوفی
۱۲۷	محمد بن غزوان کلی	۱۱۰	حسن بصری
۱۲۸	ابوعینیہ ازدی	۱۱۱	صلیٰ بن فہیل شیبانی
۱۲۹	سندی بن شماس السمان بصری	۱۱۱	ابوسلمہ زہلی
۱۲۹	عبدالرحیم دہلی سندھی		تیسرا باب
۱۳۰	عبدالرحمن بن عمرو اوزاعی		برصغیر میں اہل حدیث کا تیسرا
۱۳۱	عبدالرحمن بن السندی	۱۱۳	کارواں
۱۳۲	عمرو بن عبید بن باب السندی	۱۱۳	محمد بن قاسم اور ان کے رفقاء کرام
۱۳۲	فتح بن عبداللہ سندھی	۱۱۴	بتوثیق کی خدمت اسلام
۱۳۳	قیس بن بسر بن سندھی البصری	۱۱۵	محمد بن قاسم بنو امیہ کی فوج میں
۱۳۴	ابومشرق نجج بن عبدالرحمن سندھی مدنی	۱۱۵	سندھ کی طرف روانگی
۱۳۴	محمد بن ابراہیم ہلمانی	۱۱۶	محمد بن قاسم کے حملے کا پس منظر

۱۷۱	محدث دہلوی	۱۳۵	محمد بن حارث بیلہانی
۱۷۱	شاہ صاحب کی پیدائش	۱۳۵	یزید بن عبداللہ قرشی سندھی
۱۷۲	شیخ محمد بن عبدالوہاب اور شاہ ولی اللہ		پانچواں باب
۱۷۳	شاہ صاحب کا کاروان حیات		مختلف قدیم ادوار کی کتابوں میں
۱۷۴	کتاب وسنت کی راہ	۱۳۷	اہل حدیث کا تذکرہ
۱۷۶	شاہ صاحب کی عدم تقلید		چھٹا باب
۱۷۶	نواصول	۱۳۸	اہل حدیث اور ان کا نقطہ نظر
۱۷۸	استنباط مسائل کے دو طریقے	۱۵۷	اہل حدیث کوئی فرقہ نہیں اصل اسلام ہے
۱۷۹	امام کی اقتداء میں سورۃ فاتحہ	۱۵۸	اہل حدیث اور اہل سنت
۱۸۰	رفع العیدین	۱۵۹	ائمہ اربعہ سے پہلے کا مذہب
۱۸۱	ہر پڑھنا سنت ہے	۱۵۹	کتاب وسنت کے اصل متبعین
۱۸۱	جمع بین الصلوٰتین		ساتواں باب
۱۸۲	دیہات میں جمعہ پڑھنے کا مسئلہ	۱۶۱	اہل حدیث کے اصول و ضوابط
۱۸۲	تکبیرات عیدین کی تعداد	۱۶۱	قرآن مجید
	مائے کثیر اور قلعین کے بارے میں	۱۶۳	حدیث وسنت
۱۸۳	شاہ صاحب کا مسلک	۱۶۵	اہل حدیث کی دعوت
۱۸۵	اصل راہ۔۔۔ کتاب وسنت	۱۶۶	ائمہ فقہ اور اہل حدیث
۱۸۶	چند الفاظ ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے بارے میں		حق و صداقت کی خاص فرقہ میں
۱۸۷	خدمت حدیث	۱۶۷	محدود نہیں
۱۸۸	خدمت قرآن	۱۶۷	فقہ ماخذ شرع نہیں
	نواں باب	۱۶۸	اصل ہدف کتاب وسنت
۱۸۹	اہل حدیث کے فکر و عمل کے		آٹھواں باب
	مختلف پہلو		اہل حدیث اور شاہ ولی اللہ

۲۱۳	اجتہاد	۱۹۱	ایجابی اور وسیع دعوت
۲۱۴	استنباط مسائل میں اختلاف	۱۹۲	ایک مثال
۲۱۵	اصحاب فتویٰ صحابہ اور تابعین	۱۹۲	اس کی اصل وجہ کیا ہے
۲۱۶	مکفرین صحابہ	۱۹۴	فکر و عمل کے تین پہلو
۲۱۶	متوسطین صحابہ	۱۹۶	مختلف ادوار میں مختلف نام
۲۱۶	مقلدین صحابہ	۱۹۷	سلف کی رائے کو ترجیح دینے کی بنیادی وجہ
۲۱۷	مراکز فقہ و فتویٰ	۱۹۸	سلف کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے
۲۱۷	(۱) مدینہ منورہ		کس قافلے کے سالار اعظم
۲۱۸	(۲) مکہ مکرمہ	۲۰۱	”رسول اللہ“ تھے
۲۱۹	(۳) کوفہ		کلامی بحثوں سے دامن کشاں رہنے
۲۲۰	(۴) بصرہ	۲۰۲	کی تاکید
۲۲۰	(۵) شام	۲۰۴	کلامی مباحث سے اجتہاد کی دو وجہیں
۲۲۱	(۶) مصر		اہل حدیث کے بارے میں ایک
۲۲۱	(۷) یمن	۲۰۶	بہت بڑا مغالطہ
	فقہ و فتویٰ کے دو اہم مراکز ---- حجازی		دسواں باب
۲۲۲	اور عراقی		فقہی مذاہب کی تاریخ اور ان کے
۲۲۲	امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ	۲۰۷	عالم وجود میں آنے کے اسباب
۲۲۳	طریق استنباط	۲۰۷	سوال سے صحابہ کا اجتہاد
۲۲۳	قبل از وقوع واقعہ پر غور	۲۰۸	علم الفقہ
۲۲۴	امام مالک رحمۃ اللہ علیہ	۲۱۰	فقہ اسلامی کے ماخذ
۲۲۴	استنباط	۲۱۰	اقسام احکام
۲۲۵	علم حدیث کی تعظیم	۲۱۱	احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
	موطا کے بارے میں شاہ ولی اللہ	۲۱۲	صحابہ اور تابعین کی اجتہادی آراء

۲۳۷	حجرات کی عمر	۲۳۷	دہلوی کی رائے
۲۳۸	منزل کی عمر	۲۳۷	نواب صدیق حسن کافرمان
۲۳۹	مسائل کی تعداد	۲۳۸	امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ
۲۵۰	ایک گزارش اور سنیے!	۲۳۹	وسعت علم
۲۵۱	مولانا شبلی کی ایک اور مورخانہ لغزش	۲۳۰	امام شافعی کا بیخ استدلال
۲۵۱	اصل معاملہ	۲۳۱	امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
۲۵۵	فقیر اور غیر فقیر صحابہ	۲۳۱	اصول استدلال
	تیسرے باب		گیارہواں باب
۲۵۷	اہل حدیث اور اہل رائے	۲۳۳	فقہ اور اس کے حدود و اطلاق
۲۵۷	شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر سے		فقہ کے لفظی اور لغوی معنی قرآن
۲۵۷	اہل حدیث کی تنگ و تاز	۲۳۳	کی رو سے
۲۶۰	اہل حدیث کے بالمقابل اہل رائے	۲۳۶	فقہ کے معنی حدیث کی رو سے
	چودھواں باب	۲۳۸	حضرت عمر فاروقؓ کا قول
	اہل رائے کی ترقی کا بنیادی	۲۳۹	مختلف معانی
۲۶۳	سبب۔۔۔۔۔ حکومت		بارہواں باب
۲۶۳	کیا سلطان محمود غزنوی خفی تھا؟	۲۳۳	تدوین فقہ کی بحث
۲۶۷	کیا محمود غزنوی اہل حدیث تھا	۲۳۴	تدوین فقہ کی مجلس کے ارکان
۲۶۸	مولانا شبلی کی لغزش		تدوین فقہ کی مدت، تیس سال۔۔
۲۶۹	اور اب غیاث الدین غوری	۲۳۵	121 ہجری سے 150 ہجری تک
۲۷۳	کیا حکومت سے وابستگی عالی مرتبے	۲۳۵	اس باب میں مولانا رحیم آبادی کی تحقیق
	کی دلیل ہے؟	۲۳۶	امام محمد کی عمر
	پندرہواں باب	۲۳۷	قاضی ابویوسف کی عمر
۲۷۵	مسئلہ تقلید	۲۳۷	امام زفر کی عمر

روایات و احادیث اور سیرت و مغازی	۲۷۵	تہذیب کی تعریف اور اس کے معنی
۳۰۲ کی جمع و تدوین	۲۷۷	تہذیب نہیں تحقیق
۳۰۳ اخذ روایات کے اصول و قواعد	۲۷۸	غیر مقلد بہ صورت طرز
۳۰۴ راویوں کے مدارج اور طبقات	۲۸۰	گستاخ کون؟
۳۰۵ روایت حدیث میں اسناد کا التزام	۲۸۲	ایک اور بات
راویان حدیث کا حالات و کوائف	۲۸۴	اصطلاحی تہذیب کی تاریخ
۳۰۶ کی تلاش	۲۸۵	ایک سوال
۳۰۷ جرح و تعدیل کے چند ائمہ کرام	۲۸۶	حضرت مولانا تھانوی کا فرمان
فنِ اسماء الرجال کی کتابیں تیسری	۲۸۶	نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرام
۳۰۷ صدی ہجری کے آخر تک		حضرت میاں سید غفر دہلوی کا
اس موضوع پر چوتھی صدی ہجری	۲۸۷	طریق عمل
۳۰۸ کی کتابیں	۲۸۸	تہذیبی دور
۳۰۹ پانچویں صدی ہجری کی کتابیں	۲۸۸	اجتہاد کا دروازہ بند
چھٹی صدی ہجری کے مصنفین	۲۹۰	تاریخ کا ایک ورق
۳۰۹ و تصنیفات	۲۹۱	مولانا ابوالکلام آزاد کا نظر
۳۱۰ ساتویں صدی ہجری کی تصنیفات	۲۹۴	مولانا محمد حنیف ندوی کی ایک تحریر
۳۱۰ آٹھویں صدی ہجری کی کتابیں		سولہواں باب
۳۱۰ نویں صدی ہجری کا کام	۲۹۹	علم حدیث اور علم اسماء الرجال
۳۱۱ دسویں صدی ہجری کی تصنیفات	۲۹۹	حدیث کیا ہے؟
صحاح کے راویوں کے نام اور کنیت	۳۰۰	علم اسماء الرجال کے حدود و اطلاق
۳۱۲ وغیرہ کے سلسلے میں		آنحضرت کے فرامین کی تبلیغ و حفاظت
۳۱۲ آخری دور کی خدمات	۳۰۰	کرنے والی اولیں جماعت
۳۱۲ طبقات سے متعلق کتابیں	۳۰۲	پانچ لاکھ راویان حدیث

۳۱۲	اہل الحدیث کی عظیم خدمات سترہواں باب
۳۱۵	اصحاب حدیث اور فقہیت اٹھارہواں باب
۳۲۳	کیا ائمہ اربعہ اہل حدیث نہیں؟ انیسواں باب
۳۲۷	چند فرقے بیسواں باب
	برصغیر میں اہل حدیث کی خدمات
۳۳۳	ایک نظر میں
۳۳۴	تدریسی و تعلیمی خدمات
۳۳۶	تصنیفی و تالیفی خدمات
۳۳۸	شعری خدمات اسلام
۳۳۹	مرزائیت کی تردید
۳۴۱	صحافتی خدمات
۳۴۲	سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں
۳۴۵	مآخذ و مصادر

## اہل حدیث کے متعلق چند اصحاب علم کے ارشادات

### اہل حدیث کی تعریف

(علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری۔ وفات ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء)

اہل حدیث وہ ہے جو حدیث سے استدلال کرتا ہو جو حدیث کو رشد و ہدایت کا ذریعہ سمجھتا ہو جو فرمان رسول ﷺ کے سامنے راے اور قیاس کو چھوڑ دیتا ہو۔ اس تعریف کے مطابق ائمہ اربعہ اور ائمہ ظواہر یقیناً اہل حدیث ہیں اور مالکیہ و شافعیہ و حنابلہ و احناف کے وہ سب علمائے کرام بھی اہل حدیث ہیں جو مسائل شرعیہ میں سنت نبویہ کو حجت سمجھتے ہیں جو حدیث رسول اکرم ﷺ سے استشہاد کرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کلام رسول (ﷺ) کو بہ لفظ حدیث بیان فرمایا ہے۔

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا (تحریم: ۳)

یعنی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی سے ایک حدیث راز میں کہی۔  
الفاظ حدیث کو یاد رکھنا، اسے جوں کا توں ادا کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور دعائے برکت کے تحت میں ہے۔

نضر الله عبدًا سمع مقالتي فوعاها واذأها كما سمعها  
یعنی اللہ تعالیٰ اس بندے کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میرا کلام سنا، اسے محفوظ رکھا۔ پھر جیسا سنا تھا، اسی طرح ادا بھی کر دیا۔



## برصغیر میں اہل حدیث کی خدمت حدیث

(علامہ محمد رشید رضا مصری۔ وفات ۲۲۔ اگست ۱۹۳۵ء)

اگر سرزمین ہند میں اہل حدیث خدمت حدیث کا بیڑا نہ اٹھاتے تو مشرق میں علم حدیث ختم ہو جاتا۔ مصر، شام، عراق اور حجاز میں تو دسویں صدی ہجری سے یہ مقدس علم رو بہ تنزل تھا اور جامعہ ازہر کے بڑے بڑے علما بھی خطبوں اور وعظوں میں ضعیف بلکہ موضوع روایات بیان کرتے تھے۔ اہل حدیث نے علم حدیث کو اپنی ان تھک کوششوں سے پھر زندگی بخشی۔



## خیر القرون میں صرف اہل حدیث ہی تھے

(مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی۔۔۔ وفات مارچ ۱۹۴۱ء)

خیر القرون میں صرف اہل حدیث ہی تھے۔ کوئی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نہ تھا۔ خود چاروں امام امامت کے مرتبے کے ساتھ پہلی صدی ہجری میں موجود نہ تھے۔ پھر ان کے مقلدین کہاں ہوں گے۔ اس زمانے کے تمام مسلمان قرآن و حدیث پر عامل تھے اور یہی ان کا عقیدہ تھا۔ اسی پر عمل کرنے کی وصیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں فرمائی تھی، لہذا وہ سب کے سب اہل حدیث تھے اور انہیں اس زمانے میں اہل حدیث کہا جاتا تھا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جب کسی نوجوان طالب حدیث کو دیکھتے تو فرماتے تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت مبارک ہو، ہمیں حضور حکم فرما گئے ہیں کہ تمہارے لیے مجلسوں میں کثادگی کریں اور تمہیں حدیث کا درس دیں۔

فَإِنَّكُمْ خُلُوفُنَا وَأَهْلُ الْحَدِيثِ بَعْدَنَا.

تم ہمارے خلیفہ ہو اور ہمارے بعد تم ہی اہل حدیث ہو۔ یعنی تابعین کرام۔



## اہل حدیث کا عقیدہ

(مولانا ثناء اللہ امرتسری۔۔۔ وفات ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء)

اہل حدیث کا مذہب ہے کہ خداوند تعالیٰ سب چیزوں کا خالق ہے۔ سب مخلوق کیا چھوٹی، کیا بڑی، کیا عزیز، کیا ذلیل، اس کے سامنے سب سر تسلیم خم ہیں۔ کوئی بھی اس کے حکم کو پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ سب دنیا کی اصلی حکومت خاص اسی کے قبضے میں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (ملک: ۱)  
یعنی برکتوں والی وہ ذات ہے جس کے قبضہ قدرت میں تمام ملک کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ يَبْدِئُ مَلَكُوتَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ (المومنون: ۸۸)

یعنی اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان مشرکوں سے پوچھ کہ کون ہے جس کے قبضہ قدرت میں سب چیزوں کی حکومت ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے اور اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اگر تمہیں علم ہے تو بتاؤ؟ یہ بھی کہہ دیں گے کہ ایسی شان خدا ہی کی ہے۔

قریب قریب تمام قرآن شریف اس مضمون سے پُر ہے، بلکہ کلمہ شریف لا الہ الا اللہ ہی میں یہ بیان بالا جمال پایا جاتا ہے، کیوں کہ اس کے معنی ہیں۔ ”خدا کے سوا اور کوئی حقیقی معبود نہیں، صرف خدا ہی معبود ہے، باقی تمام مخلوق اس کی عابد اور مملوک ہے۔“

## لقبِ اہل حدیث

(مولانا ابوالقاسم بنارسى۔۔۔ وفات ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء)

”اہل حدیث“ یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ پہلا لفظ ”اہل“ ہے جس کے معنی ہیں والے صاحب۔ دوسرا لفظ ہے ”حدیث“۔۔۔ حدیث نام ہے کلام اللہ اور کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا۔۔۔! قرآن کو بھی حدیث فرمایا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے مجموعے کا نام بھی حدیث ہے۔ پس اہل حدیث کے معنی ہوئے قرآن و حدیث والے۔۔۔! جماعت اہل حدیث نے جس طریقے پر حدیث کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے، اور کسی نے نہیں کیا اس لیے اس کا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلائے۔

یہ لقب ہمیں اللہ تبارک تعالیٰ کی جانب سے ملا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

عن انس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم القیامۃ یجینئ اصحاب الحدیث ومعہم المحابر فیقول اللہ لہم انتم اصحاب الحدیث۔ انطلقوا الی الجنة۔ (طبرانی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اہل حدیث اس حال میں آئیں گے کہ دو اہل ان کے ساتھ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم اہل حدیث ہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔



## تحریک اہل حدیث کے اثرات

(علامہ سید سلیمان ندوی۔۔۔۔ وفات ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء)

اہل حدیث تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانے سے آج تک ہمارے دورِ ادا بار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائقِ شکر یہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہِ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا، حدیثِ نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیا اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباعِ نبوی کا جو جذبہ کم ہو گیا تھا وہ دوبارہ پیدا ہو گیا۔ اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ”جہاد“ جس کی آگ اسلام کے بحر میں شعلہ پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکانا پڑا اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور کر دیے گئے پانچک کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا زنگ طبعیتوں سے دور ہوا اور یہ جو خیال ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، رفع ہو گیا اور لوگ از سر نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خواہش پیدا ہوئی اور قیل و قال کے مکرر گڑبھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمہ مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔

## صرف کتاب و سنت

(مولانا محمد ابرہیم سیالکوٹی۔۔۔ وفات ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء)

نام کا تقرر تمیز و تعارف کے لیے ہوتا ہے اور صدرِ اول و قرونِ ثانی میں یعنی صحابہؓ تابعینؓ میں اختلاف کی بنا پر مذاہب کی بنیاد نہیں پڑی تھی اور امت کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے کی حدیں نہیں کھینچی گئی تھیں بلکہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقید تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دیگر شخص کی شخصیت کو شریعت میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ غرض کوئی دوسرا فرقہ تھا ہی نہیں اس لیے کسی سے متمیز ہونے کے لیے الگ نام کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ حتیٰ کہ جب مجتہدین کے اقوال کو حجت گردانا گیا اور مختلف مذاہب کی بنیادیں قائم ہو گئیں تو جن لوگوں نے طرزِ اول اور زمانہ سابق کی طرح ہر کسی شخص کو دین میں داخل کرنے کے بغیر صرف کتاب و سنت سے دین حاصل کرنا اپنا دستور رکھا اور راویوں کی روایت اور ان کی درایت میں فرق کیا اور اپنے عمل و اعتقاد کی بنا صرف قرآن و حدیث پر رکھی وہ اہل حدیث، اصحاب حدیث، اہل اثر اور محدثین کہلائے اور باقی سب یا تو اپنے اپنے امام و مقتدا کی طرف منسوب ہوئے جس کی شخصیت کو انھوں نے دوسرے فرقوں میں حد فاصل قرار دیا تھا اور اس کے مجتہدات کو بجائے خود اصل و سند مانا تھا۔ مثلاً حنفی و شافعی باعتبار امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہونے کے۔۔۔۔ اور یا اس مسئلے کی طرف منسوب

ہونے کے جس میں انھوں نے اصحاب حدیث سے اختلاف کیا۔ مثلاً قدر یہ بسبب تقدیر کے منکر ہونے کے اور جبر یہ بلحاظ جبر محض کے قائل ہونے کے اور مرجئہ بوجہ اعمال کو ایمان سے جدا کرنے اور محض ایمان پر امید نجات دلانے کے۔ یہ اس شے کا جواب ہے جو بعض ناواقف پیش کرتے ہیں کہ اہل حدیث اگر قدیم ہیں تو یہ لقب زمان صحابہ و تابعین میں کیوں مشہور نہیں ہوا۔



## اہل حدیث کا عقیدہ اور نصب العین

(مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔۔۔۔ وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء)

- ۱۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری وحی اور قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کے لیے خدا کا آخری پیغام رشد و ہدایت ہے۔
  - ۲۔ یہ وحی الہی سید المرسلین و خاتم النبیین سیدنا محمد بن عبد اللہ الحطمی الهاشمی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔
  - ۳۔ آپ اس وحی الہی کے صرف مبلغ ہی نہیں بلکہ اس کے مبین اور مفسر بھی ہیں۔ فرمایا:   
وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ۝ (النحل: ۴۴)  
(اے نبی! ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن بھیجا ہے تاکہ لوگوں کو آیات قرآنی اچھی طرح وضاحت سے سمجھا دیں۔)
  - ۴۔ آپ نے قرآن مجید کی جو تشریح بیان فرمائی اس کا نام حکمت یا سنت ہے۔ فرمایا:   
وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۝ (النساء: ۱۱۳)  
(اللہ نے آپ پر کتاب اور اس کے معارف و حکم بھی نازل فرمائے اور آپ کو وہ علوم سکھائے جو آپ کو معلوم نہ تھے۔)
- معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے علاوہ دوسری چیز بھی آپ پر نازل ہوئی تھی جس کو قرآن مجید ”حکمت“ (معارف و حکم) سے تعبیر کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کے علاوہ دوسری چیز جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوئی وہ



احادیث و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ تشریح سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ قرآن کریم کی اس تشریح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آیات قرآنیہ کی تیسرین و تشریح اپنے ذمے لی۔۔۔ فرمایا:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْءَانَهُ ۚ فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْءَانَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (القیامہ: ۱۷-۱۹)

(قرآن کا یاد کر دینا اور اس کا پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم (جبریل کے ذریعے) قرآن پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ اس کو دہرائیں۔ پھر قرآن کے احکام) کا بیان کرنا ہمارے ذمے ہے۔)

۶۔ یہ ناممکن ہے کہ قرآن کریم حسب وعدہ الہی قیامت تک محفوظ رہے مگر اس کی پیغمبرانہ شرح کم ہو جائے یا محفوظ نہ رہے۔ قرآن کریم کا دنیا میں بطور ذکر و ہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ رہے یعنی عربی زبان عربی قواعد اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن مجید کے ساتھ تابد محفوظ رہے۔

۷۔ اگر بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کے علاوہ اسوۂ رسول یا سنت رسول کی ضرورت نہ ہوتی تو پھر نزول قرآن مجید کے لیے تیس (۲۳) سال کی طویل مدت غیر ضروری تھی یہ کام چند مہینوں میں انجام پاسکتا تھا۔ آپ جبریل سے سن کر قرآن مجید حفظ کر لیتے اور صحابہ کو مختصر عرصے میں حفظ کرا دیتے۔۔۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا نزول بہ درج ہوا اور ۲۳ سال کی طویل مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا کیونکہ قرآن مجید کتاب کی صورت میں ایک جامع مگر مختصر ہے لیکن جب سنت رسول اور پیغمبرانہ شرح اس کے ساتھ شامل کی گئی تو یہی مختصر کتاب دینی تکمیل و تشریح کے لیے ۲۳ سال کی طویل مدت کی محتاج ہو گئی اور یہ صرف اس لیے کہ قرآن مجید کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زندہ رکھنا

اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔

۸۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس قرآن مجید سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی یعنی قرآن مجید اور صاحب قرآن دونوں پر ایمان لانا جزو ایمان ہے اسی طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کے تابندہ نقوش (سنت و اسوۂ رسول) کی علیحدگی ناممکن ہے۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ سنت کا انکار قرآن مجید کا انکار ہے۔

۹۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے اصحاب کرام کی جماعت وہ مقدس جماعت ہے جو تکمیل انسانیت اور اخلاق و اعمال حسنہ کا اکمل نمونہ ہے۔ یہی وہ نفوس قدسیہ تھیں جن کے سامنے وحی الہی نازل ہوتی رہی اور وہ رسول پاک کی زبان مبارک سے قرآن اور پیغمبرانہ تشریح سنتے رہے اور انہی دو چیزوں (کتاب و سنت) کو انھوں نے اپنے اقوال و اعمال کا محور بنائے رکھا اور کتاب و سنت کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی کمال دیانت کے ساتھ انھوں نے اپنے شاگردوں (تابعین) کو پہنچادی۔ رضی اللہ عنہم ورضو اعنہ۔

۱۰۔ اسلامی علوم اسلامی تہذیب اور اسی طرح مسلم معاشرے نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی ہم عصر قوموں کے اختلاط سے چوں کہ ایسے اثرات قبول کر لیے ہیں جن سے اسلامی تعلیمات قرن اول کی سادگی پر قائم نہیں رہیں اس لیے مسلم معاشرے کے نظام حیات کو آج اسی چشمہ صافی سے سیراب کیا جاسکتا ہے جسے ہم قرن اول کی فطری سادگی کا چشمہ حیات کہتے ہیں یعنی اسلام کو اسی طرح سمجھا جائے جس طرح صحابہ کرام تابعین اور ائمہ دین نے سمجھا۔

ہمارا حقیقی نصب العین اللہ احکم الحاکمین کی رضا اور خوش نودی کا حاصل کرنا ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ ہم یہی سمجھتے ہیں: اللہ کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و محبت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع۔



## اصل اسلام

(مولانا حافظ عبداللہ روپڑی۔۔۔ وفات ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء)

اسلام میں تین باتیں ہیں:

ایک یہ کہ قرآن و حدیث کا صاف فیصلہ ہوتے ہوئے مسلمان کسی کے قول یا فتوے کی رعایت نہ رکھے۔

دوسری یہ کہ اگر کسی مسئلے میں قرآن و حدیث سے فیصلہ نہ ملے تو وہاں پہلے لوگوں کے فیصلے کو اپنی راہ پر مقدم کرے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر خود قرآن و حدیث سے واقف نہ ہو تو بغیر التزام تعین مذہب کے کسی سے مسئلہ قرآن و حدیث کا پوچھ لے۔

بس یہی اصل اسلام ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے تھے اور اسی پر آپ صحابہ کو چھوڑ کر (دنیا سے) رخصت ہوئے۔

اب جتنا کوئی اس روش سے بٹے گا اتنا ہی حق سے دور ہوگا اور جتنا اس سے نزدیک ہوگا اتنا ہی حق سے نزدیک ہوگا۔



## ساحل ہند پر اہل حدیث کا پہلا قافلہ

(مولانا محمد اسماعیل سلفی۔۔۔ وفات ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء)

سب سے پہلا قافلہ جو فاتحانہ حیثیت میں ساحل ہند پر وارد ہوا، وہ اہل حدیث کا تھا۔ اس وقت گوسندھ میں اہل توحید کو وہ قوت حاصل نہیں، لیکن تاریخ کے اوراق ان کی خدمات کو نہیں بھول سکتے۔ اسی طرح مغل فاتحین بھی اسلامی سادگی اور دین فطرت کی روشنی سے زیادہ فارسی تہذیب سے آشنا تھے، اس لیے ہندوستان میں اسلامی سادگی اور کتاب و سنت کی تعلیمات کا زور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور نہ خدام حدیث کی اس قدر کثرت ہو سکی جس قدر دوسرے ممالک میں تھی۔ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال اور شیخ محمد طاہر مولف مجمع البحار، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں مغنمات سے تھے۔ اکبری دور میں بعض علما نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس وقت اہل حق کس قدر کم زور تھے، شیطانی طاقتیں کس قدر جمع ہو رہی تھیں، فتنوں کا سیلاب کتنا تباہی خیز تھا، حکومت کا لادینی جذبہ اہل حق کے لیے کتنی مصیبت کا باعث تھا۔ اعراس اور موالیہ کو بغض لوگوں نے اسلام کا بنیادی مسئلہ سمجھ رکھا تھا، تاہم بزرگان دین نے ان بدعات پر کڑی نکتہ چینی کی۔ غیر اسلامی رسوم اور غیر اسلامی نظریوں کے خلاف ان مجددین وقت کی پر شکوہ آواز فضاے دہر میں گونجتی رہی۔ رضی اللہ عنہم وارضاه۔



## قرآن وحدیث کی تعلیم کا اصل مقصد

(مولانا محمد عطاء اللہ حنیف۔۔۔۔ وفات درمیانی شب ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

قرآن وحدیث کی تعلیم وتعلم کی اولیں غرض حق تعالیٰ کی معرفت کا حصول اس کی عبادات کے طریقوں کا علم اس کی رضا وعدم رضا کے اسباب سے واقفیت انبیاء و صلحہ کے طرز زندگی کی پہچان ملکات فاضلہ میں رسوخ پیدا کرنا مسئلہ جزا و سزا اور اخروی قلاح و بہبود کو اپنے اعمال میں اولیں اہمیت دینا اور حقوق العباد کی نگہداشت ہوتا ہے۔ پھر علوم اسلامیہ کی نگہداشت کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچانا اسلام کی داخلی فتنوں اور خارجی حملوں سے مدافعت اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی مقتضیات میں سے ہے۔

ان ہی امور پر مشتمل علم کو قرآن مجید نے ”نقاہت فی الدین“ قرار دیا ہے اور ہر علاقے خاندان شہر اور گاؤں کے مسلمانوں پر بہ حیثیت مجموعی فرض گردانا ہے کہ ان میں ایک جماعت اس کے لیے وقف رہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ خَلِيفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (توبہ: ۱۲۲)

(ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر قوم میں سے چند آدمی آئیں تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں جائیں تو ان کو سمجھائیں تاکہ وہ بھی بچتے رہیں)

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے ہر گاؤں ہر شہر ہر محلے ہر بڑے خاندان کا دوبارہ کے ہر طبقے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے سیکھنے سکھانے کا اہتمام کریں۔

## جماعت اہل حدیث کا طرہ امتیاز

(سید محبت اللہ شاہ راشدی۔۔۔ وفات ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء)

جماعت اہل حدیث کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ وہ جملہ مصائب و محن، ابتلاءات اور اہتمامات سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ حق کی حمایت کرتی رہی۔ اس نے اپنے تصورات و اعتقادات، عبادات و معاملات، اقتصادی اور سیاسی مسائل غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں کتاب و سنت کو پیش نظر رکھا اور اس معاملے میں قطعاً نرمی سے کام نہیں لیا اور نہ حق کے معاملے میں کسی لومۃ لائم کا خوف کھایا۔ جس بات کو کتاب و سنت کی روشنی میں حق سمجھا اس کا ڈنکے کی چوٹ اظہار کیا۔ حق کی راہ میں ناقابل برداشت اذیتیں جھیلیں۔ ذاتی مفادات و شخصی اغراض، لالچ و طمع، حرص و ہواے نفسانی ان کو اپنے ٹھوس موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ جوڑا اور ان کے مقابلے میں دوسرے جتنے رشتے اور تعلقات تھے، خواہ وہ اعزہ و اقربا ہی کے رشتے کیوں نہ ہوں، ان سب کو چھوڑ دیا۔ ان کا اصل منشا وہی رہا جو قرآن حکیم کے الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ (توبہ: ۶۲)

یعنی مومن وہی ہیں جو ہر بات میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں۔

ماضی بعید میں صحابہ کرام کے دور کے بعد حضرت امام احمد، امام بخاری اور امام ابن تیمیہ وغیرہم کی زندگیاں ہمارے لیے درخشندہ ستاروں کی طرح ہیں اور ماضی قریب میں بھی بہت سی ایسی ہستیاں گزر چکی ہیں جن کی زندگیاں ہمارے لیے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

## جماعت اہل حدیث۔۔۔ قدیم جماعت

(سید بدیع الدین شاہ راشدی۔۔۔ وفات ۸ جنوری ۱۹۹۶ء)

جماعت اہل حدیث ایک قدیم جماعت ہے جس کے امام، مرشد اور قائد صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور سے آج تک یہ جماعت موجود ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اپنے رسالہ ”اجتہاد و تقلید“ میں لکھتے ہیں کہ اہل حدیث تو تمام صحابہ کرامؓ تھے۔ امام عامر بن شریک کی جو کبار تابعین میں سے ہیں، پانچ سو صحابہ کرامؓ سے ملاقات ہوئی۔ (تہذیب) اور وہ ۴۸ صحابہ کرامؓ کے شاگرد تھے اور ان سے احادیث روایت کرتے تھے۔ (تاریخ بغداد، تہذیب) وہ تقریباً ۳۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰ھ کے قریب انتقال کیا۔ وہ پہلی اور دوسری صدی کے ابتدا کی شخصیت تھے۔ فرماتے ہیں:

لَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا حَدَّثْتُ إِلَّا بِمَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ. (تذکرۃ الحفاظ)

یعنی جو کچھ میرے ذہن میں ہے اور میں نے سمجھایا، اگر پہلے خیال میں آتا تو صرف وہ احادیث پڑھاتا جن پر اہل حدیث کا اجماع اور اتفاق ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانے میں جماعت اہل حدیث موجود تھی۔ امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) ایک دن باہر نکلے تو پکار کر کہا: اے اہل حدیث تم کہاں ہو؟۔۔۔ پھر انہیں چار سو احادیث پڑھائیں۔ (تذکرہ) حنفی مذہب کے رکن عظیم امام محمد بن حسن شیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) اپنی

مشہور کتاب الموطا صفحہ ۶۳ باب الیمین مع الشاہد میں فرماتے ہیں:

فَكَانَ ابْنُ الشَّهَابِ أَعْلَمَ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيثِ بِالْمَدِينَةِ مِنْ غَيْرِهِ فِيهَا.

یعنی امام ابن شہاب زہری مدینہ منورہ کے اہل حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ عالم تھے۔

واضح ہو کہ اس وقت یعنی دوسری صدی میں مدینہ طیبہ جماعت اہل حدیث کا مرکز تھا۔ حنفیت کے دوسرے رکن قاضی ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) ایک دن باہر نکلے اور انھوں نے اہل حدیث کو دیکھ کر فرمایا:

زمین پر تم سے بہتر کوئی نہیں، کیوں کہ تم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنتے اور سیکھتے ہو۔

امام حفص بن غیاث (متوفی تقریباً ۱۹۴ھ) فرماتے ہیں ”خیر اہل الدنیا“ یعنی پوری دنیا میں بہترین جماعت اہل حدیث ہے۔ ابو بکر بن عیاش (متوفی تقریباً ۱۷۰ھ) فرماتے ہیں ”انہم خیر الناس“ یعنی سب سے بہتر لوگ یہی ہیں۔ (معرفة علوم الحديث للحاكم)





## حرف آغاز

برصغیر میں کتاب و سنت کو اپنے لئے لائق اتباع قرار دینے والے سرفردشوں کا گروہ تمام تر مسلکی گروہوں میں سب سے زیادہ مظلوم رہا ہے۔ ہر کسی نے انہی پر مشق خن فرمانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے سے بڑے اعتدال پسند ذہنوں کا ذوق بھی اہل حدیث کے معاملے میں ہذوقی کا شکار ہوا۔ اہل حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا، اگر کوئی مجتہد نقطہ نظر سے اسے یکجا کرنے کی کوشش کرے تو کئی مجلدات تیار ہو جائیں۔ یہی وہ گروہ تھا جس پر اہل اسلام نے اپنی مساجد کے دروازے بند کر دیئے۔ عاشقان رسول نبی کریم ﷺ کا اسوہ بھول بیٹھے۔ انہوں نے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے نجران کے صلیبیوں کے لئے مسجد نبوی کے دروازے کھولنے کو فراموش کر دیا اور اہل حدیث کے درپے ہو گئے۔ مساجد کے باہر لکھ دیا گیا کہ اس مسجد میں وہابی یعنی اہل حدیث کا داخلہ منع ہے۔ اگر کوئی قسمت کا مارا بھول کر ان کی عبادت گاہوں میں چلا جاتا تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو بھوکے بھیڑیے معصوم بھیڑیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ کوئی خوش نصیب ہی ایسا ہوتا کہ اسے صرف مسجد سے نکالنے پر اکتفا کیا جاتا۔ اسے مسجد سے نکال کر مسجد دھوئی جاتی اور بسا اوقات صفوں کو نذر آتش کر دیا جاتا تا کہ مسجد کی پاکیزگی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

کیا اعلیٰ حضرت اور کیا ادنیٰ حضرت، سبھی کی خوش کلامی اور شیریں گفتاری کا محور اہل حدیث تھے۔ لیکن اہل حدیث کا جرم کیا تھا صرف یہ کہ وہ کسی کو ایک امام کی تقلید کی دعوت نہیں دیتے تھے۔ ذہنی و فکری آزادی کی دعوت دیتے تھے اور صرف اور صرف دامن محمد ﷺ سے وابستہ ہونے کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ اس آزاد روی کا سب سے زیادہ نقصان ان عناصر کو تھا جن کی زندگیوں کا مقصد لوگوں کو جھوٹے سچے قصوں میں الجھانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حالانکہ اہل حدیث کی دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی بلکہ یہ تو خیر القرون کی فکری اساس کا پر تو تھی۔ لیکن ان درویشوں اور اللہ والوں کو راہ حق میں جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، کم از کم برصغیر کی مذہبی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اہل حدیث کے خلاف سب سے زیادہ اس بات کو اچھا لایا گیا کہ یہ گروہ تو فقط ڈیڑھ سو برس کی پیداوار ہے، درود کا منکر اور نبی کریم ﷺ کا گستاخ ہے۔ افسوس بے شمار اصحاب جبہ و دستار محض فکر معاش کی خاطر خوف خدا سے اس قدر بے گانہ ہو گئے کہ ان کے نزدیک توحید خالص کی دعوت گستاخی رسول قرار پائی۔ ان کی نگاہوں میں حریت فکر کے ان مجاہدین کی انگریزی استعمار کے خلاف

قربانیوں کی بھی کوئی قدر نہ رہی۔ زیادہ افسوس ان بھائیوں پر ہے کہ جن کے اسلاف حضرات شہیدین کی پاکیزہ تحریک میں اہل حدیث کے ہم رکاب تھے۔ لیکن انھوں نے چند فروغی مسائل کو اس قدر اچھالا کہ منزل کھو گئی۔ سید بادشاہ کی شہادت کے بعد تحریک مجاہدین کی قیادت کی سعادت اہل صادق پور کے حصے میں آئی۔ لیکن محض ان کی سلفیت کی بنا پر برادرانِ احناف اس تحریک سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس حد تک دور ہوئے کہ واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ داستان ہے، جس کا یہ محل نہیں۔

محترم المقام جناب محمد اسحق بھٹی حفظہ اللہ کی یہ کتاب شائع کرتے ہوئے ہمارے دل مسرت سے لبریز ہیں۔ تاریخ اہل حدیث سے محبت ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ والد گرامی قدر جناب مولانا عبدالحق قدوسی شہید کا یہ خاص موضوع تھا۔ وہ ذہنی طور پر تاریخ اہل حدیث کی ترقیم کا خاکہ تیار کر چکے تھے۔ لیکن 23 مارچ 1987ء کے حادثہ لاہور میں انہیں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس طرح یہ کام آگے نہ بڑھ سکا اور ہمارے اہل قلم پر ہماڑے مسلک کا یہ قرض جوں کا توں رہا۔ اب محترم بھٹی صاحب نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہم اس پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا گو ہیں۔ ان شاء اللہ اس کتاب سے اہل حدیث کے متعلق ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا جن کا عام مسلمان شکار ہیں۔ جہاں تک علماء کا تعلق ہے، ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ جب بھی اپنے ذاتی و گروہی مفادات کی سطح سے بلند ہو کر اہل حدیث کے بارے میں سوچیں گے، یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ تو خالص اسلام کی دعوت ہے، جس کا مرکزی نقطہ شافع روڈ محشر علیہ السلام کی بلا شرکت غیرے اطاعت و فرمانبرداری ہے۔

آخر میں اپنے واجب الاحترام بزرگ اور جمعیت احياء التراث الاسلامی کی لجنۃ القارۃ الہند یہ سے منسلک جناب عارف جاوید محمدی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا ہمیں موقع دیا۔ دعا ہے اللہ رب العزت امت مسلمہ میں گروہی نفرتوں اور فرقہ وارانہ آویزشوں کو ختم فرمائیں اور ہمارے دل ایک دوسرے کے لئے نرم فرمادیں۔ اللہ رب العزت اس کتاب کی اشاعت کے بدلے میں ہماری حسنات میں اضافہ فرمائیں اور سینئات سے درگزر فرمائیں۔

آمین یا رب العالمین۔

ابوبکر قدوسی

14 نومبر 2003ء

## سخن ہائے گفتنی

مولانا عبدالحق محمد صادق (کویت)

### تاریخ نویسی ایک عظیم فن:

اقوام و ملل اور تحریکات کی زندگی میں عہد رفتہ کے تجارب اور ان کے اسلاف کی تاریخ سنگ میل اور مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندہ قومیں اپنی تاریخ کو پیش نگاہ رکھ کر اپنے ماضی کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ”تاریخ“ ایک عظیم فن ہے جس کے اصول و قواعد اور ایک مؤرخ کی حیثیت و فرائض سے شناسائی از بس ضروری ہے، بالخصوص ایسے دور میں جب حقائق سے چشم پوشی کر کے تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی کا رواج عام ہو چکا ہو تو اس فن کی عظمت اور اس کے تقدس کو اجاگر کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

### تاریخ کا مفہوم:

لفظ ”تاریخ“ کے ماخذ اور اشتقاق میں علمائے لغت کی مختلف آرا ہیں:  
۱۔ لفظ تاریخ عربی الاصل ہے اور وقت کی تعیین کے لیے مستعمل ہے۔  
چنانچہ علامہ جوہری لکھتے ہیں

”التاریخ تعریف الوقت والتوریخ مثله، يقال: أرخت الكتاب وورخت“  
یعنی تاریخ کا لفظ وقت کی پہچان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ ہمزہ یعنی  
”تاریخ“ اور واؤ یعنی ”تورخ“ دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے مثلاً: ”أرخت الكتاب  
وورخت الكتاب“۔ (الصحاح مادة أرخ: 418\1)  
علامہ سخاؤنی فرماتے ہیں:

”التورخ“ واؤ کے ساتھ بنویم اور ”التاریخ“ ہمزہ کے ساتھ بنوقیس کی لغت  
ہے اور اس کی جمع ”تواریخ“ آتی ہے۔

علامہ سخاویؒ کا فرمان ہے:

”یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تاریخ عربی لفظ ہے، فارسی سے معرب نہیں ہے کیونکہ بنو تمیم اور قیس دونوں خالص عربی قبیلے ہیں۔ (الاعلان بالتوہیح لمن

ذم التاريخ: ص 6)

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ لفظ ”تاریخ“ غیر عربی لفظ ہے، جیسا کہ ”نور المقایس“ میں ہے:

”وتاریخ الكتاب ليس عربيا ولا سمع من فصيح“  
یعنی لفظ تاریخ عربی نہیں ہے اور نہ فصیح اللسان عربی سے سنا گیا ہے۔

پھر اس کی اصل میں مختلف آراء ہیں:

۱۔ لفظ ”تاریخ“ اصل میں سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شہر (یعنی مہینے) کے ہیں۔

۲۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو بعد میں عربی میں مستعمل ہونے لگا اور اس کے معنی ہیں ”ماہ و روز“، یعنی دن اور مہینے۔

۳۔ علامہ جو لیتی کہتے ہیں: ”التاریخ“ غیر عربی کلمہ ہے جو کہ ”ارخ“ سے ماخوذ ہے اور یہ نیل گائے کے نومولود مادہ بچے کو کہا جاتا ہے اور تاریخ کو بھی اس کے حدوث کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ”تاریخ“ کہا جاتا ہے۔ (مقدمة الشماريخ في علم

التاريخ: ص 12)

تاریخ کا اصطلاحی مفہوم:

بحیثیت فن ”تاریخ“ کا اصطلاحی مفہوم متعین کرتے ہوئے اہل علم نے مختلف عبارات میں ”فن تاریخ“ کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ مقابح السعادة میں ہے:

”وعلم التاريخ هو معرفة أحوال الطوائف وبلدانهم ورسومهم وعاداتهم وخصائص أشخاصهم وأنسابهم ووفياتهم الى غير ذلك“.

یعنی لوگوں کے احوال و ظروف، ان کے جغرافیائی پس منظر، ان کی رسوم و عادات اور شخصیات کے کارہائے نمایاں اور ان کے انساب و وفیات وغیرہ سے آگاہی حاصل کرنے کا نام ”تاریخ“ ہے۔ (علم التاریخ عند المسلمین: ص 26)

علامہ مقریزی (م ۸۴۵ھ) فرماتے ہیں

”الاخبار عما حدث فی العالم فی الزمان الماضي“  
 یعنی عہد رفتہ میں عالم دنیا کے اندر پیش آمدہ وقائع و احداث کی خبر دینے کو تاریخ کہا جاتا ہے۔  
 ڈاکٹر امین مصری لکھتے ہیں

”التاریخ هو طريقة بحث تقوم على النقد والمقابلة وتحقق وزن قيم الا دلة وربط السبب بالنتيجة مع التعليل للحوادث وار جائها الى دوا افعمها“۔ (لمحات فی التربية: ص 228)

یعنی تاریخ وہ طریقہ بحث ہے جس کا دار و مدار تحقیق و تنقید حالات کے تجزیے اور وقائع و حوادث کو ثابت کرنے والے دلائل، وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے اسباب و وجوہ اور احوال و ظروف اور اسباب و نتائج کے باہم مربوط کرنے پر ہے۔

مذکورہ بالا تعریفات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک معرف نے اپنے ایک خاص نقطہ نظر کے پیش نظر تاریخ اور فن تاریخ کا مفہوم پیش کیا ہے۔ کسی نے موضوع کو سامنے رکھا اور کسی نے کرداروں کو ملحوظ رکھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور کسی نے صرف تاریخ نویسی کو مد نظر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری نظر میں مختصر اور جامع تعریف علامہ محمد بن سلیمان الکافجی نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

”هو علم يبحث فيه عن الزمان وأحواله وعن أحوال ما يتعلق به من حيث تعيين ذلك وتوقيته“ (المختصر فی علم التاریخ ص: 723)

یعنی تاریخ وہ علم ہے جس میں زمانہ اور اس میں پیش آمدہ حالات اور ان سے متعلق کرداروں کے احوال و تعین اور وقائع و احداث کی توقیت پر بحث کی جاتی

ہے۔

### علم تاریخ کا موضوع:

مذکورہ تعریفات سے واضح ہے کہ علم تاریخ کا موضوع انسان و زمان اور ان سے متعلقہ واقعات و احداث ہیں۔ چنانچہ مفتاح السعادة میں ہے:

”وموضوعه: أحوال الأشخاص الماضية من الأنبياء والأولياء والعلماء والحكماء والشعراء والملوك والساطين وغيرهم“  
(مفتاح السعادة: 250/1)

یعنی تاریخ کا موضوع ماضی کی شخصیات حضرات انبیاء علیہم السلام، اولیاء و علماء، حکماء و شعراء اور ملوک و سلاطین ایسی اہم شخصیات کے احوال و سوانح حیات ہے۔ علامہ سخاویؒ نے انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں تاریخ کا موضوع بیان کیا ہے۔

فرماتے ہیں

”وأما موضوعه: فالأ نسان والزمان“ (الاعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ: ص 7)

یعنی تاریخ کا موضوع انسان اور زمان ہے۔

یہ دو اساسی عنصر ہیں باقی ان کے توابع و متعلقات ہیں۔

### علم تاریخ کی اہمیت:

جہاں تک علم تاریخ کی فضیلت و اہمیت کا تعلق ہے تو وہ اسی سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے ایک ٹکٹ میں اللہ رب العزت نے سابقہ ام کی تاریخ اور انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اقوام کے احوال و اطوار کا تذکرہ فرمایا ہے۔ احادیث پاک کے بھی ایک گراں قدر حصے میں سابقہ ام کے کردار اور طرز عمل پر بحث کی گئی ہے (جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں)۔ چنانچہ شیخ عبدالواہب بن یحییٰ فرماتے ہیں:

”فان علم التاريخ علم جليل القدر شهدت بفضله الآيات  
والاخبار وأعتى بنقله الاثبات والاخبار وأنفقوا في ذلك نفائس  
الاعمار“۔ (الاستبصار: ص 3)

یعنی بلاشبہ علم تاریخ وہ عظیم الشان علم ہے جس کی فضیلت پر کتاب اللہ اور سنت  
رسول اللہ ﷺ شاہد ہیں اور ثقات و حفاظ علمائے کرام اور اہل صلاح نے اس پر  
خصوصی توجہ دیتے ہوئے اپنا قیمتی سرمایہء حیات اس میں صرف کر دیا۔  
علامہ القرطبی کہتے ہیں

”وانه لم يخل من التواريخ كتاب من كتب الله المنزل فمناها  
ماورد باخباره المجمله ومنها ماورد باخباره المفصلة“ (مقدمة  
الشماریخ فی علم التاريخ: ص 11)

یعنی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں  
مجمل یا مفصل طور پر سابقہ ام کے اخبار و احوال اور تاریخ نہ بیان کی گئی ہو۔

تاریخ نویسی میں علوم قرآن و سنت کی تاثیر اور ان کے پیش کردہ رہنما اصولوں کی  
افادیت و اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں محدثین کرام کی مساعی جلیلہ قابل  
مد تحسین ہیں کہ جنہوں نے تعلیمات کتاب و سنت کی روشنی میں اس عظیم الشان علم کو جلا بخشی  
اور کتب تواریخ و سیر و سوانح اور کتب جرح و تعدیل اس کی شاہد عدل ہیں۔ اس سے واضح  
ہے کہ تاریخ نویسی کس قدر مہتمم بالشان اور مقدس فن ہے اور دیانت و امانت اس کی اساس  
و بنا ہے۔

### مورخ کی شخصیت:

تاریخ نویسی چوں کہ انتہائی ذمہ دارانہ اور حساس فن ہے جس کا تعلق براہ راست  
شخصیات و اقوام کی سیر و احوال سے ہے اس لیے مورخ کو چاہیے کہ انتہائی دیانت داری اور  
تحقیق و تدقیق کے ساتھ وقائع نگاری کرے۔ کیوں کہ قلم کی ذرہ سی جنبش اور لغزش سے دعا  
دعا، محرم مجرم اور تخت سے تختہ بن جاتا ہے۔ نیز بلا تحقیق روایات کو ذکر کرنا اور حقائق کو مسخ

کر کے پیش کرنا ایک مؤرخ کے فرائض منصبی کے منافی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔ اس طرح حقوق غصب ہوتے جھوٹ رواج پاتا اور اقوام و مل کے ساتھ دغا بازی فروغ پاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی تعلیمات سے واضح ہے کہ جب بھی کسی قوم نے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کر کے تاریخ سازی کی کوشش کی تو فوراً قرآن کریم نے ان کی تردید کر دی جیسا کہ جب یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا:

﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُ ۖ﴾ (المائدہ: 18)

(ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔)

تو قرآن کریم نے فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۖ﴾ (المائدہ: 18)

(اے نبی! ان سے فرمائیے، پھر اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں

عذاب کیوں کرے گا؟ بلکہ (اصل معاملہ یہ ہے کہ) تم بھی دوسروں کی طرح اللہ

کے پیدا کردہ بشر ہو۔)

اور جب یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ نے اپنی اپنی جگہ پر ملت ابراہیمی پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کیا تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی فوراً تردید کر کے حقائق کو منکشف کر دیا۔ ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا

كَانَ مِنَ الْمُمَسِّكِينَ ۖ﴾ (آل عمران: 67)

(ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی، وہ تو خالص اللہ کے فرمانبردار تھے

اور مشرکین سے بھی نہیں تھے۔)

لہذا مؤرخ کے فرائض میں جہاں صحیح تاریخ نگاری شامل ہے وہاں تاریخ کے مسخ شدہ حقائق سے آگاہ کرنا اور تاریخ کے چہرے سے غبار کو صاف کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں:

”يشترط في المؤرخ أن تتو فر فيه العدالة مع الضبط التام



والتحرى فى العادات وعدم المداھنة للممدوح واللمز  
واستخدام الاشارات الخفيفة لشخص يبغضه بسبب منافسة فى  
رتبة أو اختلاف فى رأى أو نحو ذلك“ (الاعلان والتوبيخ عن ذم  
التاريخ: ص ۴۸۲)

یعنی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو اس کا حافظہ اور یادداشت قوی ہو  
اور وہ لوگوں کے عرف و عادات سے واقف ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ کسی سے  
تعلق یا عقیدت کی وجہ سے اس کی مدح میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لے اور نہ  
اختلاف رائے اور معاصر و ہم مرتبہ ہونے کی بنا پر اپنے مخالف کی تضحیک اور  
اشاروں و کنایوں سے اس کا استہزاء کرے۔

### تحریک اہل حدیث:

اہل حدیث مسلک اس تحریک و طرز فکر کا نام ہے جو تعلیمات نبوت سے پیدا ہوا  
یہ ایک نظریاتی اور اصلاحی تحریک ہے جو امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے فرامین کی روشنی میں  
صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؓ سے چلی آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیے کہ تحریک اہل  
حدیث اسی وقت سے ہے جب سے حدیث مصطفیٰ ﷺ ہے اور اس کا نصب العین ”أطیعوا  
الله وأطیعوا الرسول“ کی دعوت اور بدعات و محدثات کی تردید ہے۔

ایک دیرینہ خواہش تھی کہ برصغیر میں اس جماعت حقہ اور طائفہ منصورہ کی ہمہ گیر اور  
ہمہ جہت خدمات کو دلنشین انداز اور حسین پیرایہ بیان میں مرتب کر کے ملت اسلامیہ کی  
خدمت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی اسلام کی اس اولیں تحریک  
کے اصل حقائق سے روشناس ہوں اور اس جماعت حقہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں  
پھیلائی گئی ہیں ان غلط فہمیوں کو لوگوں کے ذہنوں سے نکال کر انہیں صحیح معلومات سے آگاہ  
کرنے کی کوشش کی جائے۔ بالخصوص گزشتہ دنوں میں جب بعض لوگوں کی طرف سے  
قدامت اہل حدیث پر آوازے کئے کی صداۓ دلخراش بار بار سماع خراشی کرنے لگی کہ جن  
میں سے ایک گروہ نے اپنا صد سالہ اور ایک گروہ نے ڈیڑھ صد سالہ جشن منایا ہے تو اس

ضرورت کو اور زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا کہ ناواقف مسلمانوں کو حقیقت ثابتہ اور حقائقِ اصلہ سے باخبر کرنا اب تو لازم اور واجب ہو گیا ہے۔

### اب چند الفاظ مصنف کے بارے میں:

چنانچہ احبابِ گرامی قدر کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس کے لیے محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کو تکلیف دی جائے۔ وہ ایک منجھے ہوئے مصنف اور منصف مزاج صاحبِ قلم ہیں، تاریخ نویسی میں ان کے اشہبِ قلم کی روانی مشہور ہے اور وہ تمام علمی حلقوں میں معروف اور یکساں مقبول ہیں، ان کے بارے میں ان کی کتاب ”نقوشِ عظمتِ رفتہ“ کے ناشر نے بجا فرمایا ہے:

”بھٹی صاحب ایک خاص فقہی مسلک کے حامی ہیں جسے مسلکِ اہل حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ان کی وسعتِ قلب ملاحظہ ہو کہ وہ ہر مسلک کے اہل علم کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور واضح الفاظ میں ان کی خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں، جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ وسعتِ قلب موجودہ دور کے کسی اور مسلک کے اہل علم کے حصے میں نہیں آئی۔“

جب احباب سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی کہ تاریخِ اہل حدیث کے لیے بھٹی صاحب کے ہم پلہ تاریخ دان اور مؤرخ جماعت میں کوئی اور نظر نہیں آتا، اس لیے بقول شاعر:

تمتع من شمیم عرار نجد

وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں پہلی فرصت میں جناب بھٹی صاحب سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھائیں۔ اس خواہش کا اظہار تھا کہ محسوس ہوا کہ احبابِ کرام تو مجھ سے بھی کہیں پہلے سے اس آرزو اور خواہش کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ برادرِ مکرم و محترم مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ نے تو احباب کی اس آرزو کو عملی جامہ پہنانا گویا اپنے اوپر فرض قرار دے لیا اور یہ پروگرام عملی طور پر شروع

کر دیا۔

اللہ تعالیٰ بحسنہ القارۃ الہندیہ کے مدیر الشیخ ابو خالد فلاح المظیری حفظہ اللہ کو جزاے خیر عطا فرمائے کہ جب ان کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو انھوں نے اس پر صا کر تے ہوئے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ تمام احباب شکرِ یے کے مستحق ہیں جن کے ہمہ قسم تعاون سے تاریخ اہل حدیث کی پہلی جلد انتہائی حسین و جمیل پیراے میں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ اپنے دامن میں لیے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ آپ اس کی حسن و خوبی کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں: ع

خوشبو آں باشد کہ خود ہوید نہ کہ عطار بگوید

اس جلد میں بھی صاحب نے تحریک اہل حدیث کے تعارف، عقائد و نظریات اور قدامت مسلک اہل حدیث اور برصغیر میں تحریک اہل حدیث کی آمد پر انتہائی منصفانہ اور سچے تلے انداز میں بحث کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و رحمت سے بھی صاحب کو صحت و عافیت کے جلو میں بقیہ کام کی تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس کا ذخیرہ کو ان کے لیے اور اس عمل جلیل میں کسی طرح سے بھی تعاون کرنے یا دلچسپی رکھنے والوں کے لیے صدقہء جاریہ بنائے۔ آمین۔

عبدالحق محمد صادق

فاضل مدینہ یونیورسٹی

داعیہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی

دولۃ الکویت



## اہل حدیث اور ان کا شرف و امتیاز

حافظ صلاح الدین یوسف - لاہور

برصغیر پاک و ہند میں تحریک عمل بالحدیث کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟ یہ تو خاصا لمبا موضوع ہے جس کی کچھ تفصیل زیر نظر کتاب میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ تاہم اسے زیادہ فروغ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ملا، جس میں امیر الملک نواب صدیق حسن خاں، شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہم کی مساعی حسنہ کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ نواب صاحب نے عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں تقریباً ہر موضوع پر کتابیں تحریر فرمائیں اور متعدد اہم کتابیں (فتح الباری وغیرہ) اپنے خرچ پر طبع کرا کے تقسیم بھی کیں، یوں وہ مجدد العلوم کے مصداق ٹھہرے۔ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مسند حدیث بچھائے رکھی جس سے عرب و عجم کے ہزاروں افراد نے کسب فیض کیا اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں قرآن و حدیث کا چشمہ صافی جاری کیا۔ یوں حضرت مدوح کی تدریس حدیث اور ان کے فیض یافتگان کی مساعی سے تقلید و جمود کے بندھن ٹوٹے اور رسم و رواج کی زنجیریں ڈھیلی ہوئیں۔ مولانا بٹالویؒ نے ”اشاعت السنۃ“ کے ذریعے سے اہل حدیث صحافت کا آغاز کیا۔ ان کے خارا شکاف قلم نے ایک طرف نیچریت اور

مرزائیت پر خوب خوب ضربیں لگائیں تو دوسری طرف مقلدین جامدین سے بھر پور لکری۔ اس سے بھی سلفی تحریک کو بڑی تقویت ملی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بہ یک وقت کئی محاذوں پر چوکی جنگ لڑی۔ وعظ و تبلیغ، تصنیف و تالیف، ہفتہ واری صحافت اور مناظرہ و مباحثہ ہر ہر میدان میں خوب خوب کام کیا۔ یوں فرق ضالہ کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ان سب حضرات کی مختلف النوع خدمات اور سرگرمیوں سے سلفی فکر کو فروغ ملا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ اور ان سے پہلے شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد نے بھی اس میدان میں خوب کام کیا، جس سے بدعات کا زور ٹوٹا، بہت سی رسوم کا خاتمہ ہوا اور عمل بالجہد کا جذبہ لوگوں میں عام ہوا۔ اور جہاد کا وہ سبق بھی امت نے دوبارہ پڑھا جسے اسی طرح فراموش کر دیا گیا تھا، جیسے فقہ کے مقابلے میں حدیث کو متروکاتِ خن میں شمار کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ وقت کے ایک عظیم محقق اور مشہور سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندویؒ اس سلفی تحریک اور اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانے سے آج تک ہمارے دور ادبار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی، وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائقِ شکر یہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا، حدیث نبویؐ کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیاے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی (یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں) لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباعِ نبویؐ کا جو جذبہ کم ہو گیا تھا وہ سالہا سال تک کے لیے دوبارہ پیدا ہو گیا۔ مگر افسوس ہے کہ اب وہ بھی جا رہا ہے۔ اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ”جہاد“ جس کی آگ اسلام کے بحر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سویلیوں پر ٹکلتا پڑا اور کتنے پابجولاں دریاے شور عبور

کر دیے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔  
اس تحریک کی بنیاد تین چیزوں پر تھی۔

(۱) نصب امارت

(۲) زکوٰۃ کی مرکزیت

(۳) اسلام سے تمام بیرونی اثرات کو مٹا کر اس کو پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹانا۔

علمائے اہل حدیث کی تدریسی و تصنیفی خدمت بھی قدر کے قابل ہے۔ پچھلے عہد میں نواب صدیق حسن خان مرحوم کے قلم اور مولانا سید محمد نذیر حسین دہلویؒ کی تدریس سے بڑا فیض پہنچا۔ بھوپال ایک زمانے تک علمائے حدیث کا مرکز رہا۔ قنوج، مسہوان اور اعظم گڑھ کے بہت سے نامور اہل قلم اس ادارے میں کام کر رہے تھے، شیخ حسین عرب یمنی ان سب کے سرخیل تھے اور دہلی میں مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب کی مسند درس پنجھی تھی اور جوق در جوق طالبین حدیث مشرق و مغرب سے ان کی درس گاہ کا رخ کر رہے تھے۔ ان کی درس گاہ سے جو نامور اٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم صاحب آرومی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس درس گاہ کے دوسرے نامور مولانا شمس الحق صاحب مرحوم (صاحب عون العباد) ہیں جنہوں نے کتب حدیث کی جمع و اشاعت کو اپنی دولت اور زندگی کا مقصد قرار دیا اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس درس گاہ کے ایک اور نامور تربیت یافتہ ہمارے ضلع (اعظم گڑھ) میں مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم مبارک پوری تھے جنہوں نے تدریس و تہذیب کے ساتھ ساتھ جامع ترمذی کی شرح ”تحفۃ الاحوذی“ (عربی لکھی)۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور یہ جو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے رفع ہو گیا اور لوگ اس سرِ نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خریدار ہوئی اور قیل و قال کے مکرر گڑھوں کی بجائے حدیث کے اصلی چشمہ مصفیٰ کی طرف واپسی ہوئی۔“

(مقدمہ ”تراجم علماے حدیث ہند“ مولفہ امام خاں نوشہروی مرحوم ص ۳۱-۳۳)  
 مولانا مناظر احسن گیلانی، جو ایک غصصلب خفی عالم اور مصنف تھے، انھوں نے  
 بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مفصل سوانح- سوانح قاسمی- بھی لکھی ہے، وہ  
 بھی تحریک اہل حدیث کی بابت یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

”اس کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن و حدیث)  
 کی طرف توجہ ہندوستان (متحدہ) کے خفی مسلمانوں کی جو پلٹی اس میں اہل حدیث اور غیر  
 مقلدیت کی اس تحریک کو بھی دخل ہے۔ عمومیت غیر مقلد تو نہیں ہوئی، لیکن تقلید جامد اور  
 کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹا۔“ (ماہنامہ ”برہان“ دہلی، اگست ۱۹۵۸ء)

ایک اور مضمون نگار مولانا سید رشید احمد ارشد استاذ عربی جامعہ کراچی ہیں، انھوں  
 نے ”ہندو پاکستان میں علم حدیث“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں وہ تحریر  
 کرتے ہیں۔

”آخری زمانے میں حدیث کی تدریس و اشاعت سے ہندوستان میں اہل  
 حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو ائمہ کی تقلید کی مخالفت کرتا تھا، اس کی وجہ سے خفی علما میں  
 بھی کتب حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ فقہی مسائل کو احادیث کی روشنی میں ثابت  
 کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اس طرح اس فرقے کا وجود علم حدیث کی ترقی کا باعث بنا۔“  
 (ماہنامہ ”البلاغ“ کراچی۔ ترجمان دارالعلوم کراچی۔ ذوالحجہ ۱۳۸۷ء۔ جلد اول، شمارہ ۱۲)  
 ص ۲۵)

مذکورہ اقتباسات سے واضح ہے کہ۔

- ☆ عمل بالجہد حدیث کی تحریک سے متحدہ ہندوستان میں تقلید و جمود کے بندھن ڈھیلے  
 ہوئے اور کورانہ اعتماد کا طلسم ٹوٹا۔
- ☆ تحقیق و اجتہاد کا دروازہ کھلا اور فقہی مسائل کی چھان بین کا شوق پیدا ہوا۔
- ☆ بہت سی بدعات کا خاتمہ ہوا اور رسوم و رواج کے بت ٹوٹے۔
- ☆ تحریک کی ہمہ گیریت اور غلغلے نے اپنوں اور بیگانوں سب کو متاثر کیا۔

- ☆ حدیث کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت کا ذوق عام ہوا۔  
 ☆ فقہی اقوال و آرا کو قرآن و حدیث کے دلائل سے مزین اور محقق کرنے کا احساس پیدا ہوا۔

برصغیر پاک و ہند میں مذکورہ ثمرات اس جماعت کی ہمہ جہتی مساعی کے نتیجے میں حاصل ہوئے جو فکر و مسلک محدثین کی حامل اور ان کے علم کی وارث تھی۔ اس جماعت نے محدثین ہی کی طرح کسی لگاؤ اور فقہی و حزبی تعصب کے بغیر حدیث پر عمل کرنے کے جذبے کا احیا کیا۔ مخالفین اور معاندین نے اس جماعت حقہ اور طائفہ منصورہ کو ایک نئے فرقے سے تعبیر کیا اور اس کے جذبہ عمل بالحدیث کو (نعوذ باللہ) فتنہ انگیزی ٹھہرایا، حالاں کہ یہ کوئی نیا فرقہ نہیں تھا بلکہ اس فکر و عمل کا ایک تسلسل تھا جو تہلیدی فرقوں کے ظہور سے پہلے عہد صحابہ سے چلا آ رہا تھا۔ ہندوستان میں بے عمل مسلمان بادشاہوں اور مذہب کے نام پر صوفیا اور جامد فقہا نے اصل دین سے عوام کو دور رکھا ہوا تھا، اس لیے جب سلفی تحریک کے ذریعے سے اصل دین اجاگر ہوا، سنتوں کا احیا عمل میں آیا اور توحید کی ضیا پاشیوں نے دلوں کو منور کیا تو انھوں نے ان عالمان دین متین اور وارثان رسول امین سے عوام کو بدظن کرنے اور اپنے حلقہ ارادت کے لوگوں کو ان سے دور رکھنے کے لیے اس جماعت کو ایک نیا فرقہ باور کرانے کی مذموم سعی کی جو یکسر خلاف واقعہ بات تھی۔ حقیقت میں یہ جماعت اس نبوی پیش گوئی کی مصداق ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے۔

لاتزال من امتی امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى ياتي امر الله وهم على ذلك. (صحيح البخارى)  
 كتاب المناقب، باب ۲۸، حديث ۳۶۴۱۔ صحيح مسلم، الامارة،  
 باب ۵۳۔ حديث (۱۹۲۰)

”میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم (صحیح دین) پر قائم رہے گا، اس کو چھوڑنے والا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، نہ اس کی مخالفت کرنے والا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے گا۔ (یعنی قیامت برپا ہو جائے گی) اور وہ اسی (صحیح



دین) پر ہوگا۔“

یہ امت قائم پہلے پہل صحابہ کرام کی شکل میں تھی، پھر تابعین اور تبع تابعین اس کا مصداق بنے، ان کے بعد وہ محدثین جنہوں نے جمع و تدوین حدیث کا نہایت عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا، اس معیار پر قائم رہے۔ ان کے بعد آج تک یہ گروہ کسی نہ کسی انداز میں قائم چلا آ رہا ہے، جس نے ہر دور میں اتباع سنت کی وہ مشعل فروزاں رکھی جس کے اولین علم بردار صحابہ کرام تھے۔ متحدہ ہندوستان میں یہ سعادت اہل حدیث کے حصے میں آئی کہ وہ اس مسلک و منہج کو زندہ کریں اور زندہ رکھیں جو صحابہ و تابعین کا تھا۔ اس دور میں تقلید کا نام و نشان نہ تھا، اس لیے تقلید سے وابستگی کو لازمی قرار دینے والے اور ائمہ کے اقوال و آرا کو نصوص کے مقابلے میں ترجیح دینے والے اس امت قائمہ کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اس صحیح اور اصل مصداق صرف وہی لوگ ہوں گے جن کی عقیدت و محبت کا مرکز اور اطاعت و اتباع کا محور صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے اقوال و افعال اور تقریرات ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آج اصحاب الحدیث، اہل الحدیث اور السلفیون وغیرہ ناموں سے عالم اسلام میں متعارف اور موجود ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا، باقی سب جہنمی۔ اور اس جنتی فرقے کی نشانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے جو ماننا علیہ واصحابی۔ ”میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والا ہوگا۔“ (سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب شرح السنۃ، رقم ۴۵۹۶۔ سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء افتراق هذه الامة وقد حسنه الترمذی فی بعض النسخ وقره الالبانی فی شرح عقیدۃ الطحاوی، رقم الحدیث ۲۶۳)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اہل الحدیث کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کس خوبی کے ساتھ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

(۱) ”فہم اعلم الامة بحديث الرسول وسيرته ومقاصده واحواله ونحن لا

نعنی باہل الحدیث المنتصرین علی سماعته او کتابته اور روایتہ بل  
نعنی بہم کل من کان احق بحفظہ ومعرفتہ وفہمہ ظاہراً وباطناً  
واتباعہ باطناً وظاہراً وكذلك اهل القرآن۔

وادنی خصلۃ فی هؤلاء محبة القرآن والحديث والبحث عنهما وعن  
معانيهما، والعمل بم علموه من موجبهما ففقهاء الحديث اخبر  
بالرسول من فقهاء غيرهم، وصوفيتهم اتبع للرسول من صوفية غيرهم  
وامراء هم احق بالسياسة النبوية من غيرهم وعامتهم احق بموالاة  
الرسول من غيرهم۔“

(مفصل الاعتقاد، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج ۴، ص ۹۵)  
پس اہل حدیث رسول اللہ ﷺ کی حدیث، آپ کی سیرت اور آپ کے مقاصد  
واحوال کو سب فرقوں سے زیادہ جانتے ہیں اور ہمارے نزدیک اہل حدیث سے مراد صرف  
وہی لوگ نہیں ہیں جو حدیث کی سماعت یا اس کی تحریر و کتابت یا اس کی روایت کے لیے  
وقف رہے، بلکہ اس لقب اہل حدیث کا مستحق ہر وہ شخص ہے جو حدیث کی حفاظت و معرفت  
اور اس کے ظاہر و باطن کے فہم اور اس کے اتباع میں نمایاں اور ممتاز ہو۔ اسی طرح اہل  
قرآن کا انطباق بھی ان پر صحیح ہے۔

ان لوگوں کی خصلت یہ ہے کہ یہ قرآن و حدیث سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے  
معانی و مفہام پر بحث و گفتگو کرتے ہیں اور ان سے جن واجبات کا انھیں علم ہوتا ہے ان پر  
عمل کرتے ہیں۔ اسی لیے فقہائے حدیث (محدثین کرام) رسول اللہ ﷺ سے دوسرے  
فقہاء کی بہ نسبت زیادہ باخبر ہیں اور ان کے صوفیاء بہ نسبت دوسرے صوفیاء کے رسول اللہ  
ﷺ کے زیادہ پیروکار ہیں اور ان کے امراء حکومت نبوی سیاست کو بہ نسبت دوسروں  
کے زیادہ سمجھنے اور اس کے مطابق رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔“

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر اہل حدیث کی بابت تحریر فرماتے ہیں۔

من المعلوم ان اهل الحديث يشاركون كل طائفة فيما يتحلون به من

صفات الكمال ويمتازون عنهم بماليس عند هم فان المنازع لهم لا  
بدان يذكر فيما يخالفهم فيه طريقا اخرى مثل المعقول والقياس  
والراى والكلام والنظر والاستدلال والمحااجة والمجادلة والمكاشفة  
والمخاطبة والوجد والنوق و نحوذلك وكل هذه الطرق لاهل  
الحديث صفوتها و خلاصتها فهم اكمل الناس عقلا واعد لهم قيا سا  
واصوبهم رايًا واسدهم كلامًا واصحهم نظرا واهداهم استدلالا  
واقومهم جدلا واتهم فراسة واصدقهم الهاما واحدهم بصرا  
ومكاشفة واصوبهم سمعا و مخاطبة واعظمهم واحسنهم وحدا و  
ذوقًا..... (حواله مذكور ص ۹-۱۰)

یہ بات واضح ہے کہ اہل حدیث ان صفات کمال میں دوسرے تمام گروہوں کے  
ساتھ برابر کے شریک ہیں جن سے دوسرے لوگ آراستہ ہیں اور بہت سی صفات میں ان  
سے ممتاز ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے اہل حدیث سے بحث و مجادلہ کرنے  
والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی مخالفت میں کوئی اور طریقہ اختیار کرے جیسے معقول  
قیاس رائے کلام نظر و استدلال مجاہدہ مکاشفہ و مخاطبہ اور وجدان و ذوق اور اس طرح  
کی دوسری چیزیں۔ یہ تمام طریقے اہل حدیث کی شان اور ان کا امتیاز ہیں۔ پس وہ عقل  
میں سب لوگوں سے زیادہ کامل اور قیاس میں سب سے زیادہ انصاف سے کام لینے والے  
رائے میں سب سے زیادہ درست کلام میں سب سے زیادہ درست نظر و فکر میں سب سے  
زیادہ صحیح استدلال میں سب سے زیادہ راہ راست کو پانے والے اور بحث و حجت میں  
سب سے زیادہ موزوں فہم و فراست میں سب سے زیادہ کامل الہام (القائے ربانی) میں  
سب سے زیادہ سچے بصر و نظر اور مکاشفے میں سب سے زیادہ تیز سماعت اور مخاطبے میں سب  
سے زیادہ درست اور وجدان و ذوق میں سب سے زیادہ عظیم اور احسن ہیں۔“  
ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

واذا كانت سعادة الدنيا والاخرة هي با تباع المرسلين فمن

المعلوم ان احق الناس بذلك، هم اعلمهم بآثار المرسلين  
واتبعهم لذلك، فالعالمون باقوالهم وافعالهم المتبعون لها هم  
اهل السعادة في كل زمان ومكان، وهم الطائفة الناجية من اهل  
كل ملة، وهم اهل السنة والحديث من هذه الامة فانهم  
يشاركون سائر الامة فيما عندهم من امور السالة ويمتازون  
عنهم بما اختصوا به من العلم الموروث عن الرسول مما يجهله  
غيرهم اويكذب به. (حوالہ مذکور ص ۲۶)

”جب دنیا و آخرت کی سعادت پیغمبروں کے اتباع میں ہے تو یہ واضح ہی ہے کہ  
اس کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جو پیغمبروں کے آثار (اقوال  
واعمال) کو زیادہ جاننے اور ان کی زیادہ پیروی کرنے والے ہیں۔ پس ان کے  
اقوال وافعال کو جاننے والے اور ان کی پیروی کرنے والے ہی ہر زمانے اور ہر  
جگہ میں اہل سعادت ہیں اور یہی گروہ ہر ملت میں نجات پانے والا ہے اور اس  
امت (محمدیہ) میں یہی حیثیت اہل سنت وحدیث کو حاصل ہے اس لیے کہ وہ  
ساری امت کے ساتھ ان چیزوں میں ان کے شریک ہیں جو ان کے پاس  
رسالت کے امور میں سے ہیں اور اس علم میں ان سے ممتاز ہیں جس میں انھیں  
درجہ اختصاص حاصل ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی وراثت ہے جس سے  
دوسرے لوگ نا آشنا ہیں یا اس کو جھٹلانے والے ہیں۔“

اہل حدیث کی تعریف کرتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے

ہیں:

”فهذه الطبقة كان لها قوة الحفظ والفهم والفقہ في الدين والبصر  
والتاويل، ففجرت من النصوص انهار العلوم، واستتبقت منها  
كنوزها ورزقت فيها فهما خاصا، كما قال امير المؤمنين علي بن  
ابي طالب رضي الله عنه وقد سئل ”هل خصكم رسول الله

ﷺ بشیء دون الناس؟ فقال لا والذي فلق الحبة و برأ النسمة الا فهما يوتيه الله عبدا في كتابه فهذا الفهم هو بمنزلة الكلاء والعشب الذي انبتته الا رض الطيبة وهو الذي تميزت به هذه الطبقة عن الطبقة الثانية وهي التي حفظت النصوص فكان همها حفظها و ضبطها. فوردھا الناس وتلقوها بالقبول و استنبطوا منها واستخر جوا كنوزھا واتجروا فيها و بذروھا فی ارض قابلة للذرع والنبات ورووها كل بحسبه (قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ)۔ وھولاء الذين قال فيهم النبی ﷺ ”نضر الله امرءاً سمع مقالتي فوعاھا ثم اداھا كما سمعھا فرب حامل فقه و ليس بفقيه و رب حامل فقه الى من هو افقه منه“۔

”پس یہی طبقہ اہل حدیث وہ ہے جسے قوت حفظ، فہم و فقاہت دین اور بصرو تاویل کی صلاحیت حاصل ہے۔ پس اس نے نصوص سے علوم کی نہریں جاری کیں ان نصوص سے ان کے خزانے نکالے اور ان میں خصوصی فہم عطا کیا گیا، جیسے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کی بابت کوئی خصوصی علم بھی دیا ہے جو آپ نے دوسروں کو نہیں بتایا؟ تو حضرت علی نے فرمایا۔ ”نہیں! اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور مخلوق کو پیدا کیا..... ہاں فہم کی بات اور ہے جو اللہ اپنے بندے کو اپنی کتاب کی بابت عطا کرتا ہے۔“

پس یہی فہم کتاب اس گھاس چارے کی مثل ہے جسے پاکیزہ زمین اگاتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے یہ طبقہ اہل حدیث دوسرے طبقے سے ممتاز ہے، اور یہی طبقہ ہے جس نے نصوص کی حفاظت کی۔ پس اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ان نصوص کا حفظ و ضبط ہی ہے۔ پس اس کے پاس لوگ آئے اور اس سے قبولیت کا یقین حاصل کیا۔ ان نصوص سے مسائل کا استخراج کیا۔ اس

کے خزانے نکالے اس میں تجارت کی اور ایسی زمین میں اس کی کاشت کی جو وسیدیگ اور پیداوار کے قابل تھی اور ہر ایک نے اسے اپنی طاقت کے مطابق سیراب کیا (تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا)۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش رکھے جس نے میرا فرمان سنا اور اسے یاد کیا“ پھر اسے (اسی طرح) آگے پہنچایا جیسے اس نے سنا اس لیے کہ بہت سے حامل فقہ (دین کی بات سننے والے) فقیہ (سنی ہوئی بات سے استنباط کرنے والے) نہیں ہوتے اور بہت سے حامل فقہ (جن کو دین کی بات پہنچائی جاتی ہے) وہ پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔“

اسی طرح امام لاٹکانی اہل حدیث کی تعریف اور اس نام کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

ثم كل من اعتقد مذهباً فالى صاحب مقالته التى احداثها ينتسب والى رايه يستند الا اصحاب الحديث فان صاحب مقالتهم رسول الله ﷺ فهم اليه ينتسبون والى علمه يستندون وبه يستدلون واليه يفتخرون وبذلك يفتخرون وعلى اعداء سنته بقربهم منه يصولون فمن يوازيهم فى شرف الذكر؟ ويباهيهم فى ساحة الفخر وعلو الاسم؟ اذا سمعهم ماخوذ من معانى الكتاب والسنة يشتمل عليهما لتحققهم بهما اولا اختصا صهم باخذهما فهم مترددون فى انتسابهم الى الحديث بين ما ذكر الله سبحانه و تعالى فى كتابه، فقال تعالى ذكره، الله نزل احسن الحديث (الزمر ۲۳) فهو القرآن فهم حملة القرآن واهله وقواءه و حفظته وبين ان ينتموا الى حديث رسول الله ﷺ ، فهم نقلته و حملته فلا شك انهم يستحقون هذا الاسم موجود المعنيين فيهم لمشاهدتنا ان اقتباس الناس الكتاب والسنة منهم

واعتماد البریة فی تصحیحہما علیہم لانا ما سمعنا عن القرون  
التی قبلنا ولا راینا نحن فی زماننا مبتدعا راسافی اقراء القرآن  
واخذ الناس عنه فی زمن من الا زمان ولا ارتفعت لا حد منهم  
رأیة فی روایة حدیث رسول اللہ ﷺ فیما خلت من الايام ولا  
اقتدی بہم احد فی دین ولا شریعة من شرائع الاسلام.

والحمد للہ الذی کمل لهذه الطائفة سهام الاسلام وشر فہم  
بجوامع الاقسام و میزہم من جمیع الانام حیث اعزہم اللہ  
بدینہ و رفعہم بکتابہ و اعلى ذکرہم بسنة و ہداهم الی طریقته  
و طریقہ رسولہ فہی الطائفة المنصورة والفرقة الناجیة والعصبۃ  
الہادیة والجماعة العادلۃ المتمسک بالسنة التی لا ترید  
برسول اللہ بدیلا ولا عن قولہ تبدیلا ولا عن سنتہ تحویلا ولا  
یشیہم عنہا تقلب الاعصار ولا یلوہیہم عن سمتہا تغیر الحدثان ولا  
لا یصرفہم عن سمتہا ابتداء من کاد الاسلام لیصد عن سبیل  
اللہ و یبغیہا عوجا و یصرف عن طرقہا جدلا و لجاجا ظنا منہ  
کاذبا و تخمینا باطلا انه یطفی نور اللہ واللہ متم نوره و لو کرہ  
الکافرون۔“

(شرح اصول اعتقاد اہل السنة والجماعة، ج ۱ ص ۲۳-۲۵، بہ  
تحقیق احمد سعد حمدان)

”ہر وہ شخص جو کسی مذہب (مسلک) سے وابستگی رکھتا ہے تو وہ اسی صاحب  
مذہب کی طرف جو اس کا بانی ہوتا ہے اپنا انتساب کرتا اور اسی کی رائے سے  
استناد کرتا ہے۔ سوائے اہل حدیث کے اس لیے کہ ان کے صاحب مذہب خود  
رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پس وہ انہی کی طرف اپنی نسبت کرتے اور انہی کے علم  
سے استناد کرتے ہیں اور دشمنان سنت پر سنت کے ہتھیار ہی سے حملہ کرتے ہیں“

پس کون ہے جو اس شرف ذکر میں اہل حدیث کا مقابلہ کر سکے اور فخر کے میدان اور نام کی بلندی میں ان پر برتری جتا سکے؟ اس لیے کہ ان کا (اہل حدیث) نام معانی کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔ وہ ان دونوں پر مشتمل ہے، کیوں کہ وہ ان دونوں کے ساتھ ہی تحقق کرتے یا ان دونوں سے ہی بطور خاص دلیل پکڑتے ہیں۔ پس وہ حدیث کی طرف اپنا انتساب کرنے میں متردد ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی اپنی کتاب میں حدیث کہا ہے۔ جیسے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے بہترین حدیث نازل فرمائی ہے۔“

پس یہ حدیث قرآن ہے اور اہل حدیث قرآن کے حامل، اس کے ماننے والے، اس کے قاری اور اس کے حافظ ہیں۔ اور فرامین رسول بھی حدیث ہیں۔ اور اہل حدیث اس حدیث کے بھی ناقل اور اس کے حامل ہیں۔ (پس اہل حدیث کا تردد اس لیے ہے کہ وہ اہل حدیث اس معنی میں ہیں کہ وہ قرآن کے ماننے والے ہیں یا اس معنی میں کہ وہ حدیث کے ماننے والے ہیں)۔ بلاشبہ وہ اس نام کے مستحق ہیں، کیوں کہ دونوں ہی معنی ان کے اندر موجود ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ لوگ انہی سے کتاب وسنت (کا علم) حاصل کرتے ہیں اور مخلوق قرآن و حدیث کی صحیح میں انہی پر اعتماد کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے اپنے سے پہلے زمانے میں نہ سنا اور نہ اپنے زمانے میں دیکھا کہ کسی بدعتی نے قرآن کے پڑھانے میں حصہ لیا ہو اور کسی زمانے میں لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا ہو اسی طرح ماضی میں بھی ان میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی روایت کا جہنڈا بلند کیا، نہ کسی نے دین و شریعت کے معاملے میں ان میں سے کسی کی اقتدا کی۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اس اہل حدیث گروہ کے لیے اسلام کے حصے کو مکمل کر دیا اور تمام اقسام کے ساتھ اس کو مشرف کیا اور تمام مخلوق میں اسے اس اعتبار سے ممتاز کیا کہ اسے اپنے دین کے ساتھ عزت بخشی اور اپنی



کتاب کے ساتھ اسے بلندی عطا کی اور اپنی سنت کے ساتھ اس کا ذکر بلند کیا اور اپنے اور اپنے رسول (ﷺ) کے طریقے کی طرف رہنمائی کی۔ پس یہی طائفہ منصورہ، فرقہ ناجیہ، حق کا علم بردار اور جماعت عادلہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کو تھامنے والی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کو نہیں چاہتی۔ نہ آپ کے فرمان میں کسی تبدیلی کی روادار ہے اور نہ آپ کی سنت سے انحراف اسے گوارا ہے۔ نہ اسے انقلابات زمانہ اس سنت نبوی سے پھیرتے ہیں نہ تغیر حوادث اس کو اس سمت سے موڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور نہ اس شخص کی بدعت سازی ہی اس سے اس کا رخ بدلتی ہے جو اسلام کے خلاف سازش کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے راستے سے روکے، اور اس دین میں وہ کبھی تلاش کرتا ہے اور وہ اس راستے سے لوگوں کو جہل و تکرار کے ذریعے سے پھیرتا ہے۔ یہ جھوٹا گمان اور باطل تخمینہ ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دے گا جب کہ اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے چاہے کافروں کو ناگوار ہی گزرے۔“

زیر نظر کتاب میں اسی جماعت اہل حدیث کی تاریخ، نظریہ و عقیدہ اور اس کی ہمہ جہتی جلیل القدر خدمات کا اجمالی تذکرہ اور ان کی بابت پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جو زیادہ تر اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے آئندہ حصوں میں اس کی خدمات جلیلہ کا (ان شاء اللہ) قدرے تفصیل سے ذکر ہوگا۔

کتاب کے فاضل مؤلف مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب ہیں ((بارک اللہ فی عمرہ وعملہ)) جو جماعت ہی میں نہیں بلکہ پورے علمی حلقے میں معروف ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخ اور شخصیت نگاری ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس میں وہ کمال فن کے منصب پر فائز ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس حصے میں بھی اپنے موضوع کا حق ادا کیا ہے اور امید ہے کہ اگلے حصوں میں بھی کما حقہ موضوع کا حق ادا کریں گے۔

جماعت اہل حدیث نے برصغیر پاک و ہند میں جو دینی و علمی خدمات سر انجام دی

ہیں، اسی طرح دعوت و تبلیغ اور جہاد کے میدانوں میں جو انٹ نقوش چھوڑے ہیں، وہ تاریخ کا ایک سنہری باب، بلکہ اس کا جھومر ہیں۔ لیکن افسوس کہ ابھی تک اسے ایسا مورخ میسر نہیں آیا جو اس کی جملہ تفصیلات سمیت اسے زیب قرطاس کر سکے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے جو ہر باشعور اہل حدیث کو مضطرب رکھتا ہے۔

اس پہلے حصے کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرعہ قال مولانا بھی صاحب حفظہ اللہ ہی کے نام نکلا ہے، وہ ان شاء اللہ اس کے اگلے حصوں میں دیدہ وری کا حق ادا کرتے ہوئے اہل حدیث کی ہمہ جہتی خدمات کا دل آویز تذکرہ بھی اسی تفصیل سے کریں گے جیسا کہ ان کا حق ہے۔ واللہ هو الموفق والمعین۔ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز و وفقہ بتکمیلہ۔ (آمین)

صلاح الدین یوسف

مدیر شعبہ تحقیق و تصنیف و ترجمہ دارالسلام۔ لاہور

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ۔ ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## حرفے چند

یہ خطہ ارض جسے برصغیر کہا جاتا ہے، تین ملکوں کے مجموعے کا نام ہے وہ ملک ہیں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش۔ اگرچہ مسافت کے اعتبار سے یہ خطہ ارض مرکز اسلام (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) سے بہت دور ہے، لیکن اسے یہ سعادت حاصل ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی وسعت پذیر دوائے رحمت اس پر سایہ لگن ہونے لگی تھی اور یہاں کے بعض شہروں اور علاقوں کو دینی اور اسلامی تعلیم کی برکتوں نے اپنی آغوش محبت میں لینا شروع کر دیا تھا اور اس خطے میں قرآن و حدیث کی تبلیغ و اشاعت کے روح پرور سلسلے کا آغاز ہو گیا تھا۔ بعض کتابوں میں کچھ ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ہند“ کا ذکر فرمایا اور اس کے بعض امور سے متعلق دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان میں سے دو روایات کتاب الجہاد باب غزوۃ الہند سنن نسائی میں ہیں ایک مستدرک حاکم میں اور بعض روایات سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے مختلف کتابوں سے اخذ کر کے اپنی عربی تصنیف ”سبحة المرجان فی آثار ہندوستان“ میں درج کی ہیں۔

برصغیر میں عرب مسلمانوں کی مجاہدانہ تگ و تاز کا آغاز:

برصغیر پر عرب مسلمانوں کی طرف سے فوج کشی کا آغاز رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے چار سال بعد ۱۵ ہجری میں ہوا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کا والی مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے حضرت عثمان بن ابوالعاص نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا کمان دار بنا کر ہندوستان کی ایک بندرگاہ ”تھانہ“ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ موجودہ جعفرافیا کی اعتبار سے یہ بندرگاہ سمبلی کے قریب تھی۔ اب بھی اسے چھوٹی سی

بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک روایت کے مطابق عثمان بن ابوالعاص نے اپنے بھائی حکم بن ابوالعاص کو گجرات کاٹھیاواڑ میں تھانہ اور بھڑوچ کی طرف بھیجا اور دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابوالعاص کو فوج دے کر دیہیل پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ تینوں بھائی (عثمان، حکم اور مغیرہ) رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ اس زمانے میں تھانہ، بھڑوچ اور دیہیل بلاد ہندو سندھ کے تین اہم مقامات تھے جن پر سرور کائنات ﷺ کے صحابہ کرام نے سب سے پہلے پرچم اسلام لہرانے کا عزم کیا۔ عرب اصحاب تاریخ تھانہ کو تانہ اور بھڑوچ کو بروص یا بروس رقم کرتے ہیں۔ اس کی مناسب تفصیلات بہ ترتیب زمانی ہم نے اپنی اس کتاب کے بعض مقامات میں درج کی ہیں جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں گی۔

چچ نامہ کی روایت کی رو سے اس عہد میں ہندوستان کے ان علاقوں کا بادشاہ چچ بن سیلاچ تھا جو پینتیس سال سے حکومت کر رہا تھا اور اس کی طرف سے دیہیل کا حکمران سامہ بن دیوانچ تھا۔ دیہیل ایک مشہور تجارتی شہر تھا جو سندھ کے موجودہ شہر ٹھٹھہ کے قریب واقع تھا۔

عہد فاروقی میں بعض صحابہ کرام کرمان اور کرمان کے علاقوں میں بھی وارد ہوئے وہاں جنگیں لڑیں اور اس نواح کے بہت سے حصوں کو فتح کیا۔ یہ علاقے اس دور میں حدود سندھ میں واقع تھے۔ وہاں دربار خلافت سے بعض صحابہ باقاعدہ والی اور گورنر مقرر ہو کر آتے رہے۔

تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رن کچھ کے علاقے میں بھی تبلیغ اسلام اور جہاد کے لیے تشریف لائے جسے عربی زبان کی کتب تاریخ میں ”کس“ لکھا گیا ہے۔ یہ علاقہ موجودہ جغرافیائی صورت حال کے مطابق ہندوستان میں واقع ہے اور اس کی حدود ایک طرف سے صوبہ گجرات، دوسری طرف سے صوبہ راجستھان اور تیسری طرف سے صوبہ سندھ سے ملتی ہیں۔

قلات، لس بیلہ اور بلوچستان کے علاقوں کو بھی چند صحابہ کرام کا قدم بوسی کا شرف

حاصل ہوا۔ اس زمانے میں بلوچستان کسی صوبے یا مخصوص چند مقامات تک محدود علاقے کا نام نہ تھا۔ عربی تاریخوں میں اسے بلوس (ص کے ساتھ) بھی اور بلوس (س کے ساتھ) بھی لکھا گیا ہے۔

خطہ برصغیر میں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، رسول اللہ ﷺ کے پچیس صحابہ کرام تشریف لائے۔ بارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں پانچ حضرت عثمان کے عصر خلافت میں، تین حضرت علی کے دور امارت میں، چار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایام حکومت میں اور ایک یزید بن معاویہ کے زمانہ حکمرانی میں۔

بعض علمائے اصول حدیث نے صحابی کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

اول: وہ جس نے رسول اللہ ﷺ کے قرن عالی قدر میں اسلام قبول کیا، آپ کی محبت و رویت سے بہرہ ور ہوا اور بحالت اسلام وفات پائی۔

دوم: مخضرم: جس نے زمانہ جاہلیت بھی پایا اور دور رسالت مآب ﷺ بھی دیکھا۔ لیکن کسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے فیض محبت سے مستفیض نہ ہو سکا۔ البتہ قبول اسلام کی سعادت عہد رسالت ہی میں حاصل کر لی۔

سوم: مدرک: جس نے آنحضرت ﷺ کا عہد مبارک پایا، اسلام اگرچہ آپ کی حیات طیبہ میں قبول کیا یا بعد میں کلمہ شہادت پڑھ کر دائرۂ ایمان میں داخل ہوا۔

بعض حضرات صحابی کی اس تقسیم سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن وارد برصغیر ہونے والوں میں ان تینوں قسم کے صحابی شامل ہیں۔ ان کے حالات میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ ان میں کون مخضرم اور کون مدرک ہیں۔

ان پچیس صحابہ کرام کے وہ حالات جن کا تعلق برصغیر سے ہے، آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی دور ہی میں اسلام یہاں آ گیا تھا اور قرن اول کے مسلمانوں نے کفرستان ہند میں جنگ و جہاد کی طرح ڈال دی تھی تاکہ اس ملک کے باشندے ان پاکیزہ اخلاق و کردار اعلیٰ تہذیب و ثقافت اور تعلیم و شائستگی کی ان بلند

تریں اقدار سے بہرہ یاب ہو سکیں، جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن پوری قوت اور عظیم فاتح کی حیثیت سے مسلمان اموی حکمران ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت (۹۳ھ) میں محمد بن قاسم ثقفی کے زیرِ کمان پاکستان کے موجودہ صوبہ سندھ کی طرف سے داخل برصغیر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں قبیلہ بنو ثقیف کے اس بہادر جرنیل --- محمد بن قاسم ثقفی --- نے سندھ کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور اس کی سرحدوں کو عبور کر کے ایک طرف ملتان تک آگے بڑھ گئے، تو دوسری موجودہ راجستھان کے متعدد اہم مقامات تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسلامی طاقتوں نے ہتھیار ڈال دیئے، پرچم کفر سرنگوں ہو گیا اور اسلام کے فروغ و اشاعت کی راہیں لمحہ بہ لمحہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئیں۔

### قبیلہ بنو ثقیف اور برصغیر:

قبیلہ بنو ثقیف کے لوگوں نے ابتدائے اسلام میں رسول اکرم ﷺ کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ طائف میں آنحضرت تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے پھر مار مار کر آپ کو لہو لہان کر دیا تھا۔ یہ لوگ بہت سے عرب قبائل کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت اسلام سے متمتع ہوئے تھے۔ لیکن ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدمت اسلام کے بعض نہایت اہم گوشوں میں اللہ نے ان کو اولیت کی سعادت سے نوازا اور ان کی سعی مسلسل اور تنگ و تاز مجاہدانہ سے دنیا کے دور دراز کونوں تک صدائے حق پہنچی۔ اسی بت کدہ ہند کی تاریخ کو سامنے رکھیے کہ یہاں سب سے پہلے اسی قبیلے کے بہادر فوجیوں اور نبی اکرم ﷺ کے جان نثار صحابہ نے توحید کی آواز بلند کی۔

### برصغیر میں حدیث رسول ﷺ

صحابہ کرام کا ہر قول اور ہر عمل حدیث رسول ﷺ اور ارشادات پیغمبر سے ہم آہنگ تھا۔ وہ جہاں جاتے فرامین نبوت ان کے ساتھ جاتے، جن سے زندگی کے تمام نشیب و فراز میں وہ رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ برصغیر میں بھی احادیث مبارکہ کا قلب نواز گنجینہ اور روح پرور ذخیرہ ان کے ساتھ آیا۔ آنحضرت ﷺ کے دنیا سے تشریف لے

جانے کے چار سال بعد ۱۵ ہجری میں صحابہ کی جو جماعت یہاں آئی وہ حدیث رسول اپنے ساتھ لائی۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ ۱۵ ہجری میں اس خطے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔

صحابہ کی مقدس جماعت کے سفر حیات کی منزلیں نبی ﷺ کے فرامین و ارشادات کی روشنی میں طے ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی طرز معاشرت کا ہر گوشہ اور اسلوب زندگی کا ہر پہلو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ عمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ گھر میں ہوں یا باہر سفر میں ہوں یا حضر میں، حالت جنگ میں ہوں یا امن میں، زراعت میں مشغول ہوں یا تجارت میں، ہر لمحے اور ہر حال میں اقوال و احادیث رسول ﷺ کا گلستانِ پر بہار ان کے سامنے لہلہاتا رہتا تھا اور اسی کے سارے میں انھیں روحانی اور جسمانی سکون حاصل ہوتا تھا۔ یہی ان کا مقصد حیات اور یہی ان کا سرمایہ زندگی تھا۔ وہ جس ملک اور جس علاقے میں گئے اور جس منصوبے کے تحت گئے، حدیث رسول اپنے ساتھ لے کر گئے۔ برصغیر میں آئے تو یہ متاع بے بہا ان کے ساتھ تھی اور انھوں نے یہاں جو قدم اٹھایا اسی کی رہنمائی میں اٹھایا۔

برصغیر میں اسلام کے یہ اولین نقوش ہیں جو پہلی مرتبہ ۱۵ ہجری میں اس کی سطح ارض پر ابھرے اور پھر تاریخ کے ایک خاص تسلسل کے ساتھ پوری تیزی سے لمحہ بہ لمحہ ابھرتے اور نمایاں ہوتے چلے گئے۔۔۔ اور یہ اولین نقوش و آثار اس پر عظمت کارواں کے ہیں جنھیں اصحاب حدیث اور اہل حدیث کے عظیم الشان لقب سے پکارا جاتا ہے اور یہی پہلا کارواں تھا جو نبی ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے صرف چار سال بعد برصغیر میں وارد ہوا۔ دوسرا کارواں حدیث تابعین کا، تیسرا محمد بن قاسم اور ان کے رفقاء عالی قدر کا اور چوتھا کارواں تبع تابعین کا تھا۔

یہ پاک باز لوگ جہاں گئے حدیث رسول (ﷺ) ان کے ہم رکاب رہی۔ یہی ان کی زندگی کا حاصل، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اسی کے احکام ان کے شب و روز کا معمول، یہی ان کا اصل مقصد زیست اور یہی ان کا طرہ امتیاز تھا۔

اس کتاب میں ان چار جلیل القدر کاروانوں کی ان مساعی جلیلہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے دور میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں سرانجام دیں۔ یہی وہ ذی مرتبت حضرات ہیں جنھوں نے پہلے پہل یہاں قال اللہ و قال الرسول کی مسرت انگیز اور بہجت افزا صدائیں بلند کیں۔

بعض حضرات فرمایا کرتے ہیں کہ برصغیر میں سب سے پہلے حنفی مسلک آیا، اہل حدیث کی عمر اس ملک میں صرف ڈیڑھ دو سو سال ہے۔ یہ بالکل بے ٹکی اور بے وزن بات ہے اور ان لوگوں کی ذہنی اختراع ہے جو برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور سے واقفیت نہیں رکھتے یا اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ انھوں نے اپنی خواہش کا نام تاریخ رکھ لیا ہے۔ تاریخی واقعات بیان کرنے کے لیے تاریخ کو سمجھنے اور اس کے مختلف گوشوں کو فہم کی گرفت میں لانے کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ پچیس صحابہ کرام جو یہاں آئے وہ حنفی تھے؟ کیا وہ کسی ذی اکرام امام فقہ کے مقلد تھے؟ کیا ان کے بعد یا ان کے زمانے میں برصغیر میں تشریف لانے والے بیالیس تابعین کسی لائق صدا احترام شخصیت کے حلقہ تقلید سے وابستہ تھے؟ ہرگز نہیں! وہ براہ راست نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ پر عمل پیرا تھے اور آپ کے فرامین اقدس پر عامل اور ان کے اولین مبلغ تھے اور اسی متاع گراں بہا کی رفاقت میں انھوں نے اس نواح کا رخ فرمایا تھا۔ ان کا مرکز عمل اور نقطہ ماسکہ صرف قرآن اور حدیث تھے۔ اس کے علاوہ عمل کے لیے کوئی بات کبھی ان کے حاشیہ خیال میں نہیں آئی۔

یہ وہ دور ہے جب فقہی مسالک کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور کسی قابل نکریم امام فقہ کا اس عالم آب و گل میں کوئی وجود نہ تھا۔ صحابہ کا پہلا کارواں برصغیر میں ۱۵ ہجری میں آیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس سے ۶۵ سال بعد ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ہجری میں انھوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۹۳ ہجری میں روفی آراے بزم وجود ہوئے اور ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۰ ہجری میں اس جہان ہست و بود میں نمودار ہوئے اور ۲۰۴ ہجری میں یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔



امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۶۴ ہجری میں ہوئی اور ۲۴۱ ہجری میں وہ عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ صحابہ کرام کے زمانے میں نہ حنفی تھے نہ مالکی نہ شافعی تھے نہ حنبلی۔۔۔ خالص فرامین پیغمبر اور حدیث رسول کا سکھ چلتا تھا کسی امام فقہ کی تقلید کا ہرگز کوئی تصور نہ تھا۔ جب ائمہ فقہ کی پاک باز ہستیاں دنیا میں موجود ہی نہ تھیں تو تقلید کیسی اور کس کی؟ تقلید کے سلسلے ان سے کئی سو سال بعد پیدا ہوئے۔ پہلے صرف قرآن و حدیث اور فقہ کتاب و سنت کی بنیاد پر عمل کی دیواریں استوار کی جاتی تھیں اور اسی پر اسلام کا قصر رفیع الشان قائم تھا اور اسی کا نام اہل حدیث ہے اور اسی کو ماننے اور حرز جان بنانے والے لوگ سب سے پہلے وارد برصغیر ہوئے جنہیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے پُر اعزاز لقب سے پکارا جاتا ہے اور جن کے بارے میں قرآن ناطق ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودیاں ان کے حصے میں آئیں اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

جو حضرات گرامی قدر اہل حدیث کو برصغیر میں نیا مذہب قرار دیتے ہیں، ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اگر اس خطہ ارض میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث نئی ہے تو یہ مذہب بھی نیا ہے اور اگر آنحضرت ﷺ کی حدیث پاک کا وجود چودہ سو سال سے ہے تو اہل حدیث کا وجود بھی چودہ سو سال سے ہے اور اسی کا نام قدامت اہل حدیث ہے۔

تاریخی حقائق ہمیں بتاتے ہیں اور واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلک اہل حدیث اصل دین اور اسلام کی صحیح ترین تعبیر ہے جو صحابہ کرام کے زمانے میں برصغیر میں آیا اور یہاں کے لوگ اس سے آشنا ہوئے۔ باقی سب فقہی مذاہب یا مسلک ہیں جو بہت بعد میں عالم وجود میں آئے۔ اس وقت حنفیت کہاں تھی؟ مالکیت کا وجود کہاں تھا؟ شافعییت اور حنبلیت کہاں تھی؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے کے اہل حدیث یا اصحاب حدیث اور تھے اور یہ اور ہیں۔ یہ بھی مہمل بات ہے اور ابتدائی دور کی اسلامی تاریخ سے عدم تعلق کی دلیل۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع و شرا وغیرہ امور میں جن احادیث پر وہ عمل کرتے تھے انہی پر یہ کرتے ہیں۔ ان بزرگانِ عالی مقام سے ان کی کوئی الگ حدیثیں اور الگ احکام نہیں ہیں۔

اسلام موٹے موٹے دو امور پر مشتمل ہے۔ ایک عبادات اور دوسرے معاملات۔۔۔ ان دونوں کا احادیثِ رسول (ﷺ) میں تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کی جزئیات تک بیان کر دی گئی ہیں۔ ان پر اہل حدیث اللہ کے فضل سے پوری طرح عامل تھے اور عامل ہیں۔

ایک گروہ کا ارشاد گرامی ہے کہ دورِ قدیم کے اہل حدیث وہ تھے جو حدیثیں جمع کرتے تھے۔

ہمارا مقصد کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں ہے، مثبت انداز سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس طائفہ مقدسہ کے عالی قدر ارکان حدیثیں جمع بھی کرتے تھے اور لوگوں کو ان کا درس بھی دیتے تھے یعنی احادیث کی ہر رنگ میں اشاعت فرماتے تھے۔ اب بھی اہل حدیث کا یہی معمول اور یہی کام ہے۔ وہ مدارس میں احادیث کی تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کی شرحیں لکھتے ہیں، ان کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں، ان کی نشر و طباعت کا اہتمام کرتے ہیں، حدیث پر اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں، منکرین حدیث کا باقاعدہ مقابلہ کرتے ہیں، تحریری صورت میں بھی اور تقریری صورت میں بھی۔ حجت حدیث اور استناد حدیث کے موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور ملکوں میں احادیث کو پھیلاتے اور تراجم و شروح کے ذریعے انھیں ہر طبقہ فکر کے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی دورِ صحابہ سے لے کر اب تک اہل حدیث کا یہی طرزِ عمل اور یہی طریق کار ہے اور وہ اس کے لیے ہر آن کوشاں رہے ہیں۔۔۔۔ اور اس کتاب میں اہل حدیث کی انہی مساعی کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اہل حدیث اور مقلدین کے درمیان اصل امتیاز یہی ہے کہ اہل حدیث کہتے ہیں براہِ راست قرآن و حدیث کو مانو جو اسلام کا اصل ماخذ ہے اور مقلدین کا ارشاد گرامی ہے

تقلید کرو۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود ائمہ فقہ کس کی تقلید کرتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ کسی کی بھی نہیں۔۔۔۔۔! وہ صرف کتاب و سنت پر عمل پیرا تھے اور ان کا فرمان ہے کہ اگر ہماری کوئی بات قرآن و حدیث سے مطابقت نہ کرتی ہو تو اسے بالکل نہ مانو۔۔۔!

تقلید ائمہ کے دعوے داروں کو تو حضراتِ ائمہ کرام کے اس فرمان پر لازماً عمل کرنا چاہیے۔ تقلید سمجھ کر ہی اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

گزشتہ سطور میں جو باتیں اختصار سے بیان کی گئی ہیں، کتاب کے آئندہ صفحات میں یہ باتیں ان شاء اللہ قارئین کرام کو تفصیل سے ملیں گی۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ سائندھ لاہور

۱۰۔ فروری ۲۰۰۳ء۔۔۔ ۸۔ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

فون نمبر: ۷۲۲۰۵۹۲



## پہلا باب

## برصغیر میں اہل حدیث کا پہلا کارواں۔۔ صحابہ کرام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

۲۲ اور ۲۳ جمادی الاخریٰ کی درمیانی شب ۱۳ ہجری کو خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ ۲۳ جمادی الاخریٰ کو بالاتفاق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین منتخب کر لیا گیا۔ ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ ہجری کو ابولؤلؤ نے ان پر اس وقت خنجر سے حملہ کیا اور لگاتار چھ وار کیے جب کہ وہ مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ یکم محرم ۲۴ ہجری کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا زمانہ خلافت ساڑھے دس برس پر مشتمل ہے۔ ان کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بہت سے علاقے اور ملک فتح کیے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی انہی کے زمانے میں صحابہ کے قدم پہنچے اور یہاں کے باشندوں کو اسلامی احکام و اقدار سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ تاریخ کی کتابوں میں ہمیں بارہ صحابہ کرام کے نام ملتے ہیں جو عمر فاروقی میں بسلسلہ جہاد وارد برصغیر ہوئے۔ قرآن بتاتے ہیں کہ بہت سے صحابہ ان کے زمانے میں اس ملک میں آئے ہوں گے، مگر افسوس ہے تاریخ نے ان کے نام محفوظ نہیں رکھے، اس لیے ہماری رسائی اس اولوالعزم جماعت کے تمام حضرات کے اسے گرامی تک نہیں ہو سکی۔ ہماری محدود نظر صرف بارہ حضرات تک پہنچ سکی ہے، ان کے بھی زیادہ حالات میسر نہیں آئے۔ سطور ذیل میں ان بارہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں برصغیر پاک و ہند میں آئے اور یہ بارہ صحابہ دراصل اہل حدیث کے اس کارواں کے اولین ارکان ہیں، جن کے قدم مسند لزوم سے برصغیر کی سرزمین سب سے پہلے سعادت اندوز ہوئی۔

## ۱۔ حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی:

قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرام میں حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حافظ ابن حزم ”جمہرۃ انساب العرب“ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کان من خيار الصحابة.

کہ حضرت عثمان کا شمار بلند مرتبت صحابہ میں ہوتا تھا۔

یہ جلیل القدر صحابی طائف کے رہنے والے تھے اور بنو ثقیف کے اس وفد کے ساتھ مدینہ منورہ آئے تھے جو رمضان المبارک ۹ ہجری کو عبد یلیل کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت عثمان کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔

ارکان وفد کئی دن مدینہ منورہ میں اقامت گزیر رہے تھے۔ اس اثنا میں عثمان بن ابوالعاص نے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے قرآن مجید کی چند سورتیں زبانی یاد فرمائی تھیں اور دین کے ضروری مسائل سیکھ لیے تھے۔ اس اعتبار سے ارکان وفد میں نبی ﷺ کے نزدیک دین اسلام کے یہ سب سے زیادہ عالم قرار پائے اور آپؐ نے انھیں طائف کے منصب امارت و امامت سے سرفراز فرمایا۔

۱۴ ہجری میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرے کا معلم مقرر کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال وہ اس منصب عالی پر فائز رہے اور وہاں کے لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا۔

۱۵ ہجری میں حضرت عمرؓ نے انھیں عمان اور بحرین کے علاقوں کا گورنر بنا دیا۔ اسی سال حضرت عثمان بن ابوالعاص نے عمان میں ایک بحری بیڑا تیار کرایا اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی کی قیادت میں اسے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اسلامی حکومت کا یہ پہلا بحری بیڑا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے حکم سے تیار کیا گیا تھا اور یہی وہ اولین بحری بیڑا تھا جو موجودہ جغرافیائی اعتبار سے بمبئی کے قریب

تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں کی طرف حرکت کناں ہوا تھا۔ مجاہد بن اسلام نے ان بندرگاہوں کو فتح کیا، لیکن ان پر قبضہ برقرار نہیں رکھا اور واپس عمان چلے گئے۔ ہندوستان کے کسی علاقے پر عرب مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ یہ پہلا کاروان تہذیب و اسلامی اور اویس قافلہ حاملین حدیث رسول (ﷺ) تھا جو عازم ہند ہوا۔

ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار و صاف ستھری تہذیب و ثقافت اور تعلیم و شائستگی کی ان بلند ترین اقدار سے بہرہ مند کرنا تھا، جن کو اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان کی طرف یہ قافلہ ۱۵ ہجری میں روانہ ہوا تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر صرف چار سال کا عرصہ گزرا تھا اور یہ آپ کے صحابہ کا زمانہ تھا۔ اس بحری بیڑے میں صحابہ کرام کا ایک لشکر سوار تھا، ان حضرات کی نہ تعداد کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کے نام کتب تاریخ میں مل سکے ہیں۔ بحری بیڑا تیار کرنا اور پھر اس کے ذریعے کسی ملک کی طرف روانہ ہونا دو چار یا دس بیس آدمیوں کا کام نہیں، یقیناً یہ حضرات سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو شدید خطرے میں ڈال کر سمندر کی تند و تیز لہروں پر تیرتے ہوئے ایک دور دراز ملک پر چڑھائی کی تھی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ عثمان بن ابوالعاص نے اس بحری بیڑے کی قیادت خود کی تھی اور انہی کی کمان میں تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں کو فتح کیا گیا تھا۔ آخری دور میں انہوں نے بصرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک روایت کی رو سے ۵۱ ہجری میں اور ایک روایت کے مطابق ۵۵ ہجری میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۔ حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفیؓ:

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن

۱۔ حمۃ انساب العرب ص ۲۶۶۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۸۵۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۹۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۲۷۲۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۷۲۔ العقد الثمین فی فتح الہند ص ۵۷۔ در فیما من الصحابہ والاتباع ص ۵۷۔ ۵۷

ابوالعاص ثقفی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ۱۴ ہجری میں جب حضرت عمر فاروقؓ نے عثمان بن ابوالعاص کو معلم بصرہ کا منصب عطا کر کے بصرے بھیجا اور پھر ایک سال بعد ۱۵ ہجری میں جب انھیں عمان اور بحرین کا والی بنایا تو حضرت عثمان نے اپنی جگہ اپنے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص کو طائف کا امیر مقرر کر دیا تھا اس لیے کہ حضرت عمر نے طائف سے مدینہ منورہ بلاتے وقت عثمان کو لکھا تھا کہ جسے آپ مناسب سمجھیں اپنی جگہ طائف کا والی بنادیں اور خود میرے پاس تشریف لے آئیں۔ چنانچہ عثمان طائف کی امارت اپنے بھائی حکم کے سپرد کر کے خود امیر المومنین حضرت عمر فاروق کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

اس سے کچھ عرصے بعد حضرت حکم اپنے بڑے بھائی حضرت عثمان کے پاس چلے گئے۔ عثمان نے ان کو بحرین کا امیر مقرر کیا اور انھوں نے امیر کی حیثیت سے کئی علاقوں پر فوج کشی کی اور فتح یاب ہوئے۔

علاوہ ازیں حکم نے عثمان کے حکم سے بلا سندھ و ہند میں سے بندرگاہ تھانہ، بھڑوچ، دیبل، مکران اور اس کے نواحی علاقوں پر یلغار کی اور جہاں گئے کامیاب رہے۔

ہندوستان کے بعض علاقوں کی طرف آنے والے یہ صحابی رسولؐ (حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی) زندگی کے آخری دور میں بصرے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہیں ۴۵ ہجری میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

### ۳۔ حضرت مغیرہ بن ابوالعاص ثقفیؓ:

یہ بھی حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ فوج البلدان میں بلاذری لکھتے ہیں کہ مغیرہ کو ان کے بھائی عثمان نے عمان سے سندھ کے شہر دیبل پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دیبل کا رخ کیا، دشمن

۱۔ جمہور انساب العرب ص ۲۶۶۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۴۱۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۵۔۔۔ الاماہ ج ۲ ص ۲۸۔۔۔ فوج البلدان ص ۴۰۰۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۴۱۔۔۔ معجم البلدان ج ۲ ص ۴۸۱

پر حملہ آور ہوئے اور فتح پائی۔

چچ نامہ میں مرقوم ہے کہ حضرت مغیرہ نہایت عاقل و فہیم اور دور رس نگاہ رکھنے والے صحابی تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت عثمان کی ہدایات کے مطابق پہلے سندھ کے شہر دہیل کا عزم کیا اور پھر بعض دیگر علاقوں کی جنگوں میں حصہ لیا۔ مثلاً جنگ فارس میں انھوں نے نہایت بہادری اور جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

ان تینوں بھائیوں۔۔۔ حضرت عثمان، حضرت حکم اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہم۔۔۔ نے طائف سے منتقل ہو کر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں کے لوگ انھیں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مالی اور دینی اعتبار سے اس خاندان کو ہمیشہ اونچا مرتبہ حاصل رہا۔

حضرت مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں انتقال ہوا۔ سال وفات کا علم نہیں ہو سکا۔<sup>(۱)</sup>

## ۴۔ حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذحجی:

عرب کے قبیلے بنو مذحج سے تعلق رکھتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ گورے رنگ کے دبلے پتلے اور بظاہر کمزور جسم کے تھے، لیکن جنگ و جہاد میں بہت تیز اور دشمن کے مقابلے میں انتہائی جری تھے۔ لوگوں سے میل جول اور مراسم و روابط میں نہایت متواضع، منکسر اور نرم خو تھے۔

۱۷ ہجری کو عہد فاروقی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت ربیع کو مختلف محاذوں پر عساکر اسلامی کا کمانڈر بنا کر بھیجا تو نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور ہر محاذ پر دادِ شجاعت دی۔ اس زمانے میں بھتان کا زیادہ علاقہ سندھ میں شامل تھا اور کچھ حدود ایران میں واقع تھا، اس محاذ پر بھی وہ گئے اور فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے۔

عہد فاروقی میں انھوں نے زرنج، زالق، کابل، سیوستان، کرمان اور مکران کی جنگوں میں

۱۔ حمزہ انساب العرب ص ۲۶۶۔ فتوح البلدان ص ۲۵۶/۹۲۔ العقد الثمین فی فتوح العرب و من ورد فیہا من



شرکت کی۔ کرمان، مکران اور سیستان کے گورنر بھی رہے۔ ان میں سے بعض علاقوں کا کچھ حصہ اس عہد میں پاکستان کے موجودہ صوبہ بلوچستان میں اور کچھ حصہ سندھ میں شامل تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان علاقوں میں حضرت ربیع نے جو سلسلہ جہاد شروع کیا تھا وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ محکومت میں بھی جاری رہا۔

حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذہبی رضی اللہ عنہ چوتھے صحابی رسول ہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بسلسلہ جہاد اور دیرِ برصغیر ہوئے۔ اس نواح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تبلیغ فرمائی۔ انھوں نے عہدِ معاویہ میں ۵۱ ہجری کو یا اس سے کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

۵۔ حضرت حکم بن عمرو ثعلبی غفاریؓ:

عرب کا ایک مشہور قبیلہ بنو غفار تھا، جس کی ایک شاخ بنو ثعلب کہلاتی تھی۔ حضرت حکم بن عمرو بن مجدع رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو غفار کی اسی شاخ سے تھا۔ اسی وجہ سے انھیں ثعلابی غفاری کہا جاتا ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۷ ہجری میں حضرت حکم کو مکران کا والی مقرر کیا اور لوہاء مکران سے نوازا۔ ۲۳ ہجری میں حضرت حکم نے پورے علاقہ مکران پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔ انھوں نے مکران کا محاصرہ کر لیا تھا، جس کی وجہ سے مکران کے حکمران اور اس کی فوج میں اس قدر بددلی اور مایوسی پھیل گئی کہ ان میں اسلامی سپاہ کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رہی۔ حضرت عمر کو فتح کی اطلاع پہنچائی گئی تو بہت خوش ہوئے۔

امیر المومنین کی خدمت میں فتح مکران کی خوش خبری حضرت صحار عبدی لے کر گئے تھے۔

۱۔ حمزہ انساب العرب ص ۴۷۔۔۔ فتوح البلدان ص ۳۸۵، ۳۸۶۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۶۰۔۔۔  
شذرات الذهب ج ۱ ص ۵۵۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۳۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص  
۱۶۳۔۔۔ المعجم القسطنینی فی فتوح البند ومن وروئعنا من الصحابہ والتابعین ص ۵۸۵۔۔۔ برصغیر میں اسلام  
کے اولین فتوح ص ۵۷۔

مال غنیمت بھی انہی کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔

مکران کا یہ وہ حصہ تھا جو موجودہ بلوچستان میں شامل تھا۔ مکران اور اس کے قرب و جوار کا حکمران اس زمانے میں راجا راسل تھا جو ایرانیوں کا طرف دار اور باجگوار تھا۔ اس نے مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی۔ لیکن صحار عبدی نے برصغیر کے کچھ اس قسم کے حالات معلوم کیے کہ جن کی بنا پر اسلامی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ یہ کس قسم کے حالات تھے؟ اس کا ذکر حضرت صحار کے تذکرے میں آئے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں حضرت حکم کو خراسان کا والی مقرر کر دیا تھا۔ بہ اختلاف روایات انھوں نے ۴۵ یا ۵۰ یا ۵۱ ہجری کو خراسان میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

۶۔ حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ انصاریؓ:

ان کا شمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی قدر صحابہ اور معزز بن انصار میں ہوتا

ہے۔

۲۳ ہجری میں عبد اللہ بن عبد اللہ انصاریؓ کو مکران (بلوچستان) بھیجا گیا۔ اس وقت مکران میں حضرت حکم بن عمرو غفاری معروف جہاد تھے۔ عبد اللہ بن عبد اللہ انصاری نے جہاد مکران میں حکم بن عمرو غفاری کی مدد کی اور آنحضرتؐ کے ان دونوں صحابہ نے اس نواح میں بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔<sup>(۲)</sup>

۷۔ حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاریؓ:

انھوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا اور مشرکین مکہ کے خلاف شریک جہاد ہوئے۔ ان کے دو بھائی اور تھے ان میں سے ایک کا نام ثابت بن عدی اور دوسرے کا عبد الرحمن

۱۔ حمرة انساب العرب ص ۱۸۶۔۔۔ فوج البلدان ص ۳۰۰۔۔۔ طبری ج ۳ ص ۱۸۱، ۱۸۲۔۔۔ طبقات

ابن سعد ج ۷ ص ۲۹، ۲۸۔۔۔ الاصابہ ج ۱ ص ۲۳۶۔۔۔ اسد الغابہ ج ۱ ص ۱۶، ۱۷، ۲۷۔۔۔

البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۷۔۔۔ تہذیب و تہذیب ج ۲ ص ۳۳۶، ۳۳۷۔۔۔ الاستیعاب ج ۱ ص

۳۱۳، ۳۱۴۔۔۔ العقد الثمین ص ۶۱۵، ۵۹۔۔۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۵۹

۲۔ الاصابہ ج ۲ ص ۳۲۸۔۔۔ طبری ج ۳ ص ۱۸۱، ۱۸۲۔۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۹۔۔۔ العقد الثمین ص ۶۱

بن عدی تھا۔ یہ جنگ احد میں شامل تھے۔ یعنی تینوں بھائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی اور اسلام کے نامور مجاہد تھے۔

حضرت عمر فاروق نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ ہل بن عدی کو مکران کا والی مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ہل مکران گئے اور علاقہ مکران اور اس کے گرد و نواح کی فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا جس میں حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ نے بھی ان کی مدد کی۔ حضرت حکم بن عمرو غفاری بھی ان معرکوں میں شریک تھے۔ یہ تینوں بزرگ آنحضرت ﷺ کے صحابی تھے۔ یہ ۲۳ ہجری کا واقعہ ہے۔ اسی سال بلوچستان کے بعض علاقے فتح کیے گئے۔ اس میں بھی ان حضرات کا بہت بڑا حصہ ہے۔<sup>(۱)</sup>

## ۸۔ حضرت شہاب بن مخارق بن شہاب تمیمیؓ:

یہ قبیلہ بنو تمیم یا قبیلہ بنو مازن کے صاحب احترام فرد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرک صحابی تھے۔ طبری نے سولہویں سن ہجری کے واقعات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق کا عہد خلافت تھا۔

حضرت حکم بن عمرو ثعلبی جب مکران میں مصروف پیکار تھے تو یہ وہاں پہنچے اور شریک جہاد ہوئے۔ اس طرح ارض برصغیر کو ان کی قدم بوسی سے بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔<sup>(۲)</sup>

## ۹۔ حضرت صحار بن عباس عبدیؓ:

کتاب سیرت میں منقول ہے کہ حضرت صحار بن عباس عبدی رضی اللہ عنہ وفد عبدالعیس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے صحابیت کے مرتبہ عالی کو پہنچے۔ منقول ہے کہ یہ وفد تیرہ ارکان پر مشتمل تھا اور یہ تیرہ افراد ۵ ہجری میں یا اس کے پس و پیش دربار نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ ان میں حضرت صحار

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۸۸۔۔۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۸۱۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۶۸۔۔۔ المعجم الکبیر ص ۶۲۔۔۔

۲۔ الاصابہ ج ۳ ص ۴۵۵۔۔۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۸۱/۶۔۔۔ المعجم الکبیر ص ۶۳۔۔۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نفوذ ص ۶۱۔

عبدی بھی تھے۔ ان کا رنگ نہایت سرخ تھا اور وہ ماہر انساب تھے۔  
 حضرت صحار جنگ مکران میں شامل تھے۔ فتح مکران کے بعد انھیں دربار خلافت میں  
 حضرت عمر فاروق کی خدمت میں مژدہ فتح سنانے کے لیے بھیجا گیا تو فاروق اعظم نے بے  
 حد اعزاز کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور فرمایا:  
 مکران کے بارے میں بتاؤ کیسا علاقہ ہے؟  
 ادیبانہ زبان میں جواب دیا:

فہلہا جبل، وماء ہاوشل وتمرها وقل، وعدوها بطل  
 (اس کی نرم و ہموار زمین پہاڑ ہے، پانی کم، کھجوریں ردی اور دشمن  
 بے باک۔)

حضرت عمر نے یہ سن کر فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔<sup>(۱)</sup>

#### ۱۰۔ حضرت عاصم بن عمر و تمیمیؓ:

انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ جنگ قادسیہ میں  
 شریک تھے اور مجاہدانہ فطرت کے مالک تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فتح عراق کے سلسلے میں ان  
 سے کئی شعر منقول ہیں۔

حضرت عاصم بن عمر و تمیمی رضی اللہ عنہ نے نواحِ سندھ میں یلغار کی اور بھستان  
 کے قرب و جوار کا وہ علاقہ جو سندھ سے ملحق تھا، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی زد میں آیا اور  
 مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔<sup>(۲)</sup>

- 
- ۱۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۱۹۳۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶۲۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۴۹۱۔ کتاب  
 البحر ص ۲۹۴۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۷۰۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۲۷۔  
 العقد الثمین ص  
 ۲۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۳۸۔ ج ۳ ص ۲۳۰۔ الاستیعاب ج ۳ ص ۱۲۵۔ العقد الثمین ص ۶۵۔ برصغیر میں اسلام  
 کے اولین نقوش ص ۶۳

## ۱۱۔ حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعیؓ:

طبری کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی ہیں جو عہد فاروقی میں ۲۳ ہجری کو جنگِ جستان میں حضرت عاصم بن عمیر تمیمی رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان دونوں کی جدوجہد سے وہ علاقہ فتح ہوا جو اس زمانے میں بلا و جستان سے لے کر سندھ کے اندرونی حصے تک پھیلا ہوا تھا اور دریائے بلخ بھی اس میں شامل تھا۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ کی جلد ۷ میں ۲۳ ہجری کے واقعات میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔<sup>(۱)</sup>

## ۱۲۔ حضرت نسیر بن دہسم بن ثور عجمی:

امام ابن حزم نے ”جمہرۃ انساب العرب“ میں حضرت نسیر بن دہسم کو عرب کے قبیلہ بنو عجم کے فرد قرار دیا ہے۔ ۲۳ ہجری میں جب حضرت ہبل بن عدی رضی اللہ عنہ نے علاقہ قفص یعنی موجودہ بلوچستان کا کچھ حصہ فتح کیا تو نسیر بن دہسم اس میں شامل تھے اور فوج کے ایک دستے کی کمان ان کے سپرد تھی۔<sup>(۲)</sup>

یہ وہ بارہ صحابی ہیں جو سب سے پہلے برصغیر کے بعض علاقوں میں تشریف لائے اور ان کا شمار اس اولیں جماعت میں ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کا ذخیرہ لے کر اس خطہ ارض میں آئی۔ یہاں ان کے صرف وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق برصغیر کے کسی علاقے سے ہے۔ باقی واقعات حذف کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۳۶۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۱/۱۸۰۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۳۲۔۔۔

الاستیعاب ج ۲ ص ۱۲۵۔۔۔ الفہم الثمین ص

۲۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۳۳۴۔۔۔ طبری ج ۴ ص ۱۸۰/۱۷۹۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۵۵۳۔۔۔ الفہم الثمین

## حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے ان چند صحابہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو برصغیر میں وارد ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غرہ محرم ۲۳ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ ان کا عہدِ خلافت بارہ دن کم بارہ سال پر محیط ہے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو ان کی شہادت کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ ان کے ایامِ خلافت میں فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ دور دراز علاقوں تک پھیلا۔ فارس، خراسان، بھتان، افریقہ، سواحلِ شام اور بحرِ روم ان کے زمانے میں فتح ہوئے۔ نیز ارضِ ہند میں مکران، سندھ اور بلوچستان کے متعدد علاقوں اور شہروں پر عساکرِ اسلامی کے علمِ فتح لہراے۔ اس ضمن میں امام ابو یوسف ”کتاب الخراج“ میں امام زہری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ان افریقیۃ وخراسان وبعض السند الفتحت فی زمن عثمان رضی اللہ عنہ.

یعنی افریقہ، خراسان اور سندھ کے بعض حصے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہِ خلافت میں فتح ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں پانچ صحابہ کرام خطہ برصغیر میں تشریف لائے۔ مسلسل نمبروں کے ساتھ ان کے اسمائے گرامی اور مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

### ۱۳۔ حضرت حکیم بن جبلة عبدیؓ

بعض علمائے اصول کے نزدیک حضرت حکیم بن جبلة عبدی رضی اللہ عنہ مدرک صحابی تھے۔ یعنی انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مبارک پایا، لیکن یہ معلوم

نہیں ہو سکا کہ قبول اسلام کی نعمت آنحضرت کی حیات طیبہ میں حاصل ہوئی یا آپ کے بعد۔!

حضرت حکیم بن جبلة عبدی قبیلہ بنو عبد القیس سے تعلق رکھتے تھے اور پہلے مسلمان سیاح تھے جو سیاحت کی غرض سے برصغیر پاک و ہند کے بعض علاقوں میں آئے اور اس نواح کے حالات و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

بلا ذری نے فتوح البلدان میں ان کے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عامر کو عراق کا والی مقرر کیا تو ایک مکتوب کے ذریعے ان کو حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو ہندوستان بھیجا جائے جو وہاں کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر کچھ ضروری معلومات حاصل کرے اور پھر ان معلومات سے دربار خلافت کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عامر نے حکیم بن جبلة عبدی کو ہندوستان بھیجا۔ وہ بعض علاقوں کے چکر لگا کر واپس آئے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت عثمان نے پوچھا: کچھ معلومات لائے؟  
عرض کیا: امیر المؤمنین! میں دیا رہند میں گھوم پھر کر معلومات لایا ہوں۔  
فرمایا: اپنی حاصل کردہ معلومات بیان کرو۔

بولے:

ماء هاوشل، وثمرها دقل، وارضها جبل، واهلها بطل ان قل  
الجیش فیہا ضاعوا وان کثروا جاعوا۔  
یعنی خطہ ہند کی حالت یہ ہے کہ پانی میلا، پھل روی، زمین پتھریلی، باشندے  
بہادر، چور بے باک، لشکر کم ہو تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ زیادہ ہو تو بھوک  
سے مر جانے کا خطرہ۔

فرمایا: واقعہ بیان کر رہے ہو یا شاعری فرما رہے ہو۔؟  
عرض کیا: واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

حضرت حکیم بن جبلة عبدی فصیح البیان صحابی تھے۔ بعمرہ میں اقامت گزریں

ہو گئے تھے اور وہاں کسی نے ان کو شہید کر دیا تھا۔<sup>(۱)</sup>

### ۱۴۔ حضرت عبید اللہ بن معمر تیمیؓ:

خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں انھیں فوج کا ایک دستہ دے کر مکران اور سندھ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ فتوحاتِ مکران میں انھوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ بعد ازاں اس نواح کے مفتوحہ علاقوں کی امارت ان کے سپرد ہوئی۔ ایک روایت کی رو سے اس صحابی رسول اور امیر مکران نے اصطرخ کے ایک معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا۔<sup>(۲)</sup>

### ۱۵۔ حضرت عمیر بن عثمان بن سعدؓ:

۲۹ ہجری کے لگ بھگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمیر کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو امارتِ مکران کے منصب پر متمکن کیا۔ کافی عرصہ وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ مکران کا یہ وہ حصہ تھا جو سندھ میں شامل تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عمیر بن عثمان رضی اللہ عنہ نے ملکِ شام میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔<sup>(۳)</sup>

### ۱۶۔ حضرت مجاشع بن مسعود سلمیؓ:

ابو عثمان النہدی جو حضرت مجاشع بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع نے ان کو بتایا کہ میں اور میرا بھائی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے آپ سے عرض کیا کہ ہم ہجرت پر آپ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲۔ الاصابہ ج ۱ ص ۳۷۹۔ حمرة انساب العرب ص ۲۹۸۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۳۲۲۔۔۔۔۔

اسد الغابہ ج ۲ ص ۴۰۔۔۔۔۔ العقد الثمین ص ۷۲۔۷۳۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۶۸

۲۔ حمرة انساب العرب ص ۱۴۰۔۔۔۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۴۵۔۔۔۔۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۴۲۵/۴۲۶۔۔۔۔۔

تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۶۶۔۔۔۔۔ الاصابہ ج ۲ ص ۴۳۲/۴۳۳۔۔۔۔۔ فتوح البلدان ص ۲۸۲۔

۳۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۴۲/۱۴۵۔ طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۷۴/۷۵۔۔۔۔۔ العقد الثمین ص ۷۶۔



آپؐ نے فرمایا: ہجرت کا معاملہ تو گزر چکا۔  
ہم نے عرض کیا: پھر ہم آپؐ سے کس چیز کے متعلق بیعت کریں؟  
فرمایا: علی الاسلام والجهاد فی سبیل اللہ (۱)  
کہ خدمتِ اسلام اور راہِ خدا میں جہاد کی بیعت کرو۔  
فیما یعناہ۔

(چنانچہ ہم نے اس سلسلے میں آپؐ سے بیعت کی۔)  
حضرت مجاشعؒ نے موجودہ افغانستان کے دارالحکومت کابل میں اسلامی فوج کے  
ایک دستے کی کمان کرتے ہوئے مخالفین اسلام سے جہاد کیا۔ مورخین کے نزدیک اس  
زمانے میں کابل کا شمار بلادِ ہند میں ہوتا تھا۔ حضرت مجاشعؒ کابل کے بت کدے میں داخل  
ہوئے تو ایک بڑے سے بت کو ہاتھ میں پکڑا اور وہاں موجود لوگوں سے فرمایا: میں نے  
اس لیے اسے ہاتھ میں پکڑا ہے کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ:

انہ لا یضر ولا ینفع

(نہ یہ کسی کو تکلیف پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔)

حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں  
پاکستان کے صوبے بلوچستان میں مخالفین اسلام سے جنگ کی اور اس سے لمحہ علاتے  
بجستان پر علم فتح لہرایا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے برصغیر کے ان علاقوں میں سکونت اختیار  
کر لی تھی اور انھیں اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ مختلف آبادیوں میں آمدورفت کے لیے وہاں  
راستے بنائے زمینیں آباد کیں، کنوئیں کھودے اور کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کیا۔ سرائیں  
تعمیر کیں اور مسافروں کے لیے رہائشی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ (۲)

۱۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب السیاحۃ بعد فتح مکہ علی الاسلام والجهاد صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

۲۔ اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۰۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۲۔۔۔ الاستیعاب ج ۳ ص

## ۱۷۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ قرشیؓ:

ان کا اسم گرامی ان حضرات میں شامل ہے جنہوں نے فتح مکہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ قبول اسلام سے قبل ان کا نام ابن کعبہ یا عبد کلّال تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد یہ آنحضرت کے ساتھ جنگ تبوک میں شریک ہوئے۔

عبدالرحمن بن سمرہ نے فتوحات عراق اور فارس کی بعض جنگوں میں حصہ لیا۔ ۲۳ ہجری میں انھیں بھتان کا والی مقرر کیا گیا اور شہادت عثمان تک اس منصب پر فائز رہے۔ کابل اور خراسان کی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر حملے کیے اور رن کچھ کا علاقہ جو ہندوستان میں واقع ہے اور گجرات کا ٹھیاواڑ اور راجستان کی سرحدوں کے درمیان پڑتا ہے اس صحابی رسول نے فتح کیا۔

زندگی کے آخری دور میں حضرت عبدالرحمن نے بصرے میں سکونت اختیار کر لی تھی اور بہ اختلاف روایات ۵۰ یا ۵۱ ہجری کو وہیں فوت ہوئے۔<sup>(۱)</sup>

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ پانچ صحابی ہیں جو خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں برصغیر پاک و ہند میں بغرض جہاد تشریف لائے اور جن کی مساعی جیلہ سے یہ علاقہ روشناس اسلام ہوا اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچیں۔

۱۔ توح البلدان ص ۲۸۸۔۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۱۶۴۔ کتاب المعارف ص ۱۳۲۔۔ الاصابہ ج ۲ ص

۳۹۳۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۸۔۔ المعقد الثمین

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت کو زینت بخشی۔ وہ چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ ان کی مدتِ خلافت چار برس نو مہینے بنتی ہے۔ ۱۷۔ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو شہید ہوئے۔

حضرت علی کے زمانے میں جیوش اسلام بالائے کمران سے ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے چل کر قیقان پہنچے اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ فتح کیا۔ قیقان، گیرگان کا معرب ہے اور یہ وہی علاقہ ہے جسے اب قلات کہا جاتا ہے اور پاکستان کا حصہ ہے۔ قلات سے عساکرِ اسلامی نے ارض ہند کی طرف حرکت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ یہ ۳۸ ہجری کے اواخر اور ۳۹ ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حسب ذیل تین صحابی برصغیر میں تشریف لائے۔

### ۱۸۔ حضرت خریٹ بن راشد ناجی سامیؓ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خریٹ کو کچھ عرصے کے لیے فارس کے ایک علاقے کا والی مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دی تھی۔

۳۷ ہجری میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر فائز تھے، حضرت خریٹ وارڈ کمران ہوئے۔ اس طرح ارضِ برصغیر کو ان کی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ (۱)

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۴۲۳۔۔۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۴۵۳۔۔۔ العقد الثمین

## ۱۹۔ حضرت عبداللہ بن سوید تمیمیؓ:

قبائل عرب میں قبیلہ بنو تمیم ایک مشہور قبیلہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن سوید اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مخضرم صحابی تھے۔ یعنی انھوں نے زمانہ جاہلیت بھی پایا اور عصر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھا، لیکن کسی سبب سے آنحضرت کے فیض صحبت سے مستفیض نہ ہو سکے۔ البتہ قبول اسلام کی سعادت عہد رسالت ہی میں حاصل کر لی تھی۔ حضرت عبداللہ بن سوید تمیمی بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ علاقہ سندھ کی ایک جنگ میں شریک ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے یہ دوسرے صحابی ہیں جو بغرض جہاد خطہ سندھ میں تشریف لائے اور جن کے نام کا ہمیں علم ہو سکا ہے۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۰۔ حضرت کلیب ابووائلؓ:

ان کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ برصغیر کے کسی علاقے میں آئے اور وہاں ایک درخت دیکھا جس کے سرخ رنگ کے ایک پھول پر سفید حروف میں محمد رسول اللہ کے الفاظ مرقوم تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ تین صحابی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سرزمین برصغیر میں تشریف لائے۔<sup>(۲)</sup>

۱۔ کتاب المحرم ص ۱۵۴۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۹۲ و ج ۵ ص ۹۳

۲۔ لسان المیزان ج ۳ ص ۳۹۰۔۔۔ عیون الاخبار ج ۲ ص ۱۰۵

## حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

حضرت علیؑ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت آتا ہے۔ وہ بیس سال ملکِ شام کے گورنر رہے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ۴۰ ہجری میں زمام خلافت ہاتھ میں لی۔ ۲۲ رجب۔ ۶۰ ہجری کو دمشق میں حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوا۔ اس طرح وہ بیس برس گورنر اور بیس برس خلیفہ رہے۔ ان کا زمانہ اقتدار چالیس برس پر محیط ہے۔ ان کے عہدِ خلافت میں مندرجہ ذیل چار صحابہ کرام خطہٴ برصغیر میں آئے جو اس نواح کے مختلف علاقوں میں سرگرم جہاد رہے اور بعض مفتوحہ مقامات کی امارت انھیں تفویض ہوئی۔

۲۱۔ حضرت مہلب بن ابوسفہ از دی عتقیؓ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر حضرت مہلب بن ابوسفہ بہت کم سن تھے اور ان کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق مدرک صحابی تھے۔

حضرت مہلب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اعزازات سے نوازا۔ مجاہدانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے آگے رہے۔ عرصہٴ دراز تک خراسان کا منصب امارت ان کے سپرد رہا۔ عہدِ معاویہؓ میں ۴۴ ہجری کو حضرت مہلب فوجی کی حیثیت سے حدودِ ہند میں داخل ہوئے اور پھر برصغیر کے بعض دور دراز علاقوں کو پامال کرتے چلے گئے، اس اثنا میں سندھ کے ایک شہر قداہیل کا رخ کیا اور برابر آگے بڑھتے گئے۔

اس عظیم مردِ مجاہد اور صحابی رسول نے ایران کے شہر مرو میں ۸۳ ہجری کو وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۲۹۔۔۔ کتاب المعارف ص ۱۷۵۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۶۱۔۵۔ حمۃ انساب العرب ۳۶۷۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند و سنن و رد فیہا من الصحابہ و التابعین۔

## ۲۲۔ حضرت عبداللہ بن سوار عبدیؓ:

ان کا تعلق بنی مرہ بن ہمام سے تھا اور مد رک صحابی تھے۔

حضرت عبداللہؓ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۳ ہجری میں چار ہزار فوج کے ساتھ حدود ہند کی طرف روانہ کیا اور وہ اس نواح میں مصروف جہاد ہوئے۔ سب سے پہلے رن کچھ کے علاقے کو ہدف توجہ ٹھہرایا اور مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ بعد ازاں دائرہ جہاد قلات کے میدانوں اور پہاڑوں تک پھیلا دیا۔

حضرت عبداللہ نہایت فیاض تھے۔ ایک مرتبہ قلات کے ایک گاؤں میں انھوں نے دیکھا کہ ایک گھر سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ ایک بیمار عورت کے گھر میں کھانا تیار ہو رہا ہے۔ اسی وقت اشیائے خور و نوش اس کے گھر بھجوائیں اور ایک شخص کو مریفہ کی عیادت کے لیے روانہ کیا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ۴۷ ہجری کو قلات میں ترک باشندوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۳۔ حضرت یاسر بن سوار عبدیؓ:

یہ حضرت عبداللہ کے بھائی تھے۔ انہی کے ہم رکاب ہو کر دور معاویہ میں وارد برصغیر ہوئے تھے۔ جن علاقوں میں ان کے برادر مکرم (عبداللہ) نے جہاد کیا وہیں انھوں نے گرم جوشی سے تیغ و سناں کے جوہر دکھائے۔ عالی ہمت اور مضبوط دل گردے کے مالک تھے۔<sup>(۲)</sup>

## ۲۴۔ حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ:

بعض حضرات نے ان کو صحابہ کرام میں اور بعض نے تابعین میں گردانا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں زیاد بن ابوسفیان نے ۵۰ ہجری

۱۔ کتاب البحر ص ۱۵۴ تا ۱۵۵۔ تاریخ الطبری ج ۵ ص ۵۴۷۔ الاصابہ ج ۳ ص ۹۲۔۔۔ طبقات ابن سعد

ج ۵ ص ۳۶۔۔۔ فتح نامہ ص ۱۰۱۔

۲۔ فتح نامہ ص ۱۰۸۔۔۔ فتح المغین ص ۱۰۲۔

میں ان کو جنگ کے لیے فوج کا امیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔  
حضرت سنان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: تمہارے والد کو تمہاری شجاعت و جرات پر فخر تھا۔ اب تمہاری کامیابی اور فتح مندی کا زمانہ آ گیا ہے۔

یہ خواب انھوں نے ۴۲ ہجری میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں مکران کے والی و امیر راشد بن عمرو الجندی تھے۔ اسی سال ان کی شہادت کی اطلاع پہنچی تو حضرت معاویہ کے حکم سے سنان کو وہاں کی امارت تفویض کی گئی۔ انھوں نے اس علاقے میں فتوحات کا دائرہ کافی دور تک پھیلا دیا تھا۔

انھوں نے حجاج بن یوسف کے دورِ آخر میں ۹۴ یا ۹۵ ہجری کو وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ چار صحابہ کرام ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں مخالفین اسلام سے جہاد کی غرض سے برصغیر پاک و ہند کے مختلف مقامات میں آئے اور اس علاقے میں ارشادات پیغمبر اور احادیث پاک کی تبلیغ کا باعث بنے۔



## یزید کا زمانہ حکومت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید نے عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ یزید نے تین سال آٹھ مہینے حکومت کی اور ۱۰ ربیع الاول ۶۴ ہجری کو وفات پائی۔ ان کے زمانے میں ایک صحابی برصغیر میں آئے اور وہ تھے منذر بن الجارود عبدی۔ ان کے حالات مندرجہ ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

### ۲۵۔ حضرت منذر جارود عبدیؓ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں منذر کو اصطر کا والی مقرر کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی طرف سے جنگِ جمل میں شریک ہوئے اور حضرت معاویہ کی مخالفت کی۔

یزید بن معاویہ کے دورِ حکومت میں عبید اللہ بن زیاد کے کہنے سے ۶۰ ہجری میں حضرت منذر کو سرحدات ہند کی طرف روانہ کیا گیا۔ بوقان، قلات اور خضدار کی جنگوں میں انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک روایت کے مطابق ۶۲ ہجری میں سندھ کے مفتوحہ علاقے کی امارت اور گورنری کا منصب ان کے سپرد رہا۔ اسی اثنا میں یہ اختلاف روایات سندھ یا قلات میں ان کی وفات ہوئی۔ وفات کے وقت اس صحابی رسول کی عمر ساٹھ برس تھی۔<sup>(۱)</sup>

یہ اہل حدیث کا پہلا کارواں تھا جو برصغیر میں وارد ہوا۔ اس وقت کوئی فقہی مذہب نہ تھا نہ ائمہ فقہ دنیا میں موجود تھے اور نہ کسی امام کی تقلید کا کوئی تصور پایا جاتا تھا۔

۱۔ فتوح البلدان ص ۲۶۱، ۳۲۳۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۴۵۸۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶۱۔۔۔ معجم نامہ ۱۰۔۔۔

العقد الثمین۔۔۔ برصغیر میں اسلام کے اولیں نقوش ص ۸۵



## برصغیر میں اہل حدیث کا دوسرا کارواں

### تابعین کرام

حالیہ تہذیب اسلامی کا پہلا قافلہ اور اصحاب الحدیث کا اولیٰ کارواں صحابہ کرام کا تھا جو واردِ ہند ہوا۔ ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردارِ صاف ستھری تہذیب و ثقافت اور تعلیم و مشائستگی کی ان بلند ترین اقدار سے فیض یاب کرنا تھا جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔

صحابہ کرامؓ کے علاوہ یہ خطہٴ ارض بہت سے تابعین کرام یعنی رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے صحابہٴ عظام کے تلامذہ کا مسکن رہا ہے۔ ان تابعین کرام میں وہ حضرات بھی تھے جو مختلف اوقات میں جہاد کے لیے یہاں آئے اور وہ بھی تھے جو تبلیغ و اشاعتِ دین کی غرض سے اس خطے میں وارد ہوئے۔ بعض ایسے حضرات بھی تھے جو اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور یہیں رہے۔ ان حضرات نے حدیث و سنت کی نشر و ترویج کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا رکھا۔ بعض کسی دوسرے ملک میں تشریف لے گئے اور وہاں قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرنے کے لیے زندگیاں وقف کر دیں۔

یہاں برصغیر کے ان عظیم القدر تابعین کے مختصر حالات، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور اشاعتِ قرآن و حدیث کے لیے ان کی جدوجہد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ واقعات تاریخ کی روشنی میں ہم ان حضرات کو برصغیر میں اصحاب حدیث کا دوسرا کارواں قرار دیں گے۔ یہ کل بیالیس حضرات ہیں ان کے جو حالات ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، انحصار کے

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

ساتھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ابن اسید بن اخنس:

یہ وہ تابعی تھے جو عرب کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ عبد الملک بن مروان نے ان کو سندھ کا والی مقرر کیا تھا اور یہ ایک عرصے تک علاقہ سندھ میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں سندھ میں ان کا سلسلہ تدریس حدیث بھی جاری رہا۔<sup>(۱)</sup>

عبد الملک ۷۲ ہجری میں مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور ۱۵ اشوال ۸۵ ہجری کو انھوں نے وفات پائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (۹۳) ہجری سے پہلے ہی سندھ کا خاصا بڑا علاقہ فتح ہو چکا تھا اور صحابہ و تابعین کی نہ صرف وہاں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی بلکہ دار الحکومت دمشق کی طرف سے عمال و امرا کا بھی تقرر ہونے لگا تھا۔

۲۔ ابوشیبہ جوہری:

ان کا نام یوسف تھا والد کا اسم گرامی ابراہیم تھا۔ قبیلہ بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے اور تابعی تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی اور باقاعدہ ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ خود ابوشیبہ سے بھی بہت سے حضرات نے علم حدیث حاصل کیا۔

ابوشیبہ اچھے منتظم بھی تھے۔ چنانچہ دیبل اور نیرون کی فتح کے بعد ان کو ان شہروں اور ان کے گرد و نواح کا والی مقرر کر دیا گیا تھا۔<sup>(۲)</sup>

۳۔ تاغر بن زعر:

یہ پہلی صدی ہجری کے نامور بزرگ ہیں اور تابعین کی پاک باز جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بتائیں چل سکا کہ یہ اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے کن کن

۱۔ حمرة انساب العرب ص ۲۶۸۔ المحرم ص ۲۸۸۔ اسد الغابہ ج ۱ ص ۸۴۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۴۶۔

۲۔ لسان المیزان ج ۶ ص ۶۹

صحابہ کرام سے سماع حدیث اور اخذ روایت کا شرف حاصل کیا۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ان کو خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی لشکر کا امیر بنا کر علاقہ سندھ میں بھیجا تھا اور وہاں انھوں نے بہترین خدمات انجام دی تھیں۔<sup>(۱)</sup>

## ۴۔ حاتم بن قبیصہؒ:

حاتم بن قبیصہ بن مہلب بن ابو صفرة ازدی عسکری۔۔۔ خالص عرب تھے اور قبیلہ بنو اذ سے تعلق رکھتے تھے۔ حاتم کے دو بیٹے تھے جو حدیث و فقہ کے ماہر تھے۔ ایک کا نام یزید اور ایک کا روح تھا۔ روح افریقہ کے امیر مقرر کیے گئے تھے اور یزید سندھ کے۔۔۔ یزید کے ایک بیٹے کا نام مغیرہ تھا جو سندھ کے گورنر ہوئے اور وہیں انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ یزید کا ایک بیٹا داؤد تھا اسے پہلے افریقہ کا گورنر بنایا گیا بعد میں سندھ کا۔ یزید کے پوتے ابراہیم بھی کم و بیش بیس سال سندھ، مکران اور کرمان کی مسند گورنری پر فائز رہے۔ حاتم ایک عرصے تک سندھ میں مصروف جہاد رہے۔<sup>(۲)</sup>

## ۵۔ حکم بن منذر عبدیؒ:

ان کی کنیت ابو غیلان تھی۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ سندھ اور اس کے نواح میں جہاد کے لیے آئے اور وہیں وفات پائی۔ حرمازی نے ان کے لیے کہا تھا:

یا حکم بن المنذر بن الجارود

الجوا دوالجواد محبود

سرادق المجد علیک ممدود

بنت فی الجود و فی بیت الجود

حکم بن منذر بڑے سخی اور ہمدرد خلأقی تھے۔ یہ سرزمین سندھ میں آئے اور مخالفین اسلام سے جہاد کیا اور پھر اسی خطہ ارض میں راہی ملک بقاء ہوئے رحمۃ اللہ علیہ<sup>(۳)</sup>

۱۔ ج ۹ نمبر ۹۹

۲۔ حمرة انساب العرب ص ۲۷۰۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۳

۳۔ حمرة انساب العرب ص ۲۹۶۔۔۔ المعارف ص ۲۵۶۔۔۔ العقد الثمین ص ۱۱۳/۱۱۳۔۔۔ ج ۱ نمبر ۱۱۱

## ۶۔ راشد بن عمرو بن قیس ازوی:

قبیلہ بنوازد کے عالی ہمت بزرگ تھے اور تابعین کی مقدس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق نے حضرت راشد کے والد عمرو کو عراق میں قیام کے لیے ایک مکان عطا کیا تھا۔ اس مکان کو ”لولحہ عمرو“ کہا جاتا تھا۔<sup>(۱)</sup> حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں راشد بن عمرو نے فلات اور امید کی جنگوں میں شرکت کی اور کامیاب رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۲ ہجری میں ان کو سندھ اور اس کے اطراف کا امیر مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے عرب کی سکونت ترک کر دی تھی اور سندھ میں اقامت گزریں ہو گئے تھے۔<sup>(۲)</sup> ۷۔ زائدہ بن عمیر طائی کو فی:

ابن سعد نے زائدہ بن عمیر طائی کو کوفہ کے طبقہ ثالثہ کے تابعین میں شمار کیا ہے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو اور متعدد جلیل القدر صحابہ سے روایت حدیث کی، فتح سندھ کے وقت یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ محمد بن قاسم نے جب ایک لمبا چکر کاٹ کر دریاے پیاس عبور کیا اور ملتان کی طرف بڑھنے لگے تو اس وقت زائدہ بن عمیر ان کی فوج میں شامل تھے۔ جوں ہی کفار نے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی، مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی قیادت میں پیش قدمی کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس طرح ملتان کا شہر بغیر کسی بڑی جدوجہد کے مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔<sup>(۳)</sup>

## ۸۔ زیاد بن حواری عجمی:

ان کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض زیاد بن حواری عجمی کہتے ہیں، بعض زیاد بن

۱۔ اھلحدیثین فی فتوح الہند ومن دروہما من الصحابۃ والتابعین ص ۹۹

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۶۔۔ البحر ص ۱۵۵، ۱۵۴۔

۳۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۱۳۔۔۔ فتوح البلدان ص ۳۲۷۔

حواری عبدی تحریر کرتے ہیں اور بعض حواری بن زیادہ لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے زید بن حواری لکھا ہے۔ یہ وہ تابعی ہیں جو جہادِ سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم کے ساتھی اور اس کے بے حد قابل اعتماد فوجی تھے۔ فتحِ سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے جن لوگوں کے ہاتھ راجا داہر کا سر کاٹ کر عراق بھیجا تھا، یہ ان میں شامل تھے۔

زیاد بن حواری نے جن اکابر صحابہ سے روایتِ حدیث کی ان میں حضرت انس بن مالک، معاویہ بن قرہ اور عبد اللہ بن عمر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، رضی اللہ عنہم۔ پھر خود زیاد بن حواری نے بھی سلسلہٴ درسِ حدیث قائم کیا۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں گردانا ہے۔<sup>(۱)</sup>

## ۹۔ ابوقیس زید بن رباح قیسی بصری:

یہ جلیل القدر تابعی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ سے انھوں نے جو احادیث روایت کیں، ان میں ایک حدیث یہ ہے:

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلية. <sup>(۲)</sup>

جو شخص دائرہ اطاعت سے باہر نکلا اور جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ابوقیس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ محمد بن قاسم کے ساتھ جہاد کی غرض سے سندھ آئے، علی بن حامد نے بیچ نامہ میں لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے جس جماعت کو راجا داہر کا سر دے کر عراق بھیجا تھا، ابوقیس اس جماعت کے امیر تھے۔ اس جماعت نے عراق جا کر ہندوستان کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے بہت سے واقعات بیان کیے تھے۔<sup>(۳)</sup>

- 
- ۱۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۳۶۹۔۔۔ تہذیبِ اجتہاد ج ۳ ص ۳۰۷۔۔۔ بیچ نامہ ص ۱۶۱۔۔۔ عقد الثمین ۱۶۶۔
  - ۲۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب وجوب ملازمة المسلمين عند ظهور الفتن وفي كل حال وتحريم الخروج من الطاعة ومفارقة الجماعة
  - ۳۔ تہذیبِ اجتہاد ج ۲ ص ۳۶۷، ۳۶۸۔۔۔ بیچ نامہ ۱۶۱۔

## ۱۰۔ حکم بن عوانہ کلبیؓ:

یہ وہ تابعی تھے جو سیاسی اور انتظامی معاملات میں مہارت رکھتے تھے۔ دوسرے مرتبہ سندھ آئے۔ پہلی مرتبہ محمد بن قاسم کے ساتھ ایک مجاہد کی حیثیت سے باہل سندھ پر قدم رکھا اور عساکر اسلامی کے ساتھ مل کر کفار سے جنگ کی۔ دوسری مرتبہ ہشام بن عبد الملک (حکومت ۲۵ شوال ۱۰۵ ہجری ۶۲ ربیع الثانی ۱۲۵ ہجری) کے عہد حکومت میں آئے جب کہ تمیم بن زید کے بعد انھیں سندھ کا امیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اپنے زمانہ امارت میں انھوں نے سندھ کے مختلف علاقوں میں جہاؤں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم سے آراستہ کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔<sup>(۱)</sup> حضرت حکم بن عوانہ کلبی نے علاقہ سندھ میں شہادت پائی۔<sup>(۲)</sup>

## ۱۱۔ معاویہ بن قرہ مزنی بصریؓ:

ان کے والد حضرت قرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان سے ایک دن کسی نے پوچھا:

کیف ابنک لک؟ قال نعم الابن کفانی امر دنیای و فرغنی  
لآخرتی۔<sup>(۳)</sup>

(آپ کا بیٹا) معاویہ آپ کے بارے میں کیسا ہے؟ بولے میرا بیٹا میرے بارے میں بہت اچھا ہے اس نے مجھے دنیاوی کاموں سے بچالیا اور توشہ آخرت جمع کرنے کے لیے فارغ کر دیا ہے۔)

معاویہ بن قرہ نے متعدد صحابہ سے حدیث پڑھی اور ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ ان صحابہ کرام میں معاویہ کے والد قرہ بن ایاس، معقل بن یسار مزنی، ابویوب انصاری، عبد اللہ بن معقل اور دوسرے بہت سے حضرات شامل ہیں۔ خود معاویہ بن قرہ کا حلقہ درس بھی جاری تھا۔ ان سے بہت سے حضرات نے درس حدیث لیا۔

۱۔ فتح نامہ ص ۲۹۹

۲۔ جہمۃ انساب العرب ص ۲۵۹۔۔۔ فتوح البلدان ص ۱۳۰۔۔۔ لسان المیزان ج ۳ ص ۲۶۸

۳۔ المعتمد العین فی فتوح البند و من ورد فیہما من الصحابہ و التابعین ص ۱۳۰۔

قرآن و حدیث پر عبور کی وجہ سے عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ خلافت میں معاویہ کو بصرے کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ وہ صادق اور ثقہ تابعی تھے۔ معاویہ بن قرہ دو مرتبہ علاقہ سندھ میں آئے اور کافی عرصہ یہاں مقیم رہے۔ ۱۲۲ ہجری میں وفات پائی۔ بصرے میں ان کے اخلاف و اعتقاد اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔<sup>(۱)</sup>

## ۱۲۔ مکحول بن عبداللہ سندھی:

ان کی کنیت ایک روایت کے مطابق ابو عبداللہ ایک کے ابو ایوب اور ایک روایت کی رو سے ابو مسلم تھی۔ علوم قرآن و حدیث میں مہارت کے سبب انھیں ”امام السند والشام“ کہا جاتا تھا۔ سند اور شام دونوں ملکوں میں طویل قیام کی وجہ سے ان کی نسبت شام کی طرف بھی کی جاتی تھی اور سندھ کی طرف بھی۔

مکحول کی زبان صاف نہ تھی اور عربی صحیح نہ بول پاتے تھے۔ لہجہ میں عجیبہ نمایاں تھی۔ زبان میں لکنت بھی تھی اور لہجہ ایسا تھا کہ ق کو کاف بولتے تھے۔ ث، س اور ص میں فرق نہ کر پاتے تھے۔ ع اور الف میں ان کے ہاں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس کے باوجود امام ذہبی ان کو ”عالم اہل الشام“ قرار دیتے ہیں اور حافظ حدیث اور ماہر فقہ کے طور سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

ابو مسہر اور بعض دیگر حضرات کا بیان ہے کہ سندھ کے اس جلیل القدر محدث و فقیہ نے ۱۱۳ ہجری میں وفات پائی۔ ابو نعیم کے بقول ان کا انتقال ۱۱۲ ہجری میں ہوا۔<sup>(۲)</sup>

## ۱۳۔ عبدالرحمن بن عباس:

۸۳ یا ۸۴ ہجری میں عبدالرحمن بن عباس سندھ آئے۔ ان کی آمد سے پہلے سندھ کا جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اس کو منظم کرنے اور مزید علاقہ فتح کرنے کی طرف توجہ مبذول

۱۔ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۷۹-۱۸۰۔۔۔ حمرة انساب العرب ص ۲۰۲۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۲۱

۲۲۲۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۱۳۹۔۔۔ تہذیب المعجم ج ۱ ص ۲۱۳۔۔۔ المعجم الثمین ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔

۲۔ تہذیب المعجم ج ۱ ص ۲۸۹ تا ۲۹۳۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۶۸ تا ۳۷۰۔

فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انھوں نے سماع حدیث کی۔ ان کے دادا حضرت ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان کے والد عباس عوام و خواص میں بے حد قدر و منزلت کے مالک تھے۔

عبدالرحمن بن عباس نے سندھ میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

۱۴۔ عبدالرحمن سندھی:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ امام بخاری نے التاريخ الکبیر میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی سند سے ایک حدیث بھی درج کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عبدالرحمن السندی سمع انساً کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یاکل ولایتو ضامن اللحم.<sup>(۲)</sup>

یعنی عبدالرحمن سندھی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کرتے تھے۔

۱۵۔ قطن بن مدرک کلابی:

قبیلہ بنو کلاب سے تعلق رکھتے تھے۔ تابعی تھے اور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عمال و امرا میں سے تھے۔ جہادِ سندھ میں یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ اسی زمانے میں جب کہ یہ پاک باز لوگ سندھ کے محاذ پر مصروف جہاد تھے، حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے نام ایک مکتوب بھیجا جس میں قطن بن مدرک کلابی کی بہت تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ قطن پر مکمل اعتماد کیا جائے۔ یہ صادق القول و فادار اور لائق احترام شخص ہیں۔ خیانت و بددیانتی سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے۔

۱۔ تاریخ طبری ج ۶ ص ۳۷۳۔ الکامل ابن اثیر جلد ۴ ص ۱۸۷۔۔۔ تہذیب المتعذیب ج ۶ ص ۲۰۵۔۔۔  
تجرۃ انساب العرب ص ۷۱۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الهند و سن در فیما من السماء و التالیعین۔

۲۔ التاريخ الکبیر ج ۲ ص ۲۹۵



قطن کافی عرصہ سندھ میں رہے اور وہاں شعائرِ اسلام پھیلانے کے سلسلے میں انھوں نے بڑی جدوجہد کی۔<sup>(۱)</sup>

## ۱۶۔ قیس بن ثعلبہؓ:

یہ تابعین کے اس عالی مرتبت گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے درسِ حدیث اور تبلیغِ سنت کے ساتھ ساتھ جنگ و جہاد میں بھی باقاعدہ حصہ لیا۔ یہ محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ ایک سپاہی کی حیثیت سے واردِ سندھ ہوئے اور دیبل کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے تھے۔<sup>(۲)</sup>

## ۱۷۔ کہمس بن حسن بصریؓ:

عبادت و زہد میں منفرد تھے۔ محمد بن قاسم کی کمان میں سندھ پر حملہ کیا۔ ابن سعد نے ان کو طبقہ رابعہ کے بصری محدثین و تابعین میں شمار کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل، ابن حبان، ابن سعد، یحییٰ بن معین اور دیگر بہت سے حضرات نے ان کو ثقہ راوی حدیث قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی تصنیف التاریخ الکبیر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن قاسم کی قیادت میں جہاد کی غرض سے جو لشکر سندھ آیا، اس میں یہ شامل تھے۔ ۱۴۹ ہجری میں وفات پائی۔ مشہور بزرگ حضرت حسن بصریؓ کے بیٹے تھے۔<sup>(۳)</sup>

## ۱۸۔ یزید بن ابوبکبشہ سکسکی دمشقیؓ:

حضرت یزید بن ابوبکبشہ دراصل دمشق کے رہنے والے تھے اور تابعین کی عالی قدر جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ابن حبان نے ان کو روایت حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے۔ صحابہ میں سے یزید بن ابوبکبشہ نے حضرت شریح بن اوس اور حضرت ابوالدرداء سے روایت حدیث کی۔ اپنے باپ ابوبکبشہ اور مروان سے بھی سماع روایت کی۔ خود یزید

۱۔ اسد الغابہ ج ۱ ص ۱۲۹۔

۲۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۲۷۷۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۸۵ نیز دیکھئے ص ۵۲۴

۳۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۰۷۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵۰۔۴۵۱۔ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۳۳۴

بن ابوکبشہ سے بھی بہت سے حضرات نے علم حدیث حاصل کیا۔  
آخر میں یزید بن ابوکبشہ کو علاقہ سندھ کا والی بنا دیا گیا تھا۔ یہ سندھ تشریف لائے  
اور فرائض امارت ادا کرنا شروع کیے۔ لیکن یہاں آنے کے اٹھارہ دن بعد ۹۶ ہجری میں  
وفات پا گئے۔<sup>(۱)</sup>

### ۱۹۔ موسیٰ سیلانیؒ:

سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے خادم خاص حضرت انس  
بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔

مقدمہ ابن الصلاح میں موسیٰ سیلانی کو ثقہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے:  
اسنادہ جید، حدث بہ مسلم بحضرة ابی زرعة، وذكرہ ابن ابی  
حاتم الرازی وابن الاثیر الجزری، وو ثقہ یحییٰ بن معین۔<sup>(۲)</sup>

### ۲۰۔ موسیٰ بن یعقوب ثقفیؒ:

موسیٰ بن یعقوب وہ محدث اور تابعی تھے جو محمد بن قاسم کے زمانے میں سندھ میں  
سکونت پذیر ہو گئے تھے، عرب کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس سے محمد بن قاسم کا  
تعلق تھا یعنی قبیلہ بنو ثقیف سے۔۔۔! قرآن و حدیث اور معاملہ فہمی میں مہارت کی بنا پر  
محمد بن قاسم نے ۹۳ ہجری میں سندھ کا شہر اروڑ فتح کرنے کے فوراً بعد انھیں اس شہر کی مسند  
قضا و خطابت پر متمکن کر دیا تھا۔ بعد میں پورے سندھ کے قاضی القضاۃ بنادیے گئے تھے۔  
موسیٰ بن یعقوب ثقفی کا خاندان قرآن و حدیث پر عبور اور فراوانی علم کے اعتبار  
سے دیارِ سندھ کا مشہور خاندان تھا۔ ان کے اخلاف کو ہر دور میں عزت و احترام کا مستحق  
گردانا گیا۔ یہ خاندان سلطان شمس الدین ایلتمش (متوفی ۶۳۳ھ) کے عہد تک سندھ  
اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں موجود تھا۔

۱۔ حمزۃ انساب العرب ص ۴۳۲۔۔۔ تہذیب المجتہب ج ۱۱ ص ۳۵۴، ۳۵۵۔

۲۔ مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۴۶۔۔۔ المعتمد الثمین ص ۲۱۷۔

## ۲۱۔ عبدالرحمن کندیؒ:

امام ابن حزم نے ”جمہرۃ انساب العرب“ میں لکھا ہے کہ والی عراق جاج بن یوسف نے ان کو بھتان کا والی مقرر کر دیا تھا جو (بعض روایات کے مطابق) اس وقت سندھ کا حصہ تھا۔ اپنے دورِ ولایت و امارت میں انھوں نے بعض ملوک ہند سے جہاد کیا۔ جاج نے ان کو ۸ ہجری میں امارت بھتان کی سند دے کر بھیجا تھا۔ جب وہاں ان کے قدم جم گئے اور لوگوں پر اثر و رسوخ قائم ہو گیا تو انھوں نے جاج کی اطاعت گزاری سے انکار کر دیا تھا اور اس سے باغی ہو گئے تھے۔

مسعودی مروج الذهب میں لکھتے ہیں کہ جاج نے عبدالرحمن کندی کو بھتان کا اور اس کے علاوہ ہست، رنج اور ان ترک قبائل کا امیر بنا کر بھیجا تھا جو اس زمانے میں وہاں آباد تھے۔ ان قبائل میں غور اور خلج کے قبائل بھی تھے۔ اپنے عہدِ امارت میں عبدالرحمن کندی نے متعدد والیان ہند سے جنگیں لڑیں۔

سنن ابی داؤد اور بعض دیگر کتبِ احادیث میں ان کی سند سے چند حدیثیں مندرج ہیں۔

منقول ہے کہ ۹۰ ہجری سے کچھ عرصہ بعد جاج بن یوسف نے انھیں قتل کر دیا تھا۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۲۔ عبدالرحمن بیلمانیؒ:

ان کا شمار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موالی میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابو حاتم تھی۔ یہ وہ تابعی ہیں جنھوں نے صحابہ میں سے حضرت عبدالرحمن بن عباس، عثمان بن عفان، عبداللہ بن عمر، سعید بن زید، عبداللہ بن عمرو، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن اوس رضی اللہ عنہم سے روایتِ حدیث کی۔ تابعین کی جماعت میں سے انھوں نے عبدالرحمن اعرج اور نافع بن جبیر بن مطعم سے روایت کی۔

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۴۲۵۔۔ مروج الذهب ج ۳ ص ۱۳۸، ۱۳۹۔۔ تہذیب المعذیب ج ۶ ص ۲۵۶۔

الاغانی ج ۳ ص ۱۷۴۔۔ رجال السند والہند ص ۲۳۹، ۲۴۰۔

ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

ضعیف لا تقوم بہ حجة.

یعنی عبدالرحمن بیلہانی ضعیف راوی ہیں، ان کی مرویات کو قابل حجت نہیں مانا جاسکتا۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مولیٰ تھے اور بیلہانی تھے۔ بیلہان، بھیلہان کا معرب ہے جو سندھ گجرات کا ٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان ایک قصبہ تھا اور یہ قصبہ جنید بن عبدالرحمن مری کے ہاتھوں بنو امیہ کے مشہور حکمران ہشام بن عبدالملک کے عہد حکومت میں فتح ہوا۔<sup>(۱)</sup>

۲۳۔ عمر بن عبید اللہ قرشی تیمی:

ان کی کنیت ابو حفص تھی۔ یہ عرب کے اصحاب سخاوت اور نیک ترین لوگوں میں سے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب ہو کر انھوں نے کابل کا علاقہ فتح کیا۔ جب مخالفین اسلام سے جہاد کرتے اور فتوحات حاصل کرتے ہوئے یہ کابل کی حدود میں داخل ہوئے تو حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔

چچ نامہ کی روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمر بن عبید اللہ کو ارمائیل میں جہاد کی غرض سے بھیجا تھا۔ ارمائیل سندھ کا ایک شہر تھا۔ ایک روایت کے مطابق ارمائیل کو اب لسنی بیلہ کہا جاتا ہے جو قلات میں واقع ہے۔

حجاج بن یوسف نے عمر بن عبید اللہ کو ضمیر کے مقام پر قتل کر دیا تھا جو دمشق سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت عمر بن عبید اللہ کی عمر ساٹھ برس تھی۔<sup>(۲)</sup>

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۳۶۔۔۔ تہذیب المعجم ج ۶ ص ۱۳۹، ۱۵۰۔۔۔ المعجم فی توح البند

۲۔ سنن ورد فیہا سنن الصحابیہ والابنین ص ۲۱۸

۲۔ رجال السنن والبند ص ۳۶۳، ۳۶۰۔

## ۲۴۔ شمر بن عطیہ بن عبد الرحمن اسعدیؓ:

نقد راوی تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ان سے کئی صحیح احادیث مروی ہیں۔  
شمر بن عطیہ وہ تابعی ہیں جو جہاد کے سلسلے میں محمد بن قاسم کے ساتھ واردِ سندھ ہوئے تھے اور جنھوں نے فتوحات ہند میں حصہ لیا تھا۔

پتچ نامہ میں ان کا نام بشیر لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ ان کا اسم گرامی شمر ہے۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۵۔ سعید بن اسلم کلابیؓ:

ان کا شمار تابعین کی پر وقار جماعت میں ہوتا ہے۔ تاریخ الکبیر میں امام بخاری نے لکھا ہے کہ سعید بن اسلم نے بنو کلاب کے ان موالی سے روایت حدیث کی جو قبیلہ بنو غفار سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔

ابن حبان نے سعید بن اسلم کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

ابن ماکولانے لکھا ہے کہ سعید بن اسلم کو سندھ کا والی مقرر کیا گیا تھا اور ان کے بیٹے مسلم کا تقرر خراسان کی ولایت پر ہوا تھا۔

بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے سعید بن اسلم کلابی کو کمران اور اس کی سرحد کی ولایت پر مامور کیا تھا۔

یعقوبی کے بقول حجاج نے سعید بن اسلم کو سندھ اور ہند کی سرحدوں کا والی بنایا تھا اور ان کی رہائش کمران میں تھی۔ انھیں شہید کر دیا گیا تھا اور عرب شاعر فرزدق نے ان کے قتل کے بعد چند اشعار کہے تھے۔<sup>(۲)</sup>

## ۲۶۔ سعید بن کندری قشیریؓ:

طبری کی روایت کے مطابق سعید بن کندری کا شمار خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۱۰۔ فتوح البلدان ص ۲۷۸۔ رجال السند والہند ص ۳۶۶۔

۲۔ تاریخ الکامل ج ۳ ص ۱۷۷۔ فتوح البلدان ص ۳۲۳۔ الاکمال (ابن ماکولان) ج ۶ ص ۹۵۔ حمرة

انساب العرب ص ۲۸۷۔ رجال السند والہند ص ۳۱۴ تا ۳۱۶۔

اللہ عنہ کے عہد خلافت کے ولایت اور امراے سندھ و کمران میں ہوتا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے وقت یہ کمران کے منصبِ امارت پر فائز تھے۔<sup>(۱)</sup>

۲۷۔ سعد بن ہشام انصاریؓ:

یہ وہ تابعی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت حدیث کی اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی سماع حدیث کا شرف حاصل کیا۔

امام نسائی نے سعد بن ہشام کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ سرزمینِ کمران میں جہاد کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ یہ ثقہ راوی تھے۔

امام بخاری "التاریخ الکبیر" میں رقم طراز ہیں کہ حصین بن نافع نے حضرت حسن بصری سے سعد بن ہشام انصاری کے بارے میں یہ الفاظ سنے۔

قتل بارض مکران علی احسن حالہ

یعنی سعد بن ہشام انصاری نے ارضِ کمران میں بہترین حال میں مرحلہ شہادت

پایا۔

تقریب التجزب میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ثقة من الثالثة، استشهد بارض الهند.

کہ سعد بن ہشام ثقہ تھے اور محدثین کے طبقہ ثالثہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خطہ

ہند میں شریعت شہادت نوش فرمایا: (۲)

۲۸۔ حباب بن فضالہ ذہلیؓ:

ارضِ ہند سے کسی نہ کسی شکل میں تعلق رکھنے والے جن تابعین عظام اور عالی مقام

۱۔ رجال السند والہند ص ۴۱۸۔

۲۔ التاريخ الکبیر۔۔۔ تجزب التجزب ج ۳ ص ۴۸۳۔۔۔ رجال السند والہند ص ۴۱۲، ۴۱۳۔

اصحاب حدیث کے اسمائے گرامی قدیم کتب تاریخ میں مرقوم ہیں ان میں ایک نام حباب بن فضالہ ذہلی کا ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ منقول ہے کہ ہندوستان آنے والے اسلامی لشکر میں ان کا نام لکھا گیا تھا۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فتویٰ پوچھا کہ والدین سے اجازت لیے بغیر جہاد کے لیے جاسکتا ہوں یا نہیں۔۔؟ حضرت انسؓ نے واپس والدین کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا۔

خود حضرت فضالہ ذہلی فرماتے ہیں:

اتيت البصرة فلقيت انس بن مالك فقلت له اني اردت سفرا  
فاردت ان استامرک.

قال: واین تريد؟

قلت: الهند.

قال: فحی والدأك او احدهما؟

قلت: حیان.

قال: فراضیان بمخرجک؟

قلت: بل ساخطان، استعدی علی ابی و حبسنی السلطان.

قال: فالدنیا تريد او الاخرة؟

قلت: كليهما.

قال: ما اراك الاستحبطهما كليهما. ارجع الى ابويک

فبرهما واصحبهما، فانک لن تصيب کسباً خيراً منه.

یعنی حباب بن فضالہ کہتے ہیں، میں بھرے آیا اور حضرت انس بن مالک

رضی اللہ عنہ سے ملا۔ میں نے ان سے عرض کیا، میں سفر پر جانا چاہتا ہوں اور

اس کے لیے آپ سے اجازت کا طالب ہوں۔

فرمایا: کہاں جانا چاہتے ہو۔؟

عرض کیا: ہندوستان!

فرمایا: تمہارے ماں باپ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟  
عرض کیا: دونوں زندہ ہیں۔

فرمایا: وہ تمہارے جانے پر خوش ہیں؟

میں نے جواب دیا: خفا ہیں۔ میرے والد نے مجھ پر زیادتی کی۔ (وہ مجھے سلطان کے پاس لے گئے) اور سلطان نے مجھے جانے سے روک دیا۔

فرمایا: دنیا چاہتے ہو یا آخرت؟

عرض کیا: دونوں!

فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ضائع کر بیٹھو گے۔ جاؤ، ماں باپ کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو۔ ان کی خدمت میں رہو، تمہارے لیے اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔<sup>(۱)</sup>

۲۹۔ عبدالرحمن بن عبداللہؓ:

کوفہ کے رہنے والے تھے اور کوفہ کے شعراے بنو امیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تابعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

غزوہ مکران میں شریک تھے جو اب پاکستان کے صوبہ سندھ کا علاقہ ہے۔<sup>(۲)</sup>

۳۰۔ حارث بن مرہ عبدی:

بعض اصحاب تاریخ و سیرت نے حارث بن مرہ عبدی کو تابعی اور بعض نے مد رک صحابی قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتمد علیہ ساتھی اور معاون تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں اور ان کے حکم سے ۳۸ ہجری کو حدود ہند میں داخل ہوئے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حارث بن مرہ اور ان کے بعض ساتھیوں نے

۱۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال (حافظ ذہبی) ج ۱ ص ۲۰۸۔

۲۔ رجال السند والہند ص ۳۳۸، ۳۳۹۔ بحوالہ الاغانی۔



۴۲ ہجری کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے قلات میں جام شہادت نوش کیا۔<sup>(۱)</sup>

### ۳۱۔ حارث بیلمانیؒ:

یہ وہ تابعی تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و ممتاز صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ پھر خود بھی مسند درک حدیث آراستہ کی۔

بیلمان، بھیلمان کی تعریب ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک گاؤں یا قصبہ تھا، جو سندھ، گجرات کا ٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان کہیں واقع تھا۔<sup>(۲)</sup>

### ۳۲۔ ایوب بن زید ہلائیؒ:

ان کی کنیت ابوسلیمان تھی اور ان کا تعلق عرب کے قبیلہ بنی ہلال بن ربیعہ سے تھا، اس لیے ہلائی کہلاتے تھے۔ ان پڑھ دیہاتی تھے۔ لیکن عرب کے مشہور فصیح و بلیغ خطیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سندھ، ہندوستان، مکران اور بامیان کے علاقوں میں بغرض جہاد و سیاحت آئے اور ان علاقوں کی آب و ہوا، تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کیں۔ یہ حجاج بن یوسف کا زمانہ تھا۔

حجاج نے کہا ہندوستان کے بارے میں بتاؤ، کیسا ملک ہے، اس کے باشندے کن عادات و اطوار کے حامل ہیں اور وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے؟

جواب دیا:

بحرہادر، وجبلہا یا قوت، وشجرہا عود، وورقہا عطر و اہلہا  
طغام کقطع الحمام.

۱۔ رجال السنۃ والہند ص ۳۷۸۔

۲۔ تہذیب احمدیہ ج ۹ ص ۲۹۴، ۲۹۵۔ یضمن محمد بن الحارث بیلمانی و محمد بن عبدالرحمن البیلمانی۔

(اس کے دریا موتی اگلنے والے پہاڑ لعل و یاقوت کی کانیں، درخت عود و صندل کے حامل، پتوں میں خوشبو اور مہک، اس کے باشندے کم عقل فاخاؤں کی طرح ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے۔)

حجاج نے مکران کے بارے میں سوال کیا تو ایوب بن زید نے جواب دیا۔

ماء هاوشل، و تمرها دقل، و سهلها جبل، و لصها بطل، ان کنز الجیش فیہا جاعوا وان قلوبا ضاعوا.

(مکران میں پانی کم، کھجوریں ردی، میدان پہاڑوں کی مانند، چورے باک، فوج زیادہ ہو تو بھوک کا خطرہ، کم ہو تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ۔)

حجاج بن یوسف نے ۸۴ ہجری میں انھیں قتل کر دیا تھا۔<sup>(۱)</sup>

### ۳۳۔ حری بن حری باہلی:

عبید اللہ بن زیاد نے ان کو خطہ ہند کے مفتوحہ علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔ ان کی کمان میں ہندوستان کی طرف جو فوج روانہ کی گئی تھی، اس نے متعدد علاقے فتح کیے اور کامیاب واپس گئی۔ حری بن حری دراصل حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ کی فوج کے ایک حصے کے قائد تھے۔<sup>(۲)</sup>

### ۳۴۔ عباد بن زیاد بن ابوسفیان:

عباد نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ اور حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ دونوں بھائیوں سے روایت حدیث کی۔ خود ان سے زہری اور کھول نے روایت کی، جن کا شمار اکابر ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔ مسیح علیٰ الحنفین کی حدیث عباد بن زیاد سے مروی ہے۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ یہ ثقات میں سے تھے۔

۵۳ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو بھتجان کا والی مقرر کر دیا تھا۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۲۲-۲۲۳۔ رجال السند والہند ص ۳۶۱-۳۶۰۔

۲۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲۔

ایک روایت کے مطابق بھتان سندھ میں تھا اور اس کے کچھ حصے کو اب سیون شریف کہا جاتا ہے۔

عباد نے افغانستان کے شہر قندھار اور اس کے گرد و نواح میں دشمنان اسلام سے جہاد کیا اور ہندوستان کے بعض ان علاقوں میں جو بت خانوں کی حیثیت سے مشہور تھے یا ان کے قرب و جوار میں تھے، جنگیں لڑیں۔

عباد نے حدود بھتان اور حدود ہند کے کئی مقامات میں سلسلہ جہاد جاری رکھا۔ ایک مرتبہ وہ دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان کے بعض علاقوں میں داخل ہوئے اور رن کچھ تک پہنچے۔ اس نواح میں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا۔ وہاں سے قندھار کا عزیمت کیا۔ عباد بن زیاد اموی نے ۱۰۰ ہجری میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

### ۳۵۔ یزید بن مفرغ حمیری:

ان کی کنیت ابو عثمان تھی اور تابعی تھے۔ دور بنو امیہ کے قادر الکلام شاعر اور ادیب تھے۔

یزید بن مفرغ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ پیکر صبر و قناعت اور باہمت مجاہد۔ جن دنوں عباد بن زیاد ہندوستان اور قندھار کے علاقوں میں غیر مسلموں کے خلاف مصروف جہاد تھے، یزید بن مفرغ ان کے ہم رکاب تھے۔ اس مرد مجاہد نے ہندوستان کے علاقے رن کچھ میں بھی کفار کے ساتھ جہاد کیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو علاقہ ہند کی طرف روانہ کیا تھا۔ انھوں نے ۶۹ ہجری میں وفات پائی۔<sup>(۲)</sup>

### ۳۶۔ ربیع بن صبیح سعدی بصری:

جلیل القدر تابعی تھے۔ حسن بصری، حمید الطویل، یزید رقاشی، ابو الزبیر، ثابت بنانی

۱۔ تہذیب الہند ج ۵ ص ۹۳۔۔۔ رجال السنہ والہند ص ۴۳۵۔۴۳۶۔

۲۔ وثائق الایمان ج ۵ ص ۳۸۴۔۔۔ الاغانی ج ۷ ص ۲۲۹۔۔۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲۔۔۔ رجال السنہ والہند ص

۵۵۳۔۔۔ لحد الثمین فی فتوح الہند ص ۵۳۰ و فیہا من الصحابہ والاتباع ص ۱۰۹

اور مجاہد بن جبیر وغیرہ حضرات کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا اور روایت حدیث کی۔ حصول علم حدیث کے بعد خود مسند تدوین میں بچھائی اور ان سے سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، کعب، ابن مہدی اور عاصم بن علی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے حدیث کی سماع و روایت کا شرف حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب المعانی کی تیسری جلد میں ان کے متعلق مختلف محدثین کی آرا خاصی تفصیل سے بیان کی ہیں۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق اس مرد مجاہد نے بغرض جہاد بحری راستے سے عزم سندھ کیا۔ سند میں وفات پائی اور بحر ہند کے ایک جزیرے میں دفن کیے گئے۔ حافظ ابن حجر نے ماہر مزی کی کتاب الفاصل کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربیع بن صبیح پہلے شخص ہیں جنہوں نے بصرے میں حدیث کی کوئی کتاب تصنیف کی۔ انہ اول من صنف بالبصرہ۔<sup>(۱)</sup>

ان کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ ۱۵۹ ہجری میں عرب تاجروں کو اہل گجرات سے کوئی ایسی شکایت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ اس کے لیے عباسی خلیفہ مہدی نے عبد الملک بن شہاب مسمی کے زیرِ کمان ایک بحری بیڑا روانہ کیا۔ ۱۶۰ھ میں یہ بیڑا بھاڑ بھوت پہنچا جو بھڑوچ سے سات میل کے فاصلے پر بجانب مغرب ایک کچی بندرگاہ تھی اور وہاں سند کے مدو جزر کے ساتھ جہاز آتے جاتے تھے۔

زمین پر قدم رکھتے ہی اسلامی فوج نے غیر مسلموں پر حملہ کر دیا۔ اہل اسلام کی اس باقاعدہ فوج میں بہت سے رضا کار بھی تھے جن کے سالار ابو بکر ربیع بن صبیح سعدی بصری تھے انھوں نے اسلامی فوج کے سامنے جہاد کے موضوع پر زور دار تقریر کی اور فوجیوں کو جہاد کے لیے جوش دلایا۔ اس کے بعد عرب مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور مخالفین اسلام اسلامی فوج کے اس پُزور حملے کو روک نہ سکے۔

حملے کی تاب نہ لا کر باشندگان گجرات شہر میں چلے گئے اور پھانگ بند کر لیا، اسلامی

فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول پکڑا تو لوگ تنگ آ گئے۔ آخر ایک دن عرب فوج شہر میں داخل ہو گئی اور شہر فتح کر لیا گیا۔ لوگ بھاگ کر بدھوں کے ایک عبادت خانے میں داخل ہو گئے۔ عربوں کو اس عبادت خانے پر قلعے کا شبہ گزرا، انھوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور جلد فتح کرنے کے لیے آتش گیر مادہ پھینکا، جس سے عبادت خانے میں آگ بھڑک اٹھی۔ کچھ لوگ جل کر مر گئے، باقی گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکلے جو تہ تیغ کر دیے گئے۔

اس جنگ میں انتالیس عرب مسلمان شہید ہوئے۔ اتفاق سے یہ وہ دن تھے جب وہاں ایک میلہ لگتا تھا، جس میں قرب و جوار کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ چوں کہ میلے میں شامل ہونے والوں کا بہت بڑا ازدحام تھا اور ساتھ ہی آتش گیر مادے کا اثر فضا میں پھیل گیا تھا، اس لیے شہر میں وبا پھوٹ پڑی، جس سے ایک ہزار مسلمان موت کا لقمہ بن گئے، جن میں ابو بکر بنی بن صبیح سعدی بصری بھی تھے۔ یہ ۱۶۰ھ کا واقعہ ہے۔<sup>(۱)</sup>

۳۷۔ مجاہد بن سعری تمیمیؒ:

یہ وہ تابعی تھے جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کی اور خود ان سے علی بن زید بن جدعان نے حدیث کے بیان و روایت کا شرف حاصل کیا۔ اموی حکمران عبدالملک بن مروان نے مجاہد کو پہلے عمان کا امیر مقرر کیا، اس کے بعد ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کی امارت ان کے سپرد کی گئی۔ سندھ کے والی بھی مقرر ہوئے۔ علاقہ مکران میں جہاد کیا اور وہیں وفات پائی۔<sup>(۲)</sup>

۳۸۔ عطیہ بن سعد عوفیؒ:

انھوں نے حضرت ابو ہریرہ، ابوسعید خدری، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرؓ زید

۱۔ تہذیب و تہذیب ج ۳ ص ۲۲۸۔ تاریخ اکمال ابن اثیر ج ۵ ص ۵۵۔ رجال السنن والہند ص ۴۰۲۔ ۴۰۳۔

۲۔ تاریخ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ تحفۃ انساب العرب ص ۲۱۷۔ رجال السنن والہند ص ۵۱۰۔ ۵۱۱۔

الحق القاسمی فی فوج الہند و سن دردیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔

بن ارقم، عکرمہ بن ثابت اور عبدالرحمن بن جندب رضی اللہ عنہم سے روایت حدیث کی۔ خود عطیہ سے حجاج بن ارطاة، عمرو بن قیس لمائی، محمد بن ابی لیلیٰ وغیرہ متعدد حضرات نے روایت حدیث کی۔

عطیہ، بسلسلہ جہاد محمد بن قاسم کے ساتھ وارد ہند ہوئے تھے۔ آرمائیل سے چلتے وقت محمد بن قاسم نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا تو عطیہ بن سعد کو فوج کے مہینہ پر متعین کیا۔ فتح ملتان کے وقت یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ اس سے کچھ عرصے بعد واپس کوٹنے چلے گئے تھے۔ پھر وہیں رہے اور وہیں ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔<sup>(۱)</sup>

### ۳۹۔ حسن بصریؒ:

حضرت حسن بن ابوالحسن یسار بصری بہت بڑے عالم و زاہد، عابد و متقی اور حسین و جمیل تھے۔ کبار اور مشاہیر تابعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور تمام اوصاف حسنہ سے نوازے گئے۔ ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی اور وادی القرئی کے مقام میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کئی مرتبہ خراسان، کابل اور بھتان کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ ۴۰ ہجری میں حضرت ربیع بن زیاد حارثی بھتان کے محاذ پر روانہ ہوئے تو حسن بصری ان کے سیکرٹری تھے۔ ڈھائی سال کے لگ بھگ حضرت ربیع اس علاقے کے امیر رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے فہرج، زائق، کرکویہ، زرنگ وغیرہ متعدد مقامات فتح کیے۔ حسن بصری ہرمہم اور ہر فتح میں ان کے ہم رکاب تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی تحقیق کے مطابق فہرج کی فتح علاقہ سندھ کی فتح تھی، کیوں کہ یہ شہر سندھ میں واقع تھا۔

حسن بصری کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد اکابر صحابہ کا زمانہ پایا اور ان سے سماع و روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ ۱۱۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔<sup>(۲)</sup>

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۰۴۔۔۔ تہذیب احمد ج ۷ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔۔۔ رجال السنہ والہند ص ۳۵۵۔

۲۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ص ۲۶۸، ۲۶۹۔۔۔ وفیات الامیاء ج ۱ ص ۳۵۴۔۔۔ تہذیب احمد ج ۷ ص ۲۶۳۔

## ۴۰۔ صفی بن فیصل شیبانیؒ:

طبقات ابن سعد میں حضرت صفی بن فیصل شیبانی کا تذکرہ ان کی بیوی سبیبہ بنت عمیر شیبانیہ کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ وہ تابعیہ تھیں اور بصرہ میں مقیم تھیں۔ حضرت عثمان اور حضرت علی سے انھوں نے روایت حدیث کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت صفی جہاد کے سلسلے میں قندابل گئے جو علاقہ سندھ کا شہر تھا۔ بیوی کو اطلاع پہنچی کہ قندابل میں ان کے شوہر صفی وفات پا گئے ہیں تو انھوں نے ایک شخص عباس بن طریف قیسی سے نکاح کر لیا۔ اس پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ صفی واپس آ گئے۔ اب معاملہ حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا گیا تو صفی دوسرے شوہر کے حق میں دست بردار ہو گئے۔

حضرت صفی بن فیصل کو ۵۱ یا ۵۲ ہجری میں ان کے بعض رفقاء کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔<sup>(۱)</sup>

## ۴۱۔ ابوسلمہ زطیؒ:

ان کا تعلق برصغیر کے ان جاٹوں سے تھا جو عرب کے بعض علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بصرے کے سرکاری خزانے کی نگرانی پر جو لوگ متعین تھے وہ برصغیر کے وہ جاٹ اور سیاح تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور بصرے میں اقامت گزریں تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد چالیس اور ایک کے مطابق چار سو تھی۔

ابوسلمہ زطی ان پہرے داروں اور محافظوں کے سردار تھے۔ بلاذری کے

الفاظ ہیں۔

وكان على السيابجة يومئذ ابوسالمة الزطی وكان رجلاً

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۴۷۱۔۔۔ تاریخ طبری ج ۵ ص ۲۷۱۔۔۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ص

صالحاً۔<sup>(۱)</sup>

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بصرے کے خزانے کے  
ہندی محافظوں کے سردار ابوسالمہ زطی تھے جو ایک صالح آدمی تھے۔





## تیسرا باب

## برصغیر میں اہل حدیث کا تیسرا کارواں

محمد بن قاسم اور ان کے رفقاء کرام

برصغیر یعنی قارة الهند میں جس تیسرے کارواں کا آئندہ سطور میں ذکر کرنا مقصود ہے وہ کارواں محمد بن قاسم کا ہے۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مختلف اوقات میں سرزمین برصغیر میں تقریباً بیالیس تابعین کی تشریف آوری کا ثبوت کتب رجال سے ملتا ہے، لیکن ہم نے تذکرہ اکتالیس تابعین کا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بابرکت فہرست کے بہت بڑے رکن اور عظیم قائد محمد بن قاسم کا ذکر ہم ایک الگ اور مستقل باب میں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس رفیع الشان جماعت کے بیالیسویں رکن ہیں جو ایک بہت بڑے کارواں جہاد اور ہزاروں کی تعداد پر مشتمل قافلہ حدیث کے ساتھ اس ملک میں وارد ہوئے اور پھر اس ملک کی دینی اور تہذیبی حالت بالکل بدل گئی اور واقعات ایک نئے قالب میں ڈھل گئے۔ آئیے اب محمد بن قاسم کے کوائف حیات اور ان کی عملی تگ و تاز کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن اختصار کے ساتھ۔۔۔ اس مرد مجاہد اور کارواں حدیث کے سپہ سالار عالی مرتبت کے تفصیلی حالات ہم نے اپنی ایک کتاب ”برصغیر میں اسلام کے اولیں نقوش“ میں بیان کیے ہیں۔ یہاں وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جو پیش نگاہ کتاب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔

محمد بن قاسم ثقفی طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے اور عراق کے شہر بصرہ کے رہنے والے تھے۔ ۶۵ ہجری کے پس و پیش ان کی ولادت ہوئی۔ وہ صحابہ کرام اور تابعین کا زمانہ تھا جسے اسلامی تاریخ میں خیر القرون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد بن قاسم کا

شمارتا بعین یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عالی مقام شاگردوں میں ہوتا ہے اگرچہ ہمیں تفصیل نہیں ملتی، لیکن قرآن سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے صحابہ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان کے عہد مبارک میں جو صحابہ کرام بصرہ میں اقامت گزریں تھے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گزار خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہے۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بہ اختلاف روایات ۹۱ یا ۹۲ یا ۹۳ ہجری میں بصرہ میں وفات پائی اور بصرہ ہی حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن تھا۔

محمد بن قاسم کو بارگاہِ الہی سے جن اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ گونا گوں سے نوازا گیا تھا، وہ تھے صالحیت، تقویٰ شکاری، علم و عرفان، بہادری، کشور کشائی، فنونِ حرب میں مہارت اور جنگی صلاحیتوں سے بہ درجہ کمال آگاہی۔ ان صفات سے ابتداءً عمر ہی میں اللہ نے ان کو بہرہ مند فرما دیا تھا۔

### بنو ثقیف کی خدمت اسلام

عراق کا گورنر اس زمانے میں حجاج بن یوسف تھا، اس کا تعلق بھی طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تھا اور جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتوں میں مبتلا کیا تھا، ان میں طائف کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے نبی ﷺ وہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے جس کی وجہ سے آپ کے جسم سے خون بہنے لگا تھا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ ان لوگوں کا ذہن یکسر بدل گیا اور انھوں نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی، جہاد کی صورت میں بھی، تبلیغ کی صورت میں بھی اور تدریس قرآن و حدیث کی صورت میں بھی۔۔۔!

سب سے پہلے عہدِ فاروقی میں جو صحابہ کرام بحری بیڑے کے ذریعے ۱۵ ہجری میں وارد ہند ہوئے تھے وہ قبیلہ بنو ثقیف کے معزز ارکان تھے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا، وہ تین بھائی تھے، حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی، حکم بن ابوالعاص ثقفی اور مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہم۔ یہ وہ صحابہ کرام تھے جن کی قیادت میں اہل حدیث کا اولیس

قدم رکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ صحابہ پر مشتمل تھا۔ اس مقدس گروہ نے ۱۵ ہجری میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قارہ ہند کا رخ کیا تھا اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں اس سرزمین کے بہت سے حصوں کو پامال کر ڈالا تھا۔ جن علاقوں کو انھوں نے فتح کیا، ان میں حسب حال امارتیں قائم کرتے گئے تاکہ مفتوحہ مقامات باقاعدہ طور سے نظم و نسق کی سلک میں منسلک ہوتے جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ خیر القرون تھا اور اس دور کے لوگ یعنی صحابہ و تابعین اور تبع تابعین جہاں جاتے، قرآن و سنت کے احکام ان کے ساتھ جاتے تھے۔ سندھ اور ہند کے علاقوں میں بھی یہ ذخیرہ ان کے ساتھ رہا اور وہ لوگوں کو اس کی تبلیغ فرماتے رہے۔ انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور درس و تدریس کے حلقے قائم کیے۔ درس و تدریس کے وہ حلقے موجودہ حلقوں کی طرح صرف و نحو اور فقہ و اصول کی کتابوں ہدایہ شرح و قایہ اور نور الانوار وغیرہ کی تدریس کے حلقے نہ تھے بلکہ خالص قرآن و حدیث کی تعلیم کے حلقے تھے۔

### محمد بن قاسم کے حملے کا پس منظر

۶۵ھ میں جب کہ اموی خلیفہ مروان بن حکم کا آخری زمانہ تھا، عمان کے قبیلے بنو سامہ کے دو شخص جو کہ حقیقی بھائی تھے علاقہ سندھ کے اس حصے پر پوری طرح غالب اور قابض ہو گئے تھے، جسے مسلمان کچھ عرصہ پہلے فتح کر چکے تھے۔ یہ تھے معاویہ بن حارث علانی اور محمد بن حارث علانی۔۔۔ انھوں نے مرکزی حکومت سے بغاوت کی راہ اختیار کر لی تھی اور مرکز کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ۶۵ھ سے ۷۹ھ تک تقریباً چودہ سال یہی صورت حال رہی۔ علانی برادران کی بغاوت کا آغاز مروان بن حکم کے دور خلافت میں ہوا تھا۔ انہی دنوں مروان کا انتقال ہو گیا تو عبد الملک بن مروان تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کے دور میں بھی کافی عرصہ معاویہ بن حارث علانی اور محمد بن حارث علانی کا مرکزی حکومت سے انکار و بغاوت کا سلسلہ جاری رہا۔

حجاج بن یوسف عراق اور مشرقی ممالک کا گورنر تھا۔ اس حیثیت سے سندھ اور ہند

کے معاملات اس کے سپرد تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی جری و شجاع اور فہیم و دانا حاکموں کو سندھ کے مفتوحہ علاقوں کے انتظامی امور کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے بھیجا، مگر حالات درست نہ ہوئے اور متعدد دلائق اور قابل ترس آدمی قتل کر دیے گئے۔

علانیٰ برادران اور ان کے ہم نواؤں کو درحقیقت راجاداہر کی امداد حاصل تھی۔ اسی کی اعانت اور پشت پناہی کی بنا پر وہ سندھ کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور مرکز کی نافرمانی کر رہے تھے۔

حجاج بن یوسف نے راجاداہر کو بار بار خطوط لکھے اور کئی پیغام بھیجے کہ وہ ان باغیوں کی مدد نہ کرے، مگر وہ اس سے باز نہ آیا اور مرکزی حکومت سے بغاوت کرنے والوں کی برابر مدد کرتا رہا۔ راجاداہر کے اس طرزِ عمل سے حجاج بن یوسف کو سخت صدمہ پہنچا۔

### ایک اور فتنہ

علافیوں کا زور تو حجاج بن یوسف کی کوششوں سے ٹوٹ گیا، لیکن اس کے فوراً بعد برصغیر کے اسلامی مقبوضات میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ ۸۰ھ میں والی عراق حجاج بن یوسف نے عبدالرحمن بن محمد بن اشعث کو بھتان کا امیر مقرر کیا، جس نے بڑی فتوحات حاصل کیں اور اس نواح کے حکمرانوں کو ہر میدان میں شکست دی۔ اس کی فتوحات کا دائرہ برصغیر کے بعض مقامات تک پھیلتا چلا گیا۔ ۸۱ھ میں عبدالرحمن نے عراق کے معلمین و قراءے کرام کی ایک بڑی جماعت کو اپنے ساتھ بلایا۔ ان لوگوں نے پہلے حجاج بن یوسف کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، پھر خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مخالفت میں علمِ جہاد لہرایا۔ مخالفین کی فوج کے بہت سے لوگ بھتان، مکران اور سندھ کے غیر مسلم حکمرانوں کی پناہ میں آ گئے تھے اور ان کی انگلیخت پر مرکزی حکومت کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ ۸۰ھ سے ۸۵ھ تک پانچ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بن یوسف کو اس کا شدید قلق تھا اور سندھ کے راجوں مہاراجوں نے جو روش اختیار کر لی تھی، وہ حجاج کے مزاج و فطرت کے قطعی خلاف تھی، جس کا اسے انتہائی رنج تھا۔

کارواں قارۃ الہند میں وارد ہوا تھا۔

محمد بن قاسم بھی اسی قبیلے کے رکن رکین تھے۔ حجاج بن یوسف بھی اسی قبیلے کا فرد تھا جو بنو امیہ کے زمانے میں عراق کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے ہندوستان سمیت متعدد ملکوں اور علاقوں میں فوجیں بھیجیں اور انھیں فتح کیا اور ان میں اسلام پھیلایا۔

محمد بن قاسم بنو امیہ کی فوج میں

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا محمد بن قاسم ابتداے عمر ہی میں فوجی اصول و قواعد سے باخبر ہو گئے تھے۔ اس دور میں فارس کے مختلف علاقوں میں کردوں نے مسلمانوں کے خلاف شدید ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ ۸۳ ہجری میں جب کہ محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ اٹھارہ برس کی تھی حجاج بن یوسف نے ان کو فارس کی مہم پر روانہ کیا اور کردوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ انھوں نے نہایت سرگرمی، انتہائی بہادری اور جنگی حکمت عملی سے یہ خدمت انجام دی اور کرد قبائل کی ہنگامہ آرائیاں ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

سندھ کی طرف روانگی

اس سے دس سال بعد عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کی جانب سے ۹۳ ہجری میں فارس ہی سے انھیں سندھ کی طرف روانہ ہونے اور اس علاقے پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم ملا۔ عراق کی گورنری کے علاوہ اسلامی قلمرو کے تمام مشرقی ملکوں کی نگرانی حجاج بن یوسف کے سپرد تھی اور ان علاقوں میں فوجی کارروائی کا ذمہ دار وہی تھا اور اسی کے حکم سے اس نواح میں عساکر اسلامی حرکت میں آتے تھے۔ اب اس کے حکم سے محمد بن قاسم نے سندھ کا رخ کیا۔

گزشتہ صفحات میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے ابتدائی دور ہی میں برصغیر پاک و ہند کے بہت سے لوگ اسلام سے آشنا ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت نے ان کو اپنے دائرہ اثر میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اسلام کا اولیس کارواں جس کا جہاز بحر ہند کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور جس نے سب سے پہلے برصغیر کی دہلیز پر

### راجا داہر کے آدمیوں کا کشتیوں پر حملہ

اسی زمانے میں ایک اور حادثہ رونما ہوا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کچھ عرصے سے عرب کے چند مسلمان خاندان تجارت کے سلسلے میں سرندیپ (سیلون) میں فروکش تھے۔ ان کے آباد اجداد و فاط پائے گئے تو سرندیپ کے غیر مسلم حکمران نے ان کی عورتوں اور بچوں کو اپنی خاص کشتیوں کے ذریعے واپس عرب بھیجنے کا انتظام کیا۔ ان کا مال و اسباب بھی کشتیوں میں لا دیا گیا تھا۔

سرندیپ کے راجا نے نہایت اکرام و اعزاز کے ساتھ اپنے قابل اعتماد اور خاص درباری آدمیوں کی نگرانی میں ان لوگوں کو روانہ کیا تھا۔ اس سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ سرندیپ پر حملہ کر دیں اور اس کی حکمرانی ختم ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ عین ممکن ہے ان یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے واپس نہ بھیجنے کی بنا پر مسلمان خلیفہ اس کے ملک میں فوجی کارروائی کرے۔ اس نے حجاج بن یوسف اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے لیے قیمتی ہدایا و تحائف بھی ان کشتیوں میں بھیجے تھے۔

یہ کشتیاں سرندیپ سے روانہ ہو کر ساحل سمندر کے قریب قریب سفر کرتی ہوئی خلیج فارس کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ وہاں یہ لوگ خشکی پر اتریں گے اور پھر حاکم سرندیپ کے تحائف سمیت حجاج کی خدمت میں کوئے پہنچ جائیں گے۔ لیکن راستے میں بادِ مخالف کے طوفان نے ان کشتیوں کو دھکیل کر سندھ کی بندرگاہ دہل میں لا ڈالا۔ ان کو دیکھتے ہی وہاں بحری ڈاکو اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر آگئے اور ان کو گھیر لیا۔ حملہ کر کے عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا، ان کا سامان لوٹ لیا اور خلیفہ عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف کی طرف جو تحائف بھیجے گئے تھے وہ ان سے چھین لیے۔

جہاز میں عرب کے قبیلے بنی ربیع کی ایک عورت بھی سوار تھی۔ جب جہاز کو لوٹا اور عورتوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا اس عورت نے نہایت دردناک آواز میں حجاج بن یوسف کی دہائی دی اور پکارا ”یا حجاجاہ!“

(اے حجاج! تو کہاں ہے ہماری مدد کو آ۔۔)

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حجاج کو کسی نے اس پکار کے بارے میں بتایا تو اس نے جواب دیا:  
”لبیک“!

میں اپنی ان تمام فکری و عملی توانائیوں اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہیں، حاضر ہوں۔

یہ حادثہ راجا داہر کے علاقے میں ہوا تھا اور جن بحری قزاقوں نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا اور لوٹا تھا، وہ داہر کی رعیت تھے۔ جب یہ خبر عراق پہنچی اور اس کی تفصیل حجاج بن یوسف کے علم میں آئی تو وہ سخت پریشان ہوا اور راجا داہر کو پیغام بھیجا کہ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، انھیں سزا دی جائے۔ راجا نے حجاج کے پیغام پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہ میں ان کو گرفتار کر سکتا ہوں نہ کوئی سزا دے سکتا ہوں۔

حجاج ایک ملک کے با اختیار حکمران کی طرف سے اس قسم کے جواب کی توقع نہ رکھتا تھا۔ وہ یہ جواب سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ یہ عبدالملک بن مروان کا دور حکومت تھا۔ حجاج نے دربار خلافت سے داہر پر براہ راست حملے کی اجازت طلب کی، مگر بعض مصالح کی بنا پر اجازت نہ ملی۔ پھر حجاج نے ڈاکوؤں اور حملہ آوروں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لیے ایک مہم روانہ کی، جو کامیاب نہ ہو سکی۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا، ڈاکوؤں کو ختم کرنے یا ان کی گوشمالی کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناکام رہیں اور ہر مرتبہ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے بعد اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے اس کی نظر محمد بن قاسم پر پڑی جو اس وقت فارس کے علاقے میں مصروف کار تھے۔

یہ تھے وہ اسباب جنھیں محمد بن قاسم کے سندھ پر فیصلہ کن حملے کا پس منظر کہنا چاہیے۔ محمد بن قاسم کے بارے میں یہاں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔  
۱۔ مشہور ہے کہ محمد بن قاسم رشتے میں حجاج بن یوسف کے حقیقی بھتیجے تھے۔ یہ صحیح نہیں، وہ حقیقی بھتیجے نہ تھے، رشتہ داری میں بھتیجے ہوں گے۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ حجاج کی بیٹی زینب سے محمد بن قاسم کی شادی ہوئی تھی۔ روایات سے یہ بات بھی پایہ صحت کو نہیں پہنچتی۔

۳۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ محمد بن قاسم نے جب ہند اور سندھ کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کی، اس وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ سال تھی، یہ قطعاً غلط ہے۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں، یا قوت حموی نے معجم البلدان میں، بلاذری نے فتوح البلدان میں اور دیگر مستند مورخین نے لکھا ہے کہ ۸۳ھ میں فارس اور شیراز کی ولایت محمد بن قاسم کے سپرد کی گئی اور انھوں نے کردوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔۔۔ فتح سندھ و ہند کا واقعہ اس سے دس سال بعد ۹۳ھ میں رونما ہوا۔ اگر ۹۳ھ میں ان کی عمر سترہ سال مان لی جائے تو ۸۳ھ میں جب انھوں نے فارس کے علاقے کی زمام ولایت ہاتھ میں لی اور کردوں سے برسرِ پیکار ہوئے، ان کی عمر صرف سات سال تھی، اور یہ قطعی طور سے غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب وہ ولایت فارس کے لیے روانہ ہوئے، اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ بعض شعرا نے ان کی بہادری اور شجاعت سے متاثر ہو کر ان کے محاسن و مفاخر بیان کیے تو کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ حملہ سندھ و ہند کے وقت وہ سترہ سال کے تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس وقت وہ ستائیس اٹھائیس برس کے تھے۔

۴۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے چند سوفوجیوں کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا تھا۔ اس میں بھی کوئی صداقت نہیں۔ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سندھ پر حملے کے وقت ان کی بری اور بحری فوج کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ چند سو آدمیوں کے ساتھ اتنے دور دراز علاقے پر حملہ کرنے کا کوئی حکومت یا فوج تصور بھی نہیں کر سکتی۔

### بری اور بحری فوج

سندھ پر حملہ کرنے کے لیے بری فوج کے علاوہ بحری فوج بھی روانہ کی گئی تھی، جس کا بحری بیڑا بہت مضبوط تھا۔ اس کا انتظام بحری معاملات کے ماہرین کے سپرد کیا گیا تھا جو



اس کی نقل و حرکت کے تمام پہلوؤں کی نگرانی کرتے تھے۔ محمد بن قاسم نے جب فارس سے سندھ کی طرف یلغار کی تو بہت بڑی فوج ان کی کمان میں تھی، اس کے علاوہ چھ ہزار نفوس پر مشتمل شامی سپاہ ان کے ہم رکاب تھی، اور بھی بہت سے رضا کار اور سپاہی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ اس ضمن میں بلاذری کے الفاظ لائق تذکرہ ہیں۔

وَضَمَّ سِتَّةَ آلَافٍ مِنْ جُنْدِ أَهْلِ الشَّامِ وَخُلُقًا مِنْ غَيْرِهِمْ. (۱)

یعنی فارس کی فوج کے علاوہ شام کے چھ ہزار فوجیوں کو محمد بن قاسم کی کمان میں روانہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے لوگ ان کے لشکر میں شامل کیے گئے۔

تمام جنگی ساز و سامان انھوں نے قیام شیراز کے زمانے میں تیار کیا۔ چھوٹی بڑی چیزوں کو جمع کرنے، فوج کو تربیت دینے اور برصغیر کے حالات و کوائف سے اچھی طرح مطلع ہونے کی غرض سے وہ چھ مہینے شیراز میں مقیم رہے۔ اس کے بعد مکران کی طرف روانہ ہوئے اور کئیر کے مقام پر پہنچے جو حد مکران سے پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ کئیر سے مکران کے مرکزی شہر فنز پور کا عزم کیا۔ دو دن میں اس شہر میں آئے اور اس پر علم فتح لہرایا۔ وہاں سے چل کر چار دن میں ارمائیل کے مقام پر آئے اور اسے فتح کیا۔ مکران کا جو حصہ اس سے چند سال پہلے فتح ہو چکا تھا، اس کے امیر محمد بن ہارون نمیری تھے وہ بھی اپنی فوج اور ساتھیوں سمیت محمد بن قاسم کے ہم رکاب ہو گئے، مگر راستے ہی میں محمد بن ہارون کا انتقال ہو گیا اور انھیں قتل کے مقام میں دفن کر دیا گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ارمائیل کو ارمئیل بھی کہا جاتا ہے جو مکران اور دبیل کے وسط میں سمندر سے تھوڑی دور واقع تھا۔ اب اسے ارمن بیلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور قلات ڈویژن میں ضلع لس بیلہ کا صدر مقام ہے، کراچی سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔

فنز پور اور ارمائیل کے شہر محمد بن قاسم نے اچھی خاصی جنگ کے بعد فتح کیے اور فتح کے بعد کئی مہینے وہاں مقیم رہے۔ ان علاقوں میں اپنے امیر اور والی مقرر کیے اور ان کے

انتظامات کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لیے ان کے نام احکام جاری کیے۔

اب محمد بن قاسم نے عساکر اسلامی کو دیہیل کی طرف حرکت کرنے کا حکم دیا جو ارمائیل سے چار دن کی مسافت پر اس زمانے کا بہت بڑا شہر تھا اور ساحل ہند پر واقع تھا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں سے بحری ڈاکوؤں نے ان کشتیوں کو لوٹا تھا، جن پر سرندیپ کے راجا نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو سوار کر کے عراق کی طرف روانہ کیا تھا۔ محمد بن قاسم نے ۹۳ھ کو رمضان کے مہینے میں جمعہ المبارک کے دن اس شہر کی حدود میں قدم رکھے۔ اس وقت بہت بڑا لشکر ان کے ساتھ تھا جس کے ایک حصے کی قیادت ابوالاسود جہم بن ارحم بنی کر رہے تھے جو فارس کی جنگوں میں شان دار خدمات سر انجام دے چکے تھے اور محمد بن قاسم ان کے جنگی کارناموں سے بہت متاثر تھے ہزاروں افراد پر مشتمل بری فوج کے علاوہ تربیت یافتہ بحری بیڑا بھی ساتھ تھا جس میں فوج، سامان جنگ، بہترین اسلحہ، رسد اور بہت سی ضروری چیزیں موجود تھیں۔ اس وقت محمد بن قاسم اٹھائیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور وہ تجربہ کار جرنیل، بہادر جنگ جو اور صاحبِ تدبیر سپہ سالار اور امیر تھے۔

یہ اہل حدیث کا تیسرا کارواں تھا جو محمد بن قاسم کی قیادت میں آیا اور اس نے سندھ و ہند کا بہت سا علاقہ فتح کر کے وہاں قال اللہ و قال الرسول کی صداائیں بلند کیں۔



## چوتھا باب

## برصغیر میں اہل حدیث کا چوتھا کارواں

## تابع تابعین

اب تک اہل حدیث کے وہ تین کارواں ہماری نظروں سے گزر چکے ہیں جو یکے بعد دیگرے خیر القرون میں برصغیر میں تشریف لائے اور انھوں نے یہاں خالص کتاب و سنت کی تبلیغ کی۔ اب اس عہدِ بابرکت کا چوتھا کارواں ہمارے سامنے ہے جو اٹھارہ تابع تابعین پر مشتمل ہے۔ یہ بزرگانِ بلند مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے شاگردوں (یعنی تابعین) کے فیض یافتہ ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کی حیات مبارکہ کے ان واقعات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں جن کا ہمارے موضوع سے تعلق ہے۔

## ۱۔ اسرائیل بن موسیٰ بصریؒ:

ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری وہ تابع تابعی تھے جو دراصل باشندے تو بصرہ کے تھے مگر ہند میں اقامت گزیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے حسن بصریؒ ابو حازم اشجعیؒ محمد بن سیرین اور وہب بن منہب سے روایتِ حدیث کی جن کا شمار جلیل القدر تابعین کی جماعت میں ہوتا تھا۔ خود اسرائیل بن موسیٰ بصری سے سفیان ثوریؒ ابن عیینہؒ یحییٰ بن سعید قطان اور دیگر حضرات کرام نے حدیث پڑھی۔

ابن حبان نے ان کو ثقہ راویانِ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے۔

كان يسافر الى الهند.

ہندوستان میں آمد و رفت رکھتے تھے۔

صحیح بخاری میں ان کے سلسلہٴ سند کی ایک حدیث چار مقامات پر درج ہے:

ولہ فی صحیح البخاری فرد حدیث مکرر فی اربعة مواضع.  
ابوحاتم اور یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔

اسرائیل صاحب النحسن ثقة

یعنی امام حسن بصری کے شاگرد اسرائیل بن موسیٰ ثقہ راوی ہیں۔

ابوحاتم ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ لا باس بہ.

امام نسائی کا فرمان ہے۔ لیس بہ بأس

سمعی نے الانساب میں ان کے انتساب ہند کے متعلق لکھا ہے۔

ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ الہندی بصری کان یزول الہند  
فنسب الیہا.

یعنی ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ ہندی دراصل بصرہ کے باشندے تھے۔ چون کہ

ہندوستان میں ان کا آنا جانا تھا لہذا ہند کی طرف منسوب کیے گئے۔<sup>(۱)</sup>

## ۲۔ کرز بن ابو کرز عبدی:

کرز اصلاً کوفے کے رہنے والے تھے، لیکن وہاں سے ایران کے شہر جرجان چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ محمد بن فضیل اپنے باپ (فضیل) سے بیان کرتے ہیں کہ وہ (یعنی فضیل) کرز سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے، وہ ٹاٹ کے مصلے پر کھیل اوڑھے بیٹھے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔

شبرمہ کہتے ہیں ایک مرتبہ کرز حارثی کے ساتھ ہم سفر کر رہے تھے اور بصرے جا رہے تھے۔ راستے میں جہاں کوئی ایسا قطعہ زمین آتا جو کرز کی نگاہوں میں خوب صورت معلوم ہوتا، وہاں وہ نماز پڑھنا شروع کر دیتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگلے سفر پر روانہ ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کرز حارثی مستجاب الدعوات تھے جو چیز اللہ سے مانگتے مل جاتی۔ انھوں نے اللہ سے یہ دعا بھی مانگی کہ انھیں اتنی ہمت اور طاقت عطا فرمادی جائے کہ وہ قرآن مجید پڑھنے میں مشغول رہیں۔

۱۔ الانساب سمعی، ورق ۵۹۳ زیر لفظ الہندی۔۔۔ تہذیب المعجم، ج ۱ ص ۲۶۱۔۔۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۲۳۔

خلف بن تمیم کہتے ہیں ایک مرتبہ کرز حارثی ہمارے ہاں کوفہ میں آئے۔ قراء کوفہ کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں بھی ان کی اقامت گاہ پر گیا۔ کافی دیر ہم لوگ حاضر خدمت رہے۔ اس اثنا میں میں نے ان کی زبان سے صرف دو باتیں سنیں۔ ایک یہ کہ:

صلوا علی نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم، فان صلاحکم تعرض علیہ۔

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا کرو۔ تمہارا درود بارگاہ پیغمبر میں پیش کیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ تھی۔

اللهم اختتم لنا بخیر۔

(اے اللہ ہماری عاقبت بہتر فرما دے۔)

کرز حارثی تبع تابعین کی جماعت کے جلیل القدر رکن تھے۔ انھوں نے نعیم بن ابی ہند اور ربیعہ بن زیاد سے حدیث روایت کی اور کرز سے سفیان ثوری، ابن شبرمہ، فضیل بن غزوان، ورقان عمر اور عبید اللہ وصافی نے درس حدیث لیا۔

حافظ ذہبی ان کو تابعی اور حافظ ابن حجر تبع تابعی قرار دیتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ روایان حدیث میں گردانا ہے اور کہا ہے کہ یہ نہایت عبادت گزار محدث تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت (۳۵ھ) میں جو فوج قلات کی طرف روانہ کی گئی، کرز حارثی اس میں شامل تھے۔ اس جنگ میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیابی کے بعد واپس گئے تو حضرت معاویہ نے ان کو دوبارہ قلات بھیج دیا تھا۔<sup>(۱)</sup> حضرت کز رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتب رجال میں مذکور ہیں۔

۳۔ معلیٰ بن راشد بصری:

معلیٰ بن راشد بنال ہذلی بصری کی کنیت ابوالیمان تھی۔ یہ تبع تابعین کی عالی مرتبت جماعت کے وہ مرد مجاہد تھے جنھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت

۱۔ تاریخ الکبیر ج ۲ ص ۲۲۸۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۳۰۲۔۔۔ حمرة انساب العرب ص ۲۹۵۔۔۔ الجرح والتعديل ج ۳ ص ۱۷۰۔۔۔ جذب المعجزہ ج ۱ ص ۱۱۱۔ عقد الثمین ص ۱۰۳ تا ۱۰۵۔

میں ۵۰ ہجری کو قلابت کی جنگ میں حصہ لیا۔

خلیفہ بن خیاط نے ۵۰ ہجری کے واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں معلیٰ بن راشد کے متعلق جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہم سنان کی کمان میں قلات کے محاذ جنگ پر آئے تو ہم نے دیکھا کہ سامنے دشمن کی بہت بڑی فوج کھڑی ہے۔ سنان نے یہ صورت حال دیکھ کر ہم سے کہا، تم خوش رہو، تمہیں دو چیزوں میں سے ایک چیز ملنے والی ہے۔ جنت یا مال غنیمت۔۔۔! پھر سنان نے سات پتھر اٹھائے اور فوج کو روک لیا۔ کہا جب تم دیکھو کہ میں نے حملہ کر دیا ہے تو تم بھی حملہ کر دو۔۔۔ پھر جب آفتاب آسمان کی تہہ سے باہر آیا تو سنان نے دشمن کی طرف ایک پتھر پھینکا اور اللہ اکبر کہا۔ پھر ایک ایک پتھر پھینکتے گئے یہاں تک کہ ساتواں پتھر باقی رہ گیا۔۔۔ جب آفتاب ڈھل گیا تو ساتواں پتھر پھینکا اور کہا ”حم لا یصرون“ پھر فوراً اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور دشمن پر حملہ کر دیا، ہم نے بھی حملہ کر دیا۔ دشمن کی فوج نے اپنے کندھے ہم کو دے دیے یعنی ہمارے آگے بھاگ کھڑی ہوئی اور ہم چار فرسخ تک اس کو قتل کرتے گئے۔ اس طرح دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم ایک قلعہ بند فوج کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے ہم سے کہا، خدا کی قسم تم وہ لوگ نہیں ہو جنہوں نے ہمارے ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ ہمیں قتل کرنے والوں میں سے تو ایک آدمی بھی تم میں نظر نہیں آتا۔ وہ تو اہل حق گھوڑوں پر سوار تھے اور سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔ دشمن کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہم نے آپس میں کہا، یہ اللہ کی مدد ہے۔

حافظ ابن حجر تہذیب الہندیہ میں لکھتے ہیں کہ معلیٰ نے اپنی دادی ام عاصم کے علاوہ میمون بن سیاہ، حسن بصری اور زیاد بن میمون ثقفی سے روایت کی۔ خود معلیٰ نے بھی مسند حدیث آراستہ کی۔ ان سے یزید بن ہارون، عبد اللہ بن صالح، عجل، روح بن عبد المؤمن، ابو بشر بن بکر بن خلف اور نصر بن علی جہضمی وغیرہ محدثین نے سماع حدیث کا

شرف حاصل کیا۔

ابن حبان نے معلیٰ کو ثقہ روایان حدیث میں گردانا ہے اور امام نسائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ لیس بہ باس۔

## ۴۔ جنید بن عمرو والحدوانی المکی:

اہل مکہ کے ممتاز و مشہور قاری تھے۔ ثقہ اور کثیر الحدیث راوی تھے۔ آل زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، انھوں نے حمید بن قیس سے روایت کی اور خود ان سے محمد بن عبداللہ بن قاسم نے درس حدیث لیا۔

جنید بن عمرو وہ تبع تابعی تھے جو فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم کے ساتھ وارد برصغیر ہوئے۔ محمد بن قاسم ساو ندرنی کے مقام پر پہنچے تو ہر اور میں قیام کیا۔ ہر اور سے جنید بن عمرو کو فوج کے ایک دستے کا کمان دار بنا کر مخالفین اسلام کے خلاف جہاد کے لیے بھروسہ و جہاد کیا۔<sup>(۱)</sup>

## ۵۔ محمد بن زید عبدی:

(ایک روایت کے مطابق زیاد) عبدی فتح سندھ کے زمانے میں محمد بن قاسم کے امرا و معاونین میں سے تھے۔ انھوں نے ابوشریح، سعد بن جبیر، ابراہیم نخعی اور ابوالاعین سے روایت حدیث کی۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ محمد بن زید نہیں، بلکہ محمد بن زیاد ہیں۔<sup>(۲)</sup>

## ۶۔ محمد بن غزوان کلبی:

عرب کے قبیلہ بنو کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ممتاز محدث امام اوزاعی سے روایت حدیث کی۔ ابو زرعہ انھیں منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ عمر بن محمد عن سالم عن ابیہ کی سند

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۸۶۔۔۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۴۱۔۔۔ معارف ابن قتیہ ص ۲۳۱۔۔۔ الجرح

والتعذیل ج ۱ ص ۱۲۸۔۔۔ رجال السند والہند ص ۳۷۳۔

۲۔ کتاب الجرح والتعذیل ج ۳ ص ۲۵۶۔۔۔ لسان المیزان ج ۶ ص ۶۹۰۔۔۔ رجال السند والہند ص ۳۹۱۔

سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

عن الاوزاعی عن یحییٰ عن ابی سلمة عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ  
کی سند سے دریا کے پانی کے بارے میں مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

هو الطهور ماءه والحل میتہ۔<sup>(۱)</sup>

یعنی دریا کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

ابن عساکر بیان کرتے ہیں کہ محمد بن غرآن نے دریا کے پانی کے بارے میں  
اوزاعی سے جو حدیث روایت کی ہے وہ منکر ہے۔

علامہ طبری نے تاریخ طبری میں ۱۲۶ ہجری کے واقعات میں محمد بن غرآن کا ذکر کیا  
ہے کہ جب محمد بن قاسم کا بیٹا عمر بن محمد سندھ کا والی تھا اس زمانے میں محمد بن غرآن بھی  
یہیں تھے ان پر بہت بڑی رقم کا الزام عائد کیا گیا تھا جو یہ قسط وار ادا کرتے تھے۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ خود محمد بن غرآن کو سندھ کا والی مقرر کر دیا گیا۔ انھوں  
نے عمر بن محمد کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا تھا۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے جس کے ذکر کی یہاں  
ضرورت نہیں۔<sup>(۲)</sup>

۷۔ ابو عیینہ ازدیؓ:

ابو عیینہ بن محمد بن ابو عیینہ بن مہذب بن ابوصفرہ ازدی۔ انھوں نے اعمش سے  
حدیث روایت کی ہے۔ ان کے بیٹے کا نام محمد بن ابو عیینہ تھا جنھوں نے اپنے باپ  
(ابو عیینہ) سے علم حدیث پڑھا۔

اولادِ مہلب میں سے تیرہ آدمی تھے جو سندھ میں قیام پذیر تھے ان میں ایک ابو عیینہ  
تھے جو تبع تابعی تھے۔ ان تیرہ آدمیوں کو قنڈائیل سے پکڑا گیا اور قیدی کی حیثیت سے  
اموی خلیفہ یزید بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر اس کے حکم سے ان کو قتل کر دیا  
گیا تھا۔<sup>(۳)</sup>

۱۔ ترمذی، ابوداؤد و نسائی

۲۔ تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۷۲۔۔۔ لسان المیزان ج ۵ ص ۳۳۸۔۔۔ رجال السند والہند ص ۴۹۹

۳۔ لسان المیزان ج ۵ ص ۳۷۲۔۔۔ رجال السند والہند ص ۵۵۷



مہلب کی بیٹی ہند نے یزید بن عبد الملک سے اپنے بھائی ابو عیینہ کے لیے جان بخشی کی درخواست کی تھی جو منظور کر لی گئی تھی اور ابو عیینہ کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔

## ۸۔ سند بن شماس السمان بصریؒ:

ان کا ذکر امام بخاری نے اپنی کتاب التاريخ الکبیر میں کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں 'سند بن شماس' بصرہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے عطاء بن رباح اور محمد بن سیرین سے حدیث روایت کی اور خود سند بن موسیٰ بن اسماعیل اور موثرہ بن الاشتر نے روایت کی۔ سند بن شماس السمان وہ تبع تابعی تھے جن کا تعلق سندھ سے تھا اور پھر بصرے چلے گئے تھے۔<sup>(۱)</sup>

شاید لوگ ان کا اصلی نام بھول گئے ہوں گے اور باپ کا نام ذہنوں میں محفوظ رہ گیا ہوگا، اس لیے اسی اعتبار سے اپنے حلقہ تعارف میں یہ سند بن مشہور ہو گئے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے ملک میں چلا جائے تو اپنے پہلے اور آبائی وطن کی نسبت سے شہرت حاصل کر لیتا ہے مثلاً ترک ہے تو ترکی، عرب سے تعلق رکھتا ہے تو عرب ہندوستان کا رہنے والا ہے تو ہندی، آبائی علاقہ تبت ہے تو تبتی، کشمیر ہے تو کشمیری وغیرہ کی وطنی نسبت ہی اس کا اصل نام قرار پا جاتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں سند بن کسی اور وجہ سے کہا جاتا ہو۔

## ۹۔ عبد الرحیم دیلمی سندھیؒ:

یہ دراصل عرب کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے آباؤ اجداد میں سے بنو ثقیف کے کوئی بزرگ حملہ سندھ کے زمانے میں فوجی کی حیثیت سے محمد بن قاسم کے ساتھ وارد سندھ ہوئے اور دیلمی شہر فتح ہوا تو وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ دیلمی ہی میں عبد الرحیم کی ولادت ہوئی۔ بنو ثقیف کے فرد ہونے کی وجہ سے انھیں ثقفی اور دیلمی اور سندھ سے تعلق کی بنا پر دیلمی سندھی کہا جانے لگا۔ حافظ ابن حجر لسان المیزان

۱۔ التاريخ الکبیر ج ۲ ص ۱۱۷۔۔ کتاب المرح والترحیل ج ۲ ص ۲۱۸۔۔ العقد الثمین ص ۲۲۲۔

میں لکھتے ہیں:

قال العقيلي قال جدی قدم علينا من السند شيخ كبير كان يحدث عن الاعمش.

یعنی عقیلی کہتے ہیں، میرے دادا نے بیان کیا کہ ہمارے ہاں (بصرہ میں) سندھ سے ایک بہت بڑے شیخ آئے جو اعمش سے روایت حدیث کرتے تھے۔ ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں علم حدیث کی تعلیم کے سلسلے میں سندھ کا علاقہ بہت زرخیز علاقہ تھا، جہاں سے حصول علم کے بعد عبدالرحیم بصرے گئے اور وہاں کی مجالس محدثین میں ”شیخ کبیر“ کہلائے۔

عبدالرحیم دہلی علاقہ سندھ کے ائمہ حدیث میں سے تھے اور تبع تابعی تھے۔ ابن حبان، بیہقی اور عقیلی وغیرہ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔<sup>(۱)</sup>

#### ۱۰۔ عبدالرحمن بن عمر و اوزاعیؒ:

یہ ابو عمر و عبدالرحمن بن عمرو بن محمد دمشقی ہیں جو حافظ الحدیث تھے اور علم حدیث میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ یہ محدث کبیر امام اوزاعی کی نسبت سے مشہور ہیں جو ۸۸ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کا مقام ولادت بعلبک ہے۔ بچپن میں والد وفات پا گئے تھے، حالت یتیمی میں ماں کی گود میں پرورش پائی اور فقر و فاقے کی حالت میں شعور کی منزل کو پہنچے۔ عطاء بن رباح، زہری اور دیگر بہت سے محدثین سے روایت حدیث کی۔ محمد بن سیرین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بستر مرض پر دراز تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان سے سماع حدیث کیا۔

حصول علم حدیث کے بعد خود امام اوزاعی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ ان سے حضرت عبداللہ بن مبارک، شعبہ بن سعید القطان، ولید بن مسلم، یحییٰ بن سعید القطان اور خلق کثیر نے علم حدیث پڑھا۔

۱۔ لسان المیزان ج ۳ ص ۴۱۰۔۔۔ تاریخ بغداد ج ۸ ص ۸۱۵۔۔۔ المعجم الثمینی فی فوج الہندومن ورد فیہما من الصحابۃ والاتباعین ص ۲۳

امام اوزاعی عمر کے آخری دور میں بیروت تشریف لے گئے تھے، پھر وہیں فوت ہوئے۔ انھیں ”امام الہند والشام“ کہا جاتا ہے۔

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ کان من سببی السند۔

یعنی اوزاعی کا شمار اسیران سندھ میں ہوتا ہے۔

ان کے واقعات تاریخ در جال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اس عظیم محدث و فقیہ کا تعلق برصغیر کے

علاقے سندھ سے تھا۔ (۱)

انھیں ”اوزاعی“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب یہ علاقہ سندھ سے ملک شام میں گئے تو دمشق کے قریب ایک گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے جس کا نام ”اوزاع“ تھا اس بنا پر انھیں اوزاعی کہا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل نام عبدالعزیز تھا بعد میں خود ہی اپنا نام عبدالرحمن رکھا اور اسی نام سے شہرت پائی۔

اس عظیم المرتبت محدث و فقیہ نے باختلاف روایات ۲۔ صفر ۱۵۷ھ یا ۱۵۸ھ ہجری کو کم و بیش بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ موت اس طرح واقع ہوئی کہ بیروت کی ایک سراے میں مقیم تھے کہ اس کے حمام میں گئے پاؤں پھسلا اور گر گئے۔ پھر بے ہوش ہو گئے اور اسی حالت میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

۱۱۔ عبدالرحمن بن السندی:

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں عراق بن خالد بن یزید کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

معلوم ہوتا ہے یہ سندھ سے حصولِ علم کے لیے دمشق گئے تو لوگوں کو ان کے نام کا تو

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۸ تا ۲۳۹۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۲ صفحہ ۳۰۰۔ ۳۱۱۔۔۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱

۱۷۲۵۱۹۸

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۷۱

پتا چل گیا کہ عبدالرحمن ہے مگر عرب چونکہ باپ کا نام بھی بولتے اور لکھتے ہیں اس لیے ان کو جب ان کے باپ کے اصلی نام کا علم نہ ہو سکا تو سندھی ہونے کی بنا پر انھیں عبدالرحمن بن السندی کہا جانے لگا اور لوگوں کی زبانوں پر ان کی نسبت ابوت سندھی قرار پائی۔

## ۱۲۔ عمرو بن عبید بن باب السندی:

ان کی کنیت ابو عثمان تھی اور معتزلی تھے۔ قبیلہ بنو تمیم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت حسن بصری سے بہت سی احادیث روایت کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کے نقطہ نظر سے ایس بشری فی الحدیث۔

عمرو بن عبید سندھی کے دادا (باب) دراصل کابل کے رہنے والے تھے وہاں سے سندھ آئے اور باب السندی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد ازاں یہ خاندان بصرہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔

عمرو بن عبید سندھی نے ۱۴۰ھ یا ۱۴۲ھ میں مکہ اور بصرہ کے راستے میں دوران سفر وفات پائی۔ نماز جنازہ سلیمان بن علی نے پڑھائی اور مران میں دفن کیے گئے۔<sup>(۱)</sup>

## ۱۳۔ فتح بن عبد اللہ سندھی:

ان کی کنیت ابو نصر ہے۔ پہلے آل حسن بن الحکم کے غلام تھے پھر آزاد کر دیے گئے تھے۔ ”الانساب“ میں ایک عجیب و غریب روایت بیان کی گئی ہے۔ اس روایت سے ابو نصر فتح بن عبد اللہ سندھی کی صاف بیانی اور حق گوئی کا پتا چلتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ جو سمعانی نے نقل کیے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

حدثني عبدالله بن الحسين قال كنا يوماً مع ابي نصر السندی  
وفينا كثرة حوالبه ونحن نمشي في الطين فاستقبلنا شريف  
سکران قد وقع في الطين فلما نظر إلينا شمه ابونصر وقال  
نافق يا عبد انا كما ترى وانت تمشي وخلفك هؤلاء فقال له

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۷۳۔۔۔ مردج الذهب ج ۳ ص ۳۱۴۔۔۔ العارف ابن تقيہ ص ۱۱۲۔۔۔

الحداد الثمين ص ۲۲۳۔

ابونصر ایہا الشریف تلری لم ہذا...؟ لانی متبع آثار جدک  
وانت متبع آثار جدی۔<sup>(۱)</sup>

یعنی عبداللہ بن حسین کہتے ہیں کہ ایک دن ہم ابونصر سندھی کے ساتھ دھول  
اور کچڑ سے اٹی ہوئی زمین میں جا رہے تھے اور ان کے بہت سے مداحین و  
متاثرین ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک شہزادہ مدہوشی کی حالت میں زمین  
پر خاک اور کچڑ میں لت پٹ پڑا ہے۔ اس نے ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھا  
تو ابونصر نے منہ قریب کر کے اسے سوگھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی  
تھی۔ شہزادے نے ابونصر سے کہا:

او غلام! میں جس حالت میں پڑا ہوں تم دیکھ رہے ہو لیکن تم ہو کہ اطمینان  
سے چلے جا رہے ہو اور اتنے لوگ تمہارے پیچھے جا رہے ہیں۔ ابونصر نے  
بے باکی سے جواب دیا: شہزادے! تمہیں معلوم ہے اس فرق مراتب کی کیا  
وجہ ہے؟ وجہ یہ ہے کہ میں نے تمہارے آباؤ اجداد کی پیروی شروع کر دی  
ہے اور تم میرے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل پڑے ہو۔

ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی، دوسری صدی ہجری کے دیار سندھ و ہند کے ان عالی  
قدر حضرات میں سے تھے جنہیں تبع تابعین کہا جاتا ہے۔<sup>(۲)</sup>

۱۴۔ قیس بن بسر بن سندھی البصری:

قیس بن بسر کے دادا کے والد عبداللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے صحابی تھے۔ قیس کا تعلق علاقہ سندھ سے تھا اور وہ تبع تابعین کی برگزیدہ جماعت  
کے فرد تھے۔

۱۔ الانساب و رقی ۳۱۳۔

۲۔ اھل العین فی فوج الہند و سن و ردیہا من الصحابۃ و التابعین ص ۲۰۲۔

## ۱۵۔ ابو معشر نجج بن عبد الرحمن سندھی مدنی:

نجج بن عبد الرحمن سندھی مدنی مشہور محدث اور معروف تبع تابعی تھے۔ ان کی کنیت ابو معشر تھی۔ جن تابعین کرام سے ابو معشر نے حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سماعت کی، ان کا ذکر حافظ ابن حجر نے تہذیب المعجم میں ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور سمعی نے الانساب میں کیا ہے۔

اصحاب حدیث کی کثیر جماعت سے روایت حدیث کی جن میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت محمد بن المنکدر ایسے محدثین شامل ہیں۔

محدثانہ نقطہ نظر سے مختلف ماہرین رجال نے ابو معشر کے بارے میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔

ان کی زبان میں ہکلاہٹ تھی اور کعب کو تعب کہتے تھے۔

اس سندھی محدث اور تبع تابعی کا رنگ سرخ، آنکھیں نیل گوں اور جسم بھاری بھر کم تھا۔

عباسی خلیفہ مہدی ۱۶۰ھ میں ان کو اپنے ساتھ عراق لے گیا تھا اور ایک ہزار دینار عطا کیے تھے۔ وہ ان سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ان سے لوگوں کو تعلیم دینے کی درخواست کی تھی۔

ابو معشر رمضان ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے۔ اسی سال ہارون الرشید تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کا جنازہ پڑھایا اور ان کی موت پر حزن و ملال کا اظہار کیا۔ بغداد کے مقبرۃ الکبیرہ میں دفن کیے گئے۔<sup>(۱)</sup>

## ۱۶۔ محمد بن ابراہیم بیلمانی:

ان کا تعلق بھی برصغیر سے تھا اور یہ بیلمان کے رہنے والے تھے۔ ان سے عبید اللہ

۱۔ تہذیب المعجم ج ۱ ص ۴۷۹۔ الانساب بذیل لفظ سندھی ورق ۴۱۳۔۔۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱

ص ۲۳۳۔۔۔ معجم البلدان ج ۳ ص ۲۶۔

بن ربیع نجرانی نے روایتِ حدیث کی۔<sup>(۱)</sup>

۱۷۔ محمد بن حارث بیلمانیؒ:

یہ دراصل بیلمان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے والد حارث بیلمانی سے روایتِ حدیث کی اور پھر ان سے محمد بن حارث حارثی نے روایت کی۔<sup>(۲)</sup>

۱۸۔ یزید بن عبد اللہ قرشی سندھیؒ:

یزید بن عبد اللہ قرشی بیری سندھی کی کنیت ابو خالد ہے اس لیے انھیں ابو خالد بیری بھی کہا جاتا ہے۔ مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ لفظ ”بیسر“ کی جمع ”بیاسر“ ہے۔ دورِ اول میں جو مسلمان ہندوستان میں پیدا ہوئے انھیں ”بیاسرہ“ کہا جاتا تھا اس کا واحد ”بیسر“ ہے اور اس کی نسبت بیری ہے۔ یزید بن عبد اللہ قرشی کی ولادت چوں کہ علاقہ سندھ میں ہوئی تھی اس لیے یہ سندھی بھی کہلائے اور بیری بھی!

یزید بن عبد اللہ نے سفیان ثوری اور ابن جریج وغیرہ حضرات سے احادیثِ رسول روایت کیں۔ پھر خود یزید بن عبد اللہ سے علی بن ابو ہاشم، ابوداؤد طیالسی اور محدثین کی ایک جماعت نے سماعِ حدیث کی۔

ایک حدیث کی سند میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مندرجہ ذیل الفاظ فرمائے یزید بن عبد اللہ بیری راوی ہیں۔

عن علی قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبرز فخذک ولا تنظر الی فخذحی ولا میت۔<sup>(۳)</sup>

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ران ظاہر نہ کرو اور نہ کسی زندہ اور مردہ شخص کی ران کی طرف دیکھو۔

مشہور صحابی حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے اس کی سند میں

۱۔ العقد الثمین ص ۱۱۹۔

۲۔ تہذیب احمد ج ۹ ص ۱۰۴ و ۲۹۳۔

۳۔ ابوداؤد ذکین ماجہ۔

یزید بن عبد اللہ قرشی سندھی ایک راوی ہیں۔

عن ابی جحیفۃ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
جالسوا العلماء و سائلوا الکبراء و خالطوا الحکماء۔<sup>(۱)</sup>  
یعنی حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے ارشاد فرمایا: علما کی مجلس میں بیٹھا کرو بڑوں سے سوال پوچھا کرو اور  
دانش مندوں سے ملا جلا کرو۔

ابن حبان نے یزید بن عبد اللہ سندھی کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اصلاً  
سندھی تھے۔ ذکرہ ابن حبان فی الثقات فقال اصلہ من السند۔  
یزید بن عبد اللہ سے روایت حدیث کرنے والوں میں ایک راوی محمد بن ابو بکر مقدسی  
ہیں، جنہیں اصحاب رجال نے ”مستقیم الحدیث“ قرار دیا ہے۔<sup>(۲)</sup>

یہ ہیں اہل حدیث کے وہ چار کارواں جنہوں نے اسلام کے بالکل ابتدائی عہد میں  
برصغیر کا عزم کیا۔ یہ کارواں صحابہ کرام، تابعین ذی احترام اور تبع تابعین عالی مقام پر  
مشتمل ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں جن کی مسلسل کوششوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی  
احادیث پاک کا ذخیرہ یہاں آیا اور اس سرزمین کے باشندے اس سے مستفیض ہوئے۔  
مختلف فقہی مسالک یہاں بہت بعد میں آئے اس لیے کہ ان مسالک کا ظہور بہت بعد میں  
ہوا۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ مسالک  
کہاں تھے؟ ان کا تو ائمہ فقہ کی طرف انتساب بھی ان ائمہ کرام کے دنیا سے رخصت ہو  
جانے کے بہت بعد میں ہوا۔

جب تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ برصغیر میں اہل حدیث پہلی صدی  
ہجری ہی میں آ گئے تھے جب کہ فقہی مسالک کا دنیا میں نام و نشان بھی نہ تھا تو آئیے اب  
آئندہ طور میں اہل حدیث کے متعلق دیگر ضروری امور کو مرکز بحث ٹھہراتے ہیں۔

۱۔ سیوطی فی جامع الصغیر۔۔۔ طبرانی فی الکبیر

۲۔ لسان المیوان ج ۶ ص ۲۹۰۔۔۔ کتاب المجرع والتعذیل ج ۳ ص ۲۷۱۔۔۔ مردج الذہب ج ۳ ص ۳۱۳۔



## پانچواں باب

### مختلف قدیم ادوار کی کتابوں میں اہل حدیث کا تذکرہ

یہ کتاب جس موضوع پر مشتمل ہے اس کی روشنی میں یہ سوال نہایت اہم ہے کہ اگر اہل حدیث قدیم دور سے چلے آ رہے ہیں تو قدیم مصنفین میں سے کسی لائق تکریم مصنف نے اپنی کسی کتاب میں اہل حدیث کا تذکرہ کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو کن کن عالی قدر حضرات نے کیا ہے اور کس انداز میں کیا ہے؟ اس ضمن میں اس فقیر نے ایک خاکہ مرتب کیا تھا اور اس خاکے کی روشنی میں چند صفحات لکھے تھے کہ حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مرحوم و مغفور کی تصنیف ”تاریخ اہل حدیث“ موصول ہوئی جو مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب جس طرح اپنے مندرجات کے اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل ہے اسی طرح مکتبہ قدوسیہ نے اس کی اشاعت میں اپنی روایت کے مطابق انتہائی حسن و ذوق کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ کتاب میں حضرت مولانا مرحوم نے اس بات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے کہ اہل حدیث کا ذکر قدیم دور کی کن کتابوں میں آیا ہے اور کس فاضل مصنف نے ان کا ذکر کس اسلوب میں کیا ہے چنانچہ اس فقیر نے دیگر تصنیفات کے علاوہ اس سلسلے میں حضرت مولانا سیالکوٹی کی تحریر فرمودہ معلومات سے بھی استفادہ کیا ہے جس کا اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل طور میں ذکر کیا جاتا ہے۔

علم شریعت مختلف شعبوں پر مشتمل ہے مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام اور تاریخ وغیرہ۔ ان میں سے ہر شعبے کی قدیم و جدید تصانیف میں اہل حدیث کا ذکر بے حد احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تصانیف کے مصنفین کے نزدیک یقیناً ایک ایسی جماعت موجود تھی جس کے ارکان کی تحقیقات و تنقیدات کے سبب محتاج تھے۔ بعض مقامات پر اس جماعت کا ذکر لفظ اہل حدیث سے ہوا ہے، بعض جگہ انھیں اصحاب

حدیث لکھا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں اہل اثر قرار دیا گیا ہے اور بعض حضرات نے انہیں محدثین کے لقب سے تعبیر کیا ہے۔ مقصد ان تمام القاب سے سب کا یہی ہے کہ چوں کہ اس جماعت کو احادیث پیغمبر اور آثار نبویہ سے خاص شغف و تعلق ہے، اس لیے ان کو ان پر ہشکوه القاب سے یاد کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا اور ان پر ”از مصطفیٰ شنیدن و از دیگران بریدن“ والی بات صادق آئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی چیز کے نام کا مقصد اس کا دوسروں سے تمیز و تعارف ہوتا ہے۔ صدر اول اور قرن ثانی میں مسلمان صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعت سے عبارت تھے۔ مختلف مسلکی فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تقدید تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس و اطہر کے سوا کسی شخصیت کو شریعت میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ یعنی کوئی دوسرا فرقہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ کسی سے تمیز ہونے کے لیے الگ نام کی ضرورت پڑتی۔ اس کے بعد جب ائمہ مجتہدین کا دور آیا اور ان کے اقوال و ارشادات کو حجت گردانا گیا اور مختلف مذاہب کی بنیادیں قائم ہو گئیں تو جن لوگوں نے طرز اول اور زمانہ سابق کی طرح کسی شخصیت کو دین میں داخل کرنے کے بغیر صرف کتاب و سنت سے حصول دین کو اپنا دستور قرار دیے رکھا اور اپنے عمل و اعتقاد کی بنا فقط قرآن و حدیث پر رکھی، وہ اہل حدیث، اصحاب حدیث، اہل اثر اور محدثین کہلائے۔ اس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمائی ہے۔ باقی سب لوگ یا تو اپنے اپنے امام و مقتدی کی طرف منسوب ہوئے، جس کی شخصیت کو انھوں نے دوسرے فرقوں میں حد فاصل قرار دیا تھا اور اس شخصیت کے مجتہدات کو مسائل و احکام کے لیے اصل و سند مانا، مثلاً حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کہلائے۔ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہوئے۔ اور یا پھر اس مسئلے کی طرف منسوب ہوئے، جس میں انھوں نے اصحاب حدیث سے اختلاف کیا، مثلاً قدر یہ مسئلہ تقدیر کے منکر ہونے کی وجہ سے قدر یہ کہلائے، جبر یہ جبر محض کے قائل ہونے کی بنا پر جبر یہ کے نام سے موسوم ہوئے اور مرجئہ اعمال کو

ایمان سے جدا کرنے اور محض ایمان پر نجات کی امید ورجا رکھنے کے سبب مرجئہ کے نام سے پکارے گئے۔

ائمہ مجتہدین سے قبل، عہد صحابہ میں بھی ایک عظیم اختلاف پیدا ہوا تھا، جس کی بنیاد امور سیاست تھی، لیکن بعد کو وہ اختلاف مذہبی اور اعتقادی شکل اختیار کر گیا اور امت میں اس کی وجہ سے ایسا تہلکہ مچا ہوا جو روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ اختلاف یہ تھا کہ شیعہ درحقیقت اس گروہ کا نام تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حامی تھا اور خارجی اس طائفے کو کہا جاتا تھا جو حکیم کے سلسلے میں حضرت علیؑ سے الگ ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد حالات نے ایسی تبدیلی اختیار کی کہ معتقدات میں یہ دونوں گروہ یعنی شیعہ اور خارجی اہل سنت کے مقابلے میں آگئے اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ”اہل سنت“ کا لقب انہی اور ان جیسے دیگر بدعی فرقوں کے مقابلے میں وضع کیا گیا تھا۔

متداول کتب حدیث میں سب سے قدیم کتاب موطا امام مالک ہے۔ حضرت امام مالک کی ولادت مدینہ طیبہ میں ۹۳ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے زمانے میں ہوئی اور انھوں نے مدینہ طیبہ ہی میں ۱۷۹ھ کو خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے زمانے میں وفات پائی۔ اس وقت عرب کے علاوہ شمالی افریقہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آچکا تھا اور چین وغیرہ یورپ کے بعض ملکوں پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور امام مالک کا فیض حدیث تمام ممالک اسلامی میں پہنچ چکا تھا، چنانچہ موطا کا آخری نسخہ جو عام طور پر اہل علم میں متداول ہے، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کا روایت کردہ ہے جو امام مالک کے بلا واسطہ شاگرد تھے اور چین کے باشندے تھے۔ لیکن موطا میں فرقہ بندی کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ اس میں کسی فرقے کی تردید کے انداز میں مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

اب ذیل میں ان مصنفین کا تذکرہ کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی تصانیف میں اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لائق شاگردوں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بے حد شہرت پائی جو ۱۵۰ ہجری میں پیدا اور ۲۰۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس وقت حج

تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ امام شافعی کا سفر نامہ ”رحلۃ الشافعی“ کے نام سے امام سیوطی نے تالیف کیا تھا، جو انھوں نے اپنے شاگرد ربیع بن سلیمان مصری کو املا کرایا تھا۔ لکھتے ہیں۔

یلقانی الرجال واصحاب الحدیث منهم احمد بن حنبل و سفیان

بن عیینہ و اوزاعی (صفحہ ۱۴)

یعنی مجھے عام لوگ بھی ملتے تھے اور اصحاب حدیث بھی ملتے تھے، جن میں احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ اور اوزاعی شامل ہیں۔

یہاں امام شافعی نے تین اصحاب حدیث کے نام لیے ہیں اور وہ ہیں امام احمد، امام سفیان اور امام اوزاعی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام احمد بن حنبل بغداد کے رہنے والے ہیں، امام سفیان بن عیینہ کا تعلق کوفہ سے ہے اور امام اوزاعی ملک شام کے باشندے ہیں اور یہ تینوں مقامات ایک دوسرے سے طویل مسافت پر واقع ہیں اور ان تینوں میں اہل حدیث موجود ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد ہی میں اس جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ دور دراز علاقوں میں پھیل گئے تھے۔

۲۔ حافظ ابن حجر نے بھی اپنی تصانیف میں جماعت اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقامات پر ان کے لیے اصحاب الحدیث کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور بعض مقامات پر اہل الحدیث کے۔ پھر ان کا تذکرہ ”اہل الراے“ (یعنی اصحاب کوفہ) کے مقابلے میں کیا ہے اور دونوں کے طریق عمل اور انداز اجتہاد کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ امام شافعی کے جامع الفقہ والحدیث ہونے کے بارے میں رقم فرماتے ہیں۔

فاجتمع له علم اهل الراى وعلم اهل الحديث.

یعنی ان کی ذات میں اہل راے اور اہل حدیث دونوں کے علوم جمع ہو گئے تھے۔

حافظ ابن حجر کی ولادت ۷۷۷ھ میں اور وفات ۸۵۴ھ میں ہوئی۔

۳۔ جامع ترمذی میں تو متعدد مقامات پر اہل الحدیث اور اصحاب الحدیث کا ذکر

آیا ہے۔۔۔۔۔ امام ابو یوسف ترمذی کا سال ولادت ۲۰۹ھ اور سال وفات ۲۷۹ھ ہے۔  
 ۴۔ حنفی فقہ کی کتابوں میں بھی اہل حدیث کا ذکر ایک مستقل جماعت کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ سید امین ابن عابدین شامی رد المحتار شرح الدر المختار کی تیسری جلد کے صفحہ ۳۹۳ اور ۳۹۴ میں رقم فرماتے ہیں۔

حکمی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفہ خطب الی رجل من  
 اصحاب الحدیث ابنته فی عہد ابی بکر الجوز جانی فابی الان  
 یتروک ملہبہ فبقرا خلف الامام ویرفع یدہ عند الانحناء  
 ونحو ذالک فاجابہ لفر وجہ.

(یعنی روایت ہے کہ قاضی ابوبکر جوز جانی کے عہد میں ایک حنفی نے ایک اہل حدیث سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو اہل حدیث نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس صورت میں رشتہ دے سکتا ہے کہ وہ اپنا (حنفی) مذہب چھوڑ دے اور امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے اور رکوع جاتے وقت رفع یدین کرے اور اسی طرح اہل حدیث کے دیگر مسائل پر بھی عمل کرے۔ چنانچہ اس حنفی نے اس شرط پر عمل کرنے کا اقرار کیا اور اہل حدیث نے اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔)

یاد رہے قاضی ابوبکر جوز جانی تیسری صدی ہجری کے قاضی ہیں جو ابوسلیمان کے شاگرد تھے اور ابوسلیمان بلا واسطہ امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد تھے۔ (الفوائد البیہ صفحہ ۱۴)  
 اس واقعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مستقل طور سے ایک جماعت موجود تھی جس کا نام اہل حدیث تھا اور ان کے امتیازی مسائل میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا اور رکوع کو جاتے وقت رفع یدین کرنا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی اہل حدیث کے یہ امتیازی مسائل ہیں اور گزشتہ دور میں بھی وہ ان مسائل پر عامل تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث یا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ وہ جماعت ہے جو شروع ہی سے چلی آ رہی ہے اور اس کے کچھ امتیازی مسائل ہیں جن پر یہ جماعت عامل تھی اور عامل ہے۔

۵۔ امام مسلم بن قتیبہ نے اپنی کتاب ”تاویل مختلف الحدیث“ میں معتزلہ مجہمہ، روافض اور اہل الراے وغیرہ فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک عنوان اصحاب الحدیث کے متعلق قائم کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے ہر اس جگہ سے حق تلاش کیا جہاں سے مل سکتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی وجہ سے انہیں قرب الہی حاصل ہوا اور اللہ کی طرف سے اس میں ایسی برکت پیدا کی گئی کہ لوگ سنت نبوی کے مطیع و منقاد ہو گئے اور مختلف رجال کے اقوال کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔ ابن قتیبہ ۲۱۳ھ کو بغداد یا کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۶ھ کو بغداد میں وفات پائی۔

اس سے واضح ہوا کہ امام ابن قتیبہ کے زمانے میں اور ان سے پہلے اصحاب حدیث موجود تھے جو اقوال رجال کے بجائے ارشادات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عمل پیرا تھے۔ یعنی انہیں تقلید سے کوئی تعلق نہ تھا اور وہ احادیث نبوی کو لائق عمل و التفات گردانتے تھے۔ موجودہ اہل حدیث کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔

۶۔ اب ایک ایسے علم کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے جسے مذہبی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں اس میں جماعت اہل حدیث کا ذکر موجود ہے۔ تاریخ فرشتہ میں سلطان محمود غزنوی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

سلطان محمود نیز ابو الطیب سہل بن سلیمان صعلو کی را کہ از ائمہ اہل حدیث بود برسم رسالت پیش لیلک خاں فرستادہ۔

(تاریخ فرشتہ، جلد اول، مقالہ اول صفحہ ۱۲۳)

یعنی لیلک خاں نے جب ماوراء النہر کا علاقہ فتح کیا تو اس کی اطلاع اس نے از راہ مسرت سلطان محمود غزنوی کو دی، سلطان نے اس خوشی میں اس کے پاس بہ طور سفیر ابو الطیب سہل بن سلیمان صعلو کی کو بھیجا جو اس دور کے ائمہ اہل حدیث میں سے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ سلطان محمود غزنوی نے حنفی مذہب ترک کر دیا تھا۔ وہ ۳۵۷ھ

میں پیدا ہوا اور اس نے ۳۴ سال حکومت کی۔

اس سے پتا چلا کہ اہل حدیث چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان میں موجود تھے۔

۷۔ تاریخ نبی کا ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ بشاری مقدسی نے ۳۷۵ھ میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ وہ اپنے سفر نامہ میں علاقہ سندھ کے شہر منصورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”یہاں کے ذمی بت پرست ہیں۔ مسلمانوں میں اکثریت اہل حدیث کی

ہے۔“ (تاریخ سندھ، جلد اول، صفحہ ۱۲۴)

اس سے بھی ثابت ہوا کہ اہل حدیث چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان میں بہ کثرت موجود تھے۔

اب کیا ارشاد ہے ان محققین کا جنہوں نے یہ تحقیق انیق فرما رکھی ہے کہ اہل حدیث کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ کیا ان حضرات عالی قدر کی تاریخ دانی اور حساب دانی کا فیصلہ یہی ہے کہ پہلی دوسری تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے لے کر پندرہویں صدی ہجری تک کی درمیانی مدت کو ڈیڑھ دو سو سال ہی کہا جائے گا؟ سبحان اللہ! قربان جائیے اس حساب دانی کے اور صدقے جائیے تاریخ پر اس عبور کے!

۸۔ علامہ ابن خلدون عمرانیات کے ماہر اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے بہت بڑے مصنف ہیں وہ مقدمہ ابن خلدون میں صحابہ کے بعد کے دور سے متعلق فرماتے ہیں۔

وانقسم الفقہ فیہم الی طریقتین طریقة اہل الراۃ والقیاس وہم اہل العراق وطریقة اہل الحدیث وہم اہل الحجاز وکان الحدیث قلیلا فی اہل العراق لما قلدنا (مقدمہ صفحہ ۲۷۲)  
فصل فی علم الفقہ

(یعنی ان میں فقہ دو طریقوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک طریقتہ اہل رائے و قیاس کا ہے اور وہ اہل عراق ہیں۔ دوسرا طریقتہ اہل حدیث کا ہوا اور وہ اہل حجاز ہیں۔ اہل عراق میں علم حدیث کم تھا جس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔)

اس کے بعد وہ اسی فصل میں لکھتے ہیں۔

ولم یبق الا مذهب اهل الراى من العراق واهل الحديث من  
الحجاز (مقدمہ صفحہ ۲۷۳)

(یعنی اہل رائے کا مذہب عراق کی وجہ سے اور اہل حدیث کا حجاز کی وجہ سے  
دنیا میں باقی رہا۔)

۹۔ اب اس سلسلے میں حضرت پیر سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان سنئے  
جو ۴۹۱ھ میں پیدا اور ۵۶۱ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔ وہ اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین  
کے بعض مقامات میں ”اہل الاثر“ اور بعض میں ”اہل حدیث“ کا ذکر کرتے ہیں اور اہل  
بدعت کی علامات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فعلامۃ اهل البدعة الواقعة فی اهل الاثر.

(صفحہ ۱۹۸۔ مطبوعہ مرتضوی، دہلی)

(یعنی اہل بدعت کی علامت یہ ہے کہ وہ اہل حدیث کی بدگوئی کرتے ہیں۔)

یہاں ”اہل الاثر“ سے مراد اہل حدیث ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو ۱۰۶۷ھ میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، حضرت پیر  
جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان عربی الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے:

”پس نشان اہل بدعت عیب کردن است در اہل حدیث۔“

غنیۃ الطالبین (مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی کے صفحہ ۱۹۸) ہی میں پیر صاحب رقم  
فرماتے ہیں کہ اگرچہ لوگ انھیں کئی ناموں سے پکارتے ہیں، لیکن درحقیقت اس  
جماعت کا ایک ہی نام ہے، اور وہ ہے اہل حدیث، ان کے الفاظ یہ ہیں: ولا اسم لہم  
الا اسم واحد وهو اصحاب الحديث.

۱۰۔ امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ انھوں نے تفسیر کبیر میں یہ

ذیل آیت وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا، اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۶۶۱ و وفات ۷۲۸ ہجری) کے علم و



فن اور خدمات گونا گوں کی وسعتوں سے ہر لکھا پڑھا شخص آگاہ ہے۔ انھوں نے اپنی گراں قدر تصنیف ”منہاج السنۃ“ کے مختلف مقامات پر جہمیہ، قدریہ، معتزلہ، خوارج اور کرامیہ وغیرہ فرقوں کی تردید کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں اہل الحدیث اور اصحاب الحدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کے دور میں اہل حدیث بہ حیثیت جماعت کے موجود تھے، جو جہمیہ، قدریہ، معتزلہ اور خوارج وغیرہ فرقوں کے شدید مخالف تھے۔ بعض مسائل کی تعبیر میں خود اہل حدیث میں کچھ اختلاف پایا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت امام منہاج السنۃ میں رقم طراز ہیں۔

ثم بعد ذلك اختلاف اهل الحديث وهم اقل الطوائف اختلافاً  
فى اصولهم لان ميراثهم من النبوة من ميراث غيرهم فعصمهم  
حبل الله الذى اعتصموا به (جلد ثانی صفحہ ۲۱)

(اس کے بعد اہل حدیث کا باہمی اختلاف ہے جو تمام فرقوں کی بہ نسبت بہت کم ہے، کیوں کہ ان کی علمی وراثت جو خزانہ نبوت سے انھیں ملی ہے، دوسروں کی وراثت سے نہایت عظیم الشان ہے۔ ان کو اللہ کی رسی (قرآن مجید) نے بچالیا، جس سے یہ متمسک ہیں۔)

حضرت امام کے نزدیک اہل حدیث کی بہت بڑی خصوصیت وراثت نبوت اور قرآن مجید سے تمسک ہے، یعنی قرآن و حدیث پر عمل پیرا ہونا ان کا خاص وصف ہے جو انھیں دوسروں سے تمیز کرتا ہے۔

منہاج السنۃ ہی میں وہ ایک شیعہ عالم علامہ علی کے اعتراض کے ضمن میں اہل حدیث کی ایسے پیرایہ بیان میں تعریف کرتے ہیں کہ اس جماعت کے علم و عمل کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

من المعلوم لكل من له خبرة ان اهل الحديث من اعظم الناس  
بحثا عن اقوال النبي صلى الله عليه وسلم وطلبوا لعلمها وارغب  
الناس في اتباعها وابعدها الناس عن اتباع الهوى (جلد ثانی صفحہ ۱۷۸)

(یعنی جس شخص کو کچھ بھی خبر ہے، اسے معلوم ہے کہ اہل حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق سب سے زیادہ تحقیق کرنے والے ان کے علم کے طالب، ان کی پیروی میں سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے اور خواہشات کی اتباع میں سب سے زیادہ دور ہیں۔)

۱۲۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (ولادت صفر ۷۲۲ھ - وفات ۲۲ محرم ۷۹۲ھ) مشہور مصنف اور صاحب تحقیق عالم تھے۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے ایک نہایت اہم کتاب اصول فقہ کی کتاب توضیح کی شرح تلوخ ہے جو درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے اور طلباء کو پڑھائی جاتی ہے۔ اسے توضیح تلوخ کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں علامہ تفتازانی اہل حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں اور شافعیہ کا بھی۔ اجماع کی بحث میں فرماتے ہیں:

وعلیہ عامة اهل الحديث والشافعية.

(یہی اہل حدیث اور شافعیہ کا نقطہ نظر ہے۔)

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ قدیم دور کی کتابوں میں جہاں اہل حدیث یا اصحاب حدیث اور محدثین کے الفاظ آئے ہیں اس سے شافعیہ مراد ہیں۔ لیکن یہاں ان کے اس قول کی تردید ہوگئی ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے اہل حدیث کا ذکر شوافع کے مقابلے میں مستقل طور سے الگ کیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ تفتازانی کے زمانے میں شوافع وغیرہ مقلدین کے علاوہ ایک دوسری جماعت بھی باقاعدہ صورت میں موجود تھی اور اس جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس جماعت کا دستور العمل قرآن و حدیث تھا۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں شیعہ حضرات کی دلیل حدیث غدیر خم کی تحقیق میں لکھتے ہیں:

قد قدح فی صحنتہ کثیر من اهل الحديث (شرح مقاصد جلد ثانی طبع

مصر۔ صفحہ ۲۹۰)

(اس کی صحت میں اکثر اہل حدیث نے نکتہ چینی کی ہے۔)

۱۳۔ علامہ کمال الدین ابن ہمام متاخرین حنفیہ سے تعلق رکھتے تھے اور درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کا سال ولادت ۷۹۰ ہجری اور سال وفات ۸۶۱ ہجری ہے۔ فتح القدیر شرح ہدایہ ان کی مشہور تصنیف ہے جو کسی زمانے میں مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی جلد اول کے صفحہ ۲۲، ۹۰، ۱۱۵ اور ۲۸۲ پر انھوں نے اہل حدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے زمانے میں اہل حدیث موجود تھے۔

۱۴۔ علامہ سید محمد امین بن عابدین شامی حنفی نے شرح رد المحتار میں احناف وغیرہ فقہاء کا اہل حدیث سے الگ ذکر کیا ہے۔ خوارج کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

وحکم الخوارج عند جمهور الفقهاء والمحدثين حكم البغاة  
 وذهب بعض المحدثين الى كفرهم وقال ابن المنذر ولا اعلم  
 احداً وافق اهل الحديث على تكفيرهم.

(رد المحتار جلد ثالث صفحہ ۴۷۸)

(یعنی خارجیوں کا حکم جمہور فقہاء اور محدثین کے نزدیک باغیوں کا سا ہے اور بعض محدثین انھیں کافر قرار دیتے ہیں۔ ابن المنذر کا کہنا ہے کہ میرے علم میں کوئی شخص بھی خوارج کی تکفیر کے متعلق اہل حدیث کا ہم آہنگ نہیں ہے۔)

گزشتہ سطور میں ابتداء اسلام سے لے کر علامہ شامی تک کی تصانیف سے ہم نے ثابت کیا ہے کہ ان میں اہل حدیث کا تذکرہ کثرت سے کیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ڈیڑھ دو سال کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ جماعت شروع ہی سے چلی آرہی ہے اور یہی اصل اسلام ہے اور اہل حدیث کا یہی نقطہ نظر ہے۔



برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

چھٹا باب

## اہل حدیث اور ان کا نقطہ نظر

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہیں، جن کا سلسلہ نسب نو واسطوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ۲۶۰ھ (۸۷۴ء) کو بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۵ھ (۹۳۷ء) کے پس و پیش بغداد میں وفات پائی۔ ان کی بہت سی تصنیفات میں سے ایک نہایت اہم تصنیف ”مقالات الاسلامیین“ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی جلد اول میں انھوں نے اہل حدیث اور ان کے افکار و عقائد کا تذکرہ انتہائی جامعیت کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ”اہل سنت“ کہا جاتا ہے۔۔۔ وہ لکھتے ہیں کہ اہل حدیث یا اہل سنت جن چیزوں کو افکار و نظریات کا بنیادی نقطہ قرار دیتے ہیں اور جس محور کے گرد ان کے عقائد و مسلمات گھومتے ہیں وہ ہیں۔۔۔

✽ اللہ کا اقرار کرنا، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو صحیح قرار دینا، اس کے رسولوں کو ماننا، جو احکام اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور احادیث کا جو ذخیرہ ثقہ راویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اور پھر اسے امت تک پہنچایا، اس کی حقانیت کا اقرار کرنا اور ان میں سے کسی چیز کی بھی تردید نہ کرنا۔

✽ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ بیوی۔ قرآن کہتا ہے۔

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ  
كُفُوًا أَحَدٌ (الاخلاص)

(اے پیغمبر! کہہ دو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، وہ نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا)

اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔)

✽ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔ جنت برحق ہے جہنم بھی برحق ہے۔ قیامت ضرور آئے گی، اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ.

(الحج: ۷)

(بلاشبہ قیامت آنے والی ہے اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اللہ ان سب کو جو قبروں میں مدفون ہیں اٹھائے گا۔)

✽ اللہ کے بارے میں اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرش پر ہے۔ یہ عقیدہ قرآن کی اس آیت پر مبنی ہے۔

الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى (طہ: ۵)

(رحمان جس نے عرش پر قرار پکڑا۔)

✽ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ:

✽ وہ کس طرح کے ہیں۔ دو ہاتھوں کے بارے میں وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص: ۷۵)

(جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔)

✽ ان کے عقیدے کے مطابق اللہ کے ہاتھوں میں بے حد کشادگی پائی جاتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

بَلْ يَذَاهُ مَبْسُوطَتَيْنِ (المائدہ: ۶۴)

(بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔)

✽ اللہ کی دو آنکھیں بھی ہیں، لیکن ان آنکھوں کی کیفیت کا کسی کو علم نہیں۔ آنکھوں کا

ذکر قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔

تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا (القمر: ۱۵)

(وہ کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے رواں تھی۔)

✽ آنکھوں کے علاوہ اہل حدیث کے نقطہ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ کا چہرہ بھی ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَيَنْفِي وَجْهَ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. (رحمن: ۲۷)

(اے پیغمبر! تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو کہ عظمت و اکرام والا ہے۔)

✽ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کی ذات اعلیٰ و ارفع میں علم کی صفت پائی جاتی ہے جس کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔

لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ يَعْلَمُهُ. (النساء: ۱۶۶)

(اے پیغمبر! اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے

اسے اپنے علمی کمال کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا يَعْلَمُهُ. (فاطر: ۱۱)

(کسی عورت کا حاملہ ہونا اور جنمنا سب اللہ کے علم میں ہے۔)

✽ ان کے عقاید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ میں سمع و بصر کی صفات بھی پائی جاتی ہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (بنی اسرائیل: ۱)

(بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

✽ وہ طاقت و قوت کا بھی مالک ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً.

(حم السجده: ۱۵)

(کیا انھیں یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا، وہ قوت میں ان سے

کہیں بڑھا ہوا ہے۔)

❖ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ زمین میں خیر و شر وغیرہ جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے اور تمام امور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں۔ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ قرآن اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ. (تکویر: ۲۹)

(اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے، مگر وہی جو اللہ چاہے۔)

چنانچہ یہی اہل حدیث کہتے ہیں۔

مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَا يَشَاءُ لَا يَكُونُ.

(جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا، نہیں ہو سکتا۔)

❖ اللہ کے سوا یہ لوگ کسی کو خالق نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ہر شے کا خالق اور ہر چیز کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔

❖ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی اطاعت اور فرماں برداری کی توفیق سے نوازا ہے۔ اس نے کافروں کو ذلت سے دوچار کیا ہے اور مسلمانوں کو اپنے لطف و کرم کا مستحق گردانا اور انھیں نیکی کی استعداد بخشی، ان کی اصلاح فرمائی اور ہر معاملے میں ان کو ہدایت اور رہنمائی کی نعمت سے نوازا ہے۔

❖ ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ خیر و شر کے تمام معاملات اللہ کی قضا و قدر کے تابع ہیں۔ قضا و قدر پر یہ پورا ایمان رکھتے ہیں، اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے۔ خوش کن واقعات سے ہو یا ناخوش گوار امور سے، یہ بہر حال اسے دل و جان سے مانتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

❖ یہ اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اپنے نفع و نقصان پر قدرت حاصل نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نفع و نقصان کا سلسلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمام امور میں یہ لوگ اللہ پر توکل رکھتے ہیں اور ہر وقت اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتے اور اسی کے محتاج ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

✽ قرآن کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ غیر مخلوق ہے۔  
 ✽ یہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار ہوگا اور اسی طرح ہوگا جس طرح کہ ہم چودھویں رات کا چاند دیکھتے ہیں۔ لیکن اس دیدار کا شرف صرف ایمان داروں کو حاصل ہوگا، کافروں کو نہیں ہوگا۔ کافر اس کے دیدار سے محروم رہیں گے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَّحُجُونَ. (تطفیف: ۱۵)  
 (ہرگز نہیں۔ ان (کافروں) کو اس دن پروردگار کے دیدار سے روک دیا جائے گا)

✽ ایمان کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ اللہ کو مانا جائے، اس کے فرشتوں اور اس کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کو تسلیم کیا جائے۔ تقدیر پر ایمان لایا جائے، اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے، خوش کن واقعات سے ہو یا تلخ حقائق سے۔ تقدیر پر ایمان لانے کا انداز اس طرح کا ہونا چاہیے کہ جو مصیبت ٹل گئی، وہ کبھی پیش آنے والی نہ تھی اور جو پیش آگئی، وہ ٹل نہیں سکتی تھی۔

✽ ایمان کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ توحید کو مانا جائے، یعنی اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔  
 ✽ یہ لوگ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب (یعنی دلوں کو پھیر دینے والا) ہے۔

✽ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شفاعت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو کبائر کے مرتکب ہوئے ہیں۔

✽ ان کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے، حوض کوثر برحق ہے، پل صراط برحق ہے، موت کے بعد زندہ ہونا برحق ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حساب ہونا برحق ہے۔ قیامت کے روز اللہ کے حضور کھڑا ہونا برحق ہے۔

✽ ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان انسان کے قول و عمل سے عبارت ہے اور ایمان میں کمی



بیشی ہوتی رہتی ہے۔

❖ کبائر گئے مرتکب لوگوں کے لیے یہ جہنمی ہونے کی گواہی نہیں دیتے اور نہ یہ موحدین میں سے کسی کے لیے جنت کو حتمی قرار دیتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہ کسی کو جہاں چاہے رکھے۔ چاہے تو عذاب میں مبتلا کر دے اور چاہے تو معاف فرما دے۔

❖ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موحدین میں سے بہت سے لوگوں کو جہنم سے نجات دلا دے گا، جیسا کہ متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مروی ہیں۔

❖ دینی امور و معاملات سے متعلق یہ لوگ مجادلت و منازعت سے انکار کرتے ہیں۔  
❖ جبر و قدر کے مسائل سے متعلق بحث و تحقیق سے یہ لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں۔

❖ یہ لوگ ہر اس بات کو مبنی بر صحت قرار دیتے ہیں جو صحیح احادیث سے مروی ہے یا جس بات کا ثبوت ان آثار سے ملتا ہے جو ثقہ راویوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں، جن کا ہر راوی عادل ہے اور عادل ہی سے اس نے یہ آثار نقل کیے ہیں اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک منہتی ہوا۔

❖ یہ لوگ دینی مسائل میں یہ کہنے کے عادی نہیں ہیں کہ یہ کیوں ہوا اور کیوں کر ہوا۔ یعنی دین میں یہ ”لم“ اور ”کیف“ کو صحیح نہیں قرار دیتے۔

❖ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے انسان کو شر کے ارتکاب کا حکم نہیں دیا بلکہ شر سے روکا ہے۔ اس نے ہر معاملے میں خیر کو اپنانے کا حکم دیا ہے۔ تاہم ان کے نزدیک خیر و شر اللہ کے ارادہ بگوینی میں ضرور داخل ہے۔

❖ یہ لوگ صحابہ کرام کے فضائل تو بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے باہمی مشاجرات کے بیان سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحابہ اور خلفائے راشدین میں اولیں مقام حضرت ابوبکر کا ہے۔ پھر حضرت عمر کا، ان کے بعد حضرت عثمان کا اور پھر

حضرت علی کا ہے۔ رضی اللہ عنہم۔

❖ یہ لوگ اس بات کو صحیح قرار دیتے ہیں جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت کا طالب ہو۔

❖ کتاب و سنت کو یہ لوگ حجت تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ. (النساء: ۵۹)  
(کسی معاملے میں تم اختلاف کرنے لگو تو اسے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کرو۔)

❖ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے ہی (زندہ) قرار دیتے ہیں۔ اسے عالم قادر، سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) عزیز، عظیم، جلیل، کبیر، کریم، مرید (ارادہ کرنے والا) اور جواد (فیاض) مانتے ہیں۔

❖ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، عظمت، جلال، کبریا، ان کے نقطہ نظر کے مطابق سب صفات باری تعالیٰ کی ہیں۔

❖ ان کے نزدیک صحابہ کرام کو برسر حق ماننا ضروری ہے۔

❖ ان کا کہنا ہے کہ دینی امور میں بدعات سے دامن کشاں رہا جائے اور صرف انہی باتوں کو لائق اتباع قرار دیا جائے جن کے اتباع کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔

❖ ان کے نزدیک مشرکین کے مقابلے میں فریضہ جہاد ادا کرنا چاہیے۔ یہ جہاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے شروع ہوا ہے جو خروج دجال اور اس کے بعد تک جاری رہے گا۔

❖ یہ لوگ منکر کبیر، معراج نبوی اور رویا کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فوت شدہ مسلمانوں کے لیے اگر دعا کی جائے یا صدقہ دیا جائے تو اس کا انھیں ثواب پہنچتا

ہے۔

✽ جنت اور دوزخ ان کے نزدیک مخلوق ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی شخص طبعی موت مرے یا مارا جائے اور قتل کیا جائے وہ سب اس ”اجل“ اور وقت مقررہ کے تحت ہوتا ہے جو پہلے سے اس کے لیے متعین ہے۔

✽ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر قسم کا رزق ہر جان دار کو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور یہ کہ انسان کے دل میں شیطان و سو سے ڈالتا، اسے شکوک میں مبتلا کرتا اور صراطِ مستقیم سے دور ہٹانے اور صحیح معاملات سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔

✽ ان کے نزدیک ’چھوٹے بچے مر جائیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہ چاہے تو انھیں عذاب میں مبتلا کرے اور چاہے تو ان کے ساتھ کوئی اور معاملہ روار کھے۔

✽ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ان سب چیزوں کا علم ہے جن سے انسان اپنی زندگی میں دوچار ہونے والا ہے۔ جو کچھ ظہور میں آنے والا ہے وہ پہلے سے اللہ کے نزدیک لکھا ہوا ہے اور تمام امور اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

✽ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بندے اللہ کے فیصلوں پر صبر کریں، اس کے احکام مانیں، جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان سے رکیں اور جن پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے ان پر خلوص قلب سے عمل کریں، تمام مسلمانوں کے خیر خواہ رہیں، اللہ کی عبادت کو اپنا شعار بنائیں، کہاڑ سے مجتنب رہیں، زنا، چوری اور کذب بیانی وغیرہ کبیرہ گناہوں سے دامن بچا کر رکھیں۔ عصبیت، فخر و غرور، کبر و عنوت، خود پسندی اور دوسروں کی تحقیر سے بچیں۔

✽ اہل بدعت سے کنارہ کش رہیں۔ زیادہ تر وقت تلاوت قرآن اور آثار و سنن کے مطالعہ و تحریر میں صرف کریں۔ آیات الہی کو مرکز غور و فکر ٹھہرائیں۔ تواضع، فروتنی، حسن اخلاق، اعمال خیر اور خدمت خلق کو لازمہ حیات قرار دیں۔ کسی کو ایذا نہ پہنچائیں، غیبت نہ کریں، کھانے پینے میں احتیاط برتیں اور حلال و طیب چیزوں کی جستجو میں رہیں۔

یہ ہیں وہ چیزیں جن پر اہل حدیث خود بھی عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی ان کا عقیدہ ہے، یہی ان کی رائے ہے اور یہی ان کا نقطہ نظر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پورا اسلام اس میں آ گیا ہے اور مسلک اہل حدیث پورے اسلام سے تعبیر ہے۔ یہ کسی خاص فرقے، خاص جماعت اور حزب کا نام نہیں ہے۔ کامل اسلام اور مکمل دین کا نام ہے۔ اس میں کوئی جھول، کوئی الجھاؤ اور کوئی الجھن نہیں ہے۔ کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ہر بات سیدھی اور ہر معاملہ صاف ہے۔ ہر حکم واضح ہے اور ہر مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ جاتا اور ذہن میں اتر جاتا ہے۔ اسلام چوں کہ دین آسمان ہے، لہذا ان چیزوں کو محیط فہم میں لانا بھی نہایت آسان ہے۔ الدین یسر۔

اہل حدیث کوئی فرقہ نہیں، اصل اسلام ہے:

چوتھی صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز محقق محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق نے ”الفہرست“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کون سا علم کب عالم وجود میں آیا اور کن کن اصحاب علم نے اس کی ترویج و اشاعت میں کیا خدمات سر انجام دیں۔ بہ اختلاف روایات ابن ندیم وراق نے ۳۹۰ھ (۱۰۰۰ء) کے لگ بھگ وفات پائی۔

علوم و فنون اور رجال کے سلسلے میں ”الفہرست“ کا شمار کتب حوالہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے چھٹے مقالے کا چھٹا فن ”فقہائے محدثین اور اہل حدیث“ پر محتوی ہے۔ اس مقالے میں پہلی دوسری اور تیسری صدی ہجری کے محدثین اور اصحاب حدیث کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس بزرگ نے کون سی کتابیں تصنیف کیں۔

یہ کتاب اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ ”اہل حدیث“ کوئی نیا مذہب یا نیا فرقہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ابتداء اسلام سے ہے اور یہی درحقیقت اصل اسلام ہے، جس کی نسبت کتاب و سنت کی طرف ہے۔ باقی تمام مذاہب و مسلک افراد و ائمہ کی طرف منسوب ہیں اور ان کے فقہی رجحانات و آراء کے آئینہ دار۔۔۔!

## اہل حدیث اور اہل سنت:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام احمد اور لقب تقی الدین ہے۔ ان کی کنیت ابو العباس ہے۔ وہ ۱۰- رجب الاول ۶۶۱ھ (۲۱ جنوری ۱۲۶۳) کو حران کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور علم و تحقیق میں یگانہ روزگار تھے۔ انھوں نے ۲۸- ذیقعدہ ۷۲۸ھ (۴ اکتوبر ۱۳۲۸ء) کو وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ کی ایک مشہور تصنیف ”منہاج السنہ“ ہے۔ اس کتاب میں وہ اہل حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ان اهل الحديث من اعظم الناس بحثا عن اقوال النبي صلى الله عليه وسلم وطلباً لعلمها وازغب الناس في اتباعها وابتعد الناس عن اتباع هو يخالفها. (۱)

(اہل حدیث کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے سب سے زیادہ متلاشی رہتے ہیں اور آپ کے فرامین کی اتباع ان کے نزدیک انتہائی مرغوب و محبوب ہے اور جو چیز اس کے خلاف ہو اس سے دور بھاگتے ہیں۔)

اسی کتاب میں دوسری جگہ وہ اہل حدیث اور اہل سنت کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں۔

واما اهل الحديث والسنة والجماعة فقد اختصوا باتباع الكتاب والسنة الثابتة عن نبيهم صلى الله عليه وسلم في الاصول والفروع وما كان عليه اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم (۲)

(اہل حدیث اور اہل سنت والجماعت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اصول و فروع میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مرکز اتباع ٹھہراتے ہیں اور ان

امور کی پیروی کرتے ہیں، جن پر صحابہ کرام عامل تھے۔)

ائمہ اربعہ سے پہلے کا مذہب:

امام ابن تیمیہ صاف الفاظ میں رقم فرماتے ہیں کہ اہل حدیث کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ائمہ اربعہ سے پہلے کا مذہب ہے اور صحابہ کرام اسی کے مطابق عمل کرتے تھے اور درحقیقت یہی لوگ اہل سنت ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ارشادات پر عمل پیرا ہیں۔ امام صاحب اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔

ومن اهل السنة مذهب معروف قبل ان يخلق الله اباحيفه  
ومالكا والشافعي واحمد فانه مذهب الصحابة تلقوه عن نبيهم  
ومن خالف ذلك كان مبتدعا عند اهل السنة والجماعة. (۱)  
(اہل سنت کا یہ معروف مذہب ہے جو امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور  
امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے اور یہی مذہب صحابہ  
رضوان اللہ علیہم کا ہے جس کی تعلیم انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل  
کی، جو لوگ اس کے خلاف دوسری راہ اپنائیں گے ان کا شمار اہل بدعت  
میں ہوگا۔)

کتاب وسنت کے اصل قبعین

اہل حدیث کے اوصاف بیان کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔  
فہم یؤمنون بکل رسول وبکل کتاب لا یفرقون بین احد من  
رسل اللہ ولم یکنوا من الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعا. (۲)  
(یہ لوگ ہر رسول اور اللہ کی ہر کتاب پر ایمان رکھتے ہیں نہ یہ اللہ کے  
پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان فرق کرتے ہیں اور نہ یہ ان لوگوں میں  
سے ہیں جو دین میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔)

۱۔ منهاج السنۃ لمطہرۃ المکتبۃ الشفیۃ۔ لاہور ۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء

۲۔ تلخیص المنطق صفحہ ۳۳۔

امام ابن تیمیہ ”نقض المنطق“ میں اہل حدیث کے بارے میں امام اسماعیل بن عبدالرحمن صابونی (متوفی ۴۳۹ھ/۱۰۰۸) کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

ان اصحاب الحدیث المتمسکین بالكتاب والسنة يعرفون ربهم تبارک وتعالیٰ بصفاته التي نطق بها كتابه وتنزيله وشهدله بهارسوله على ماوردت به الاخبار الصحيحة ونقله العدول الثقات ولا يعتقدون تشبيها لصفاته بصفات خلقه ولا يکیفونها تکیف المشبه ولا يحرفون الكلم عن مواضعه تحریف المعتزلة والجهمية.

(اہل حدیث کا شیوہ یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت سے تمسک کرتے ہیں۔ اللہ کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اس نے خود اپنی کتاب (قرآن مجید) میں بیان فرمائی ہیں اور جن کا ذکر اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان صحیح احادیث میں کیا ہے جو عادل و ثقہ راویوں سے مروی ہیں۔ وہ اس کی صفات کو اس کی مخلوق کی صفات سے تشبیہ نہیں دیتے۔ نہ ان کی کیفیات بیان کرتے ہیں اور نہ معتزلہ و جہمیہ کی طرح کلام میں تحریف کرتے ہیں۔)



## ساتواں باب

# اہل حدیث کے اصول و ضوابط

مسلم اہل حدیث کے اصول و ضوابط اور فروع و اصول قرآن و سنت کے تصریح پر استوار ہیں۔ یہی اس کے حاملین کے روح کی غذا اور یہی ان کے قلب و ضمیر کی صدا ہے اور اسی سے اس کے ماننے والے فکر و نظر کی توانائی اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ زمانہ ہزاروں لاکھوں کروٹیں لے چکا ہے اور ہر صبح نئے سے نئے انقلاب کو اپنے دامن پر رونق میں لپیٹ کر لباس شب زیب تن کرتی ہے، لیکن قرآن کے احکام و اوامر اور قواعد و قوانین اپنی جگہ اٹل ہیں۔ اس کے رنگ و روغن میں وہی سچ دھج کار فرما ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے اس کا طرہ امتیاز تھا۔ اس کے حسن و زیبائی میں وہی نکھار وہی رعنائی اور وہی دل آویزی ہے جو دور نزول میں اس کے ساتھ مختص تھی۔ بلکہ علوم و معارف کی کثرت اور ارتقا و تقدم کی ہر لحظہ فراوانیوں نے اس میں مزید سامان و معظت پیدا کر دیا ہے۔ کارخانہ کائنات جس سچ پر چل رہا ہے اور یہ عالم رنگ و بو ترقی کی جن منازل کی طرف گام فرسا ہے، اس کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو وہ وقت دور نہیں جب پوری دنیا صرف قرآن و سنت ہی کو مرکز اطاعت قرار دینے لگے گی اور نبض عالم کی دھڑکنیں اسی میں مرکوز ہو کر رہ جائیں گی۔

## قرآن مجید

قرآن مجید وہ اولین خزانہ نور اور معدن رشد و ہدایت ہے جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک بول میں ہزاروں مشعلیں فروزاں ہیں اور جس کی ایک ایک آیت میں حکمت و دانائی کے لاتعداد گہر ہائے یک دانہ مستور ہیں۔ اس کی ہزاروں تفسیریں لکھی گئی ہیں اور ہزاروں لکھی جائیں گی۔



قرآن کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے جو اسے تمام کتب سماویہ سے ممتاز کرتی ہے کہ غیر مسلم اور اس کے شدید مخالف بھی اسے شانستہ التفات ٹھہراتے اور اس کی تفسیر و تبیین کے لیے قلم کو حرکت دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نیتوں کی تہوں میں بغض و عناد کے جراثیم بھرے ہوئے ہیں اور اس کے اظہار کے لیے وہ موقع و محل کی تلاش میں رہتے ہیں۔

قرآن مجید وہ صحیفہ عظیم المرتبت اور کتاب مقدس ہے جس میں اوامر و نواہی بھی ہیں اور واقعات و قصص بھی۔ معاملات بھی ہیں اور عبادات بھی۔ فضائل اسلام کی تفصیل بھی ہے اور معائب کفر و شرک کی وضاحت بھی۔ دنیوی زندگی کے فرائض بھی اس میں صراحت سے بیان کیے گئے ہیں اور بہ صورت انکار عالم آخرت میں جن نتائج و عواقب سے دوچار ہونا پڑے گا اس کی بھی پوری تصریح کی گئی ہے۔ اعمال صالحہ اور کردار خیر پر جو جزا مرتب ہوگی اس کا بھی ذکر ہے اور اعمال بد اور افعال قبیحہ کی سزا و عقوبت سے بھی آگاہ فرمایا گیا ہے۔ جنت کی مسرت آگئیں حقیقت بھی اس میں مذکور ہے اور نار جہنم کی ہولناکیوں سے بھی ڈرایا گیا ہے۔ حکومت و سلطنت کی بھاری بھر کم ذمے داریوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور رعایا و محکوم سے حسن سلوک کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ متعدد مقامات پر مخالفین کو متحدی بھی کی گئی ہے اور بارگاہ خداوندی میں تسلیم و رضا کا سر جھکانے والوں کو بشارت و خوش خبری سے بھی نوازا گیا ہے۔

چھوٹے بڑے معاملات، امیر و مامور سے تعلقات، راعی و رعیت سے روابط، غلام و آزاد سے مراسم، مسلم اور غیر مسلم سے میل جول، جنگ و جہاد کی نوعیت، غرض اسلوب حیات کے تمام گوشوں کا قرآن مجید میں کسی نہ کسی طریقے سے ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی بات توضیح و تصریح سے بیان کی گئی ہے اور کوئی اجمال و اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ بعض امور سے متعلق اشارات و کنایات پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان اشارات و کنایات کا پیرایہ اظہار اس درجہ دل ربا و دل کش ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت بھی ہے اور وہ تمام خوبیاں بھی بہ درجہ اتم اس میں سم آئی ہیں جو مخاطب کو اپنی طرف کھینچتی اور اس کے قلب

و ضمیر پر اثر انگیزی کے نقوش مرتب کرتی ہیں۔

قرآن مجید کی رفعت و عظمت کے بارے میں ان نہایت مختصر اشارات کے بعد اب آئیے حدیث و سنت کی طرف کہ قرآن کے ساتھ اسے بھی شریعت کا ماخذ و مصدر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

### حدیث و سنت

حدیث و سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرامین کا وہ مجموعہ روح پرور اور آپ کے اعمال و افعال کا وہ نقش حسیں ہے جس کی حفاظت و صیانت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہو گیا تھا اور پھر ایک خاص ترتیب و تسلسل کے ساتھ اہل الحدیث کے گروہ پاک باز نے اسے جاری رکھا۔

اس طائفہ مقدسہ کی مسلسل جدوجہد سے تمام ذخیرہ حدیث و سنت مدون و مرتب شکل میں آج بھی دنیا میں موجود ہے اور اس کے شروع و حواشی اور تعلیقات کے سلاسل بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی مساعی جیلہ سے عالم وجود میں آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔ آئندہ بھی جب تک یہ جہان رنگ و بو قائم ہے وجود میں آتے رہیں گے۔ شارحین حدیث نے ہر زبان میں اس پر کام کیا ہے اور نہایت محنت و ہمت سے یہ بنیادی فریضہ انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں اور ہمیشہ دیتے رہیں گے۔

شریعت اسلامی میں حدیث و سنت کو نص قطعی کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر ہم اس کے محتاج ہیں ہر معاملے میں اسے مشعل راہ ٹھہراتے ہیں اور اس سے استدلال کرتے ہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک یہ حجت قطعی ہے اور اس کے مقابلے میں کسی اور کے قول و فعل کو مکمل استدلال ٹھہرانا ہرگز اہل حدیث کا نقطہ نظر نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و فرامین اور عمل و کردار کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ کی حیات طیبہ کے نہایت مختصر عرصے میں ایک ایسا معاشرہ معرض ظہور میں آ گیا تھا جو خیرات و حسنات کی فراوانی اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی کی بنا پر اپنی مثال آپ تھا۔ پھر یہ معاشرہ

سیکڑوں اور ہزاروں افراد پر مشتمل نہیں تھا، آپؐ کے زمانے ہی میں کم وبیش ڈیڑھ لاکھ افراد کی عظیم الشان تعداد پر محیط تھا۔ مسلمانوں کے لیے وہ نہایت نامساعد حالات تھے، ان حالات میں ایسے پاکیزہ اطوار معاشرے کا پیدا ہونا ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ چشم فلک نے اس سے قبل ایسا رفیع المرتبت معاشرہ کبھی نہیں دیکھا تھا، جس کے تقدس و طہارت اور روحانی و قلبی عظمت و رفعت کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی۔ اندازہ کیجیے قرآن نے کس درجہ بے مثال الفاظ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔

رضی اللہ عنہم و رضوانہ۔

اللہ کی خوش نودی انھیں حاصل ہوگئی اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

کروڑوں مربع میل میں پھیلی ہوئی زمین نیکی سے تہی داماں اور حق و صداقت کی صداے سامعہ نواز سے قطعی محروم ہو چکی تھی۔ اسی معاشرے اور اسی پاک باز جماعت نے اس گلستان خیر کی آب یاری کی اور معارف و حقائق کا ایسا دبستان سجایا، جس کی ہمہ گیر مہمک سے اس دور کے لوگ بھی فیض یاب ہوئے، اس کے بعد بھی آج تک ہو رہے ہیں اور رہتی دنیا تک حصول فیض کرتے رہیں گے۔

یہ پہلا کاروان خیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تھا۔ دوسرا اس سے بالکل متصل اور ملا ہوا، ان کے تلامذہ عالی قدر تابعین کا اور پھر تبع تابعین کا تھا۔ یہی وہ رفیع الشان جماعت ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون قرنی ثم الدین یلونہم ثم الدین یلونہم<sup>(۱)</sup> کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔ یعنی بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہیں اور پھر ان کا جو ان کے بعد ہوں گے۔

تابعین و تبع تابعین اور ان کی صحبت و رفاقت سے مستفیض ہونے والے حضرات نے حدیث و سنت کی ترویج و اشاعت میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک فرمان کو خود سمجھنے اور آئندہ نسلوں تک اسے پہنچانے کی غرض سے محفوظ کرنے کے لیے دور دراز کے مشکل ترین سفر کیے اور ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں سے انھیں حصول مقصد کی ذرا بھی توقع ہو سکتی تھی۔

انھوں نے حدیث و سنت کو پھیلانے اور عام کرنے کی غرض سے مدارس قائم کیے اور وسیع پیمانے پر لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ ارشادات پیغمبر کی حفاظت کے لیے قلم و قرطاس سے کام لیا اور انھیں بڑی بڑی کتابوں میں باقاعدہ عنوان قائم کر کے مرتب فرمایا۔ اس طرح اس کی نشر و اشاعت کا دائرہ آگے بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی توسیع و اشاعت نے ایک ہمہ گیر اور انتہائی وسعت پذیر شکل اختیار کر لی اور فرامین پیغمبر کے تمام گوشے واضح اور نمایاں صورت میں لوگوں کے علم و مطالعے میں آئے۔

### اہل حدیث کی دعوت

اہل حدیث کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان تمام اساطین حدیث و سنت اور ائمہ فقہ کی تگ و تاز کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا جائے، زندگی کے ہر موڑ پر انھیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا جائے، ان کی مساعی کی جہاں تک ممکن ہو تحسین کی جائے۔ پھر عقیدت و تحسین اور اعتراف کے صرف الفاظ ہی زبان سے ادا کرنے کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے جو پہلو ائمہ عظام کی وساطت و سعی سے ہم تک پہنچے ہیں، انھیں اپنی زندگیوں میں سمویا جائے، انھیں مدارس عمل ٹھہرایا جائے اور ان سے ہم آہنگ ہو کر سرحدات کی منزلوں کو طے کیا جائے۔

یہی اہل حدیث کی دعوت ہے اور یہی ان کا طریق عمل ہے۔ جو راہ کتاب و سنت کے مطابق ہے، وہ اہل حدیث کی راہ ہے اور جو اس سے متصادم ہے، وہ ان کی راہ نہیں ہے۔ ان کا انداز تبلیغ اور اسلوب کلام مثبت ہے، منفی نہیں ہے۔ کسی سے لڑنا اور ستم گھا ہونا، خود بھی پریشان ہونا اور دوسروں کو بھی مبتلاے اذیت کرنا قطعاً اہل حدیث کا شیوہ نہیں۔ ان کے نزدیک مثبت انداز ہی وہ انداز ہے، جس سے مسائل کی پیچیدہ گرہیں کھلتی اور پیش آئند مشکلات حل ہوتی ہیں۔ اصلاح احوال کا راز اسی میں مضمر ہے اور اسی سے ذہن کے در پیچے کھلتے اور برائی کے کواڑ بند ہوتے ہیں۔

## ائمہ فقہ اور اہل حدیث

یہاں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اہل حدیث کے قلب و ذہن کا کوئی گوشہ فقہ اور ائمہ فقہ کے متعلق قطعاً غبار آلود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک فقہ و فقہین کی وہ وسعت پذیر مساعی اور گراں مایہ خدمات بہ درجہ غایت قدر و منزلت کی مستحق ہیں جو ائمہ فقہ نے مختلف حالات و ظروف کی روشنی میں اپنے اپنے انداز میں سرانجام دیں۔

وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فراست فقہی، فطانت علمی اور اجتہادی صلاحیتوں کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتے ہیں اور جس نہج سے انھوں نے قصر فقہاہت کو ہم کنار رفعت کیا، وہ ان کی ذہانت اور علم و دانش کی گہرائی و گیرائی کا بین ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اہل حدیث کے مدارس میں ہمیشہ باقاعدہ فقہ حنفی داخل نصاب رہی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس کو اہل حدیث کے ہاں ہر دور میں سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ ایک تسلسل ہے جو ابتدا سے اب تک جاری ہے۔

ان کے نزدیک امام ابوحنیفہ کسی ایک ہی فرقے کی میراث نہیں ہیں، بلکہ ان کا خزانہ علم ہر کتب فکر کے لیے ہر آن دا ہے اور اس سے کسب ضرورتاً چاہیے۔ فروعات میں اظہار اختلاف کے باوجود اہل حدیث فقہ حنفیہ کے متون پر بہت سے علمائے احناف سے زیادہ وسعت نظر رکھتے ہیں۔ جو حضرات امام ابوحنیفہ کی وراثت کے مدعی بنے بیٹھے ہیں، وہ ان کے علم و فضل کو ایک ہی گوشے اور ایک ہی فرقے میں محدود کر رہے ہیں۔ یہ حضرت امام کی توقیر نہیں بلکہ ان کی فیض رسانیوں کے دائرے کی حد بندی کر دینا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ان فقید المثال علمی و فقہی خدمات کو بھی ہم کھلے دل سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں، جن کی بدولت پہلی دفعہ استناد حدیث کے متعدد گوشے نکھر کر سامنے آئے اور فکر و نظر کی طراوت کا باعث بنے۔ یہی وہ گوشے ہیں جنہوں نے فقہ و اصول کے ایک باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کی اور جن سے فقہیات میں کتاب و سنت سے استدلال و استنباط کی راہیں کھلیں۔

اسی طرح اہل حدیث کے نزدیک امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی

خدمات جلیلہ اور مساعی جلیلہ بھی از حد لائق تعریف ہیں کہ انھوں نے حفاظت حدیث اور صیانت سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذمہ داریوں کو بھی بہ طریق احسن پورا کیا اور تعلیم و تدریس کی مساند علیا کو بھی زینت بخشی۔ اس کے ساتھ ان کی عظمت کردار کا یہ پہلو بھی لائق صد افتخار ہے کہ انھوں نے جبر و ملوکیت کی چیرہ دہشیوں کے خلاف ایسی عزیمت و استقلال کا مظاہرہ کیا اور ایسی قربانی اور جرات و جاں بازی کا ثبوت دیا کہ تاریخ اسے ہمیشہ اپنے سینے میں محفوظ رکھے گی اور لوگ اسے بہ طور مثال پیش کرتے رہیں گے۔

### حق و صداقت کسی خاص فقہ میں محدود نہیں

فقہ کی اہمیتوں کو پوری طرح تسلیم کرنے کے باوجود اور ائمہ فقہ کی مساعی و قلموں کو سزاوار مدح و ستائش ٹھہرانے کے باوصف، ہم حق و صداقت کے تمام پہلوؤں کو کسی ایک ہی مدرسہ فقہ میں محدود نہیں مانتے اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہر قسم کے مسائل شرعیہ اور ہر نوع کے امور دینیہ فقط کسی ایک نقطہ فکر کی فقہ میں محصور اور سمٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ حق و صداقت کو تمام مسالک فقہ میں دائر و سائر مانا جائے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے کہ کسی مسئلے میں حق فقہ کے مسالک اربعہ سے باہر بھی جلوہ گر ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔

### فقہ ماخذ شرع نہیں

یہاں یہ یاد رہے کہ فقہ و تشریع کے چار ماخذ ہیں۔

(۱) کتاب اللہ۔

(۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) اجماع۔۔۔ اور

(۴) قیاس۔

مواہک کے نزدیک فقہ و تشریع کا ایک مٹی و ماخذ تعامل الہی مدینہ ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فقہ بجائے خود ماخذ شرع نہیں بلکہ اس کا قصر و شکوہ

جن بنیادوں پر استوار ہے وہ ہیں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس صحیح۔ اگر امام مالک کی رائے کو مان لیا جائے تو تعامل اہل مدینہ بھی اس میں شامل سمجھیے!

سوال یہ ہے کہ شرع کے بنیادی ماخذ (جو علی الترتیب قرآن، سنت، اجماع اور قیاس صحیح یا بقول مالکیہ تعامل اہل مدینہ ہیں) انھیں چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ کیوں اختیار کیا جائے؟

مذکورہ بالا ترتیب کے اعتبار سے ماخذ شرع کی اصل بنیاد کتاب و سنت ہی قرار پاتی ہے اور اسلام کے رخِ زیبا کے نکھار کا بنیادی طور سے اسی پر انحصار ہے۔ اگر عروسِ وقت اپنے آپ کو اس سے مزین کر لے اور روحِ عصر اس کی صداے جاں فزا کو آویزہ گوش بنا لے تو پیش آئند مسائل نہایت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں اور اصلاحِ احوال کے آثار تیزی کے ساتھ نظر و بصر کے زاویوں میں آ جاتے ہیں۔ آئیے کتاب و سنت کے پُر نور دروازے پر دستک دینے کی کوشش کریں اور اپنی زندگیوں کو اس صاف ستھرے قالب میں ڈھالنے کے لیے سماعی ہوں۔ یہی نجات کی اصل راہ ہے اور اسی سے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح وابستہ ہے۔

### اصل ہدف کتاب و سنت

اہل حدیث کے بارے میں یہاں ہم چند مزید باتیں ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے ہیں۔ اس مسلک کے حاملین کو مختلف ناموں سے پکارا اور موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصحاب الحدیث، اہل سنت، سلفی، اثری، برصغیر پاک و ہند کے بعض لوگ ”محمدی“ بھی کہلاتے ہیں۔

”اہل حدیث“ کی مروجہ اصطلاح کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اسلامی شریعت کا بنیادی سرچشمہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی خاص امام کی تقلید سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے اور یہی ان کے نزدیک صحیح ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں صحابہ کرام قرآن و حدیث ہی کو پیمانہ عمل قرار دیتے تھے۔ تابعین اور تبع تابعین کے عمل و قول کا محور بھی یہی تھا۔

قرون اولیٰ سے لے کر اب تک ”اہل حدیث“ کی اصطلاح کا اطلاق ہمیشہ ان لوگوں پر ہوتا رہا ہے جنہوں نے حدیث و سنت کو ہدف عمل ٹھہرایا اور معیار فکر قرار دیا ہے۔ ان کا یہ معمول اور طرہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے ہر دور میں احادیث پیغمبر کی حفاظت کی، ہر موقع پر اس کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دیا اور ہر قسم کے حالات میں سنت کی اتباع اور ارشادات نبوت کو اپنی زندگی کا مقصد اولین قرار دیے رکھا۔ جو پھول چمنستان نبوت سے ملا اسے حرز جاں بنایا اور اس کی مہک کو پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی اور جو چیز مخالف سنت ہے آئی اسے بلا توقف اور بلا خوف لومۃ لائم ترک کر دیا۔

ان کے عقائد و افکار وہی ہیں جو اسلاف سے منقول ہیں۔ اللہ کی توحید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی اتباع ان کا لازمہ حیات ہے۔ صفات الہی کے بارے میں ان کا مسلک اسلاف کے تصورات کا پوری طرح عکاس ہے۔ یہ لوگ شرک خفی اور شرک جلی کو حرام سمجھتے اور بدعت کو ضلالت و گمراہی قرار دیتے ہیں۔ توہمات اور ضعیف الاعتقادی سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء کرام ان کے نزدیک بشر ہیں اور معصوم ہیں اور بشریت ہی میں ان کی افضلیت پنہاں ہے۔ ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے اللہ کے سوا کوئی ہستی معاملات غیبی سے آگاہ نہیں۔ یہ برملا کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وفات پا گئے ہیں۔ ان کی دنیوی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ کوئی نبی اس عالم آب و گل میں حاضر و ناظر نہیں ہے۔ اعراس اور میلاد کی مجلسوں کا انعقاد ان کے نزدیک بدعات میں شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ ائمہ دین کو زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال کیا تھا، علم و عمل سے خوب نوازا تھا اور بہت سے فضائل اور مکارم اخلاق ان کو عطا فرمائے تھے اور ان اوصاف و کمالات کی بنا پر وہ بدرجہ غایت احترام و تکریم کے مستحق تھے اور مستحق ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کے مقابلے میں کسی امام اور کسی عابد و زاہد کی بات کو حجت شرعی نہیں مانا جائے گا۔

ولادت سے لے کر وفات تک انسان جن مراحل سے گزرتا اور سفر حیات کے جن نشیب و فراز کو عبور کرتا ہے، ان سب سے متعلق اہل حدیث نمایاں خصوصیات و امتیازات



کے حامل ہیں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر بھی وہ سنت نبوی کو پیش نگاہ رکھتے ہیں اور ان امور کو مشعل راہ ٹھہراتے ہیں جو احکام پیغمبر سے ہم آہنگ ہیں۔ غمی اور موت کے اندوہناک معاملات میں بھی ان کی نگاہ ارشادات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رہتی ہے۔ جو بات سنت کے مطابق ہے، اسے اپنانا اور جو سنت کے مخالف ہے اسے ترک کرنا ان کا شیوہ زندگی ہے۔

سنت کو مد اعلیٰ ٹھہرانے میں یہ لوگ انتہائی حریص اور رد بدعات میں نہایت بے باک ہیں۔ اس ضمن میں نہ یہ کسی کی مخالفت کی پروا کرتے ہیں اور نہ کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کو ان کے نزدیک کوئی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ہدف صرف عمل بالحدیث اور انکار بدعات ہے۔ تمام رسوم و رواج کو یہ لوگ سنت پیغمبر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شے سنت کی میزان میں پوری اترتی ہے تو اسے فوراً قبول کر لیا جاتا ہے، اور اگر کسی چیز کا کوئی گوشہ سنت سے متصادم ہے تو بلا تامل اس سے اعراض کی راہ اختیار کر لی جاتی ہے۔



## آٹھواں باب

# اہل حدیث اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

برصغیر کی سرزمین علم و ادراک اور فضل و تحقیق کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس کی زرخیز مٹی سے بے شمار اہل قلم اور اصحاب تصنیف پیدا ہوئے جنہوں نے ہر حال اور ہر دور میں علم کی شمع روشن رکھی اور درس و تدریس میں زندگی بسر کی۔ ان کی علمی کاوشوں اور تصنیفی سرگرمیوں کی تفصیلات تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ کئی ایسے خاندان عالم وجود میں آئے جن کے اسلاف و اخلاف کی بے پناہ مساعی اور شب و روز کی نیک و دوسے نہ صرف برصغیر کے لوگوں نے استفادہ کیا بلکہ پوری علمی دنیا میں ان کی شہرت پھیلی اور تمام عالم اسلام ان سے فیض یاب ہوا۔ ان جلیل القدر خاندانوں میں ایک خاندان حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس خاندان کے لائق احترام ارکان نے بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری (۱۷۰۰ء اور ۱۸۰۰ء) میں جو علمی اور عملی کارنامے سرانجام دیے اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

یہاں ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے ان افکار و تصورات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے حدیث و سنت کے متعلق اپنی مختلف تصانیف میں ظاہر فرمائے ہیں۔ لیکن پہلے ان کے نہایت مختصر حالات۔۔۔!

شاہ صاحب کی ولادت:

شاہ صاحب بروز چہار شنبہ بوقت طلوع آفتاب ۳۔ شوال ۱۱۱۳ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۳ء) کو چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے ٹھیک چار سال بعد ۲۸۔ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۷ء) کو عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی مغل حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔

شاہ صاحب کا مولد موضع بھلت ہے، جو ضلع مظفر نگر (بہار) میں ایک گاؤں ہے۔ علمی اعتبار سے اس گاؤں کو کافی عرصے تک شہرت و اہمیت حاصل رہی۔ جس زمانے میں شاہ صاحب نے شعور کی آنکھیں کھولیں، اس زمانے کو سیاسی لحاظ سے ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے عہد زوال سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں نے اس عہد میں بے حد حق کی منزلیں طے کیں اور اصلاح و تجدید کے عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، اسی زمانے (۱۱۱۵ھ-۱۱۴۰ھ) میں اسلام کے دور جدید کے دوسرے عظیم مصلح اور مجدد ملت حضرت شیخ محمد بن عبد الوہاب کا ظہور سرزمین نجد میں ہوا۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

### شیخ محمد بن عبد الوہاب اور شاہ ولی اللہ

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس عہد میں ارض ہند کے شاہ ولی اللہ مدینہ منورہ میں طلب علم کی منزلیں طے کر رہے تھے، اسی عہد میں سرزمین نجد کے شیخ محمد بن عبد الوہاب مدینہ طیبہ کے رفیع المرتبت اساتذہ سے تحصیل علم میں مشغول تھے، یعنی مستقبل کے یہ دونوں مجدد اور عظیم مصلح ایک ہی عہد اور ایک ہی وقت میں دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں علمی اور روحانی تربیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دونوں مجددین ملت کو ایک ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نجد اور ہندوستان مسافت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور تھے، لیکن ان دونوں ملکوں کی علمی، عملی، دینی اور سیاسی فضا بالکل ایک سی تھی، اس لیے دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ہی انداز سے اپنی تجدیدی مساعی کا آغاز کیا اور ایک ہی اسلوب سے اپنی سرگرمیوں کی رفتار کو آگے بڑھایا۔ پھر دونوں کو اپنی تبلیغی تک و تاہ کی راہوں میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی ایک ہی قسم کی تھیں۔

## شاہ صاحب کا کاروان حیات

شاہ صاحب جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ۱۴ شوال ۱۱۳۲ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے اور اورنگ زیب عالم گیر نے ۲۸۔ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۷ء) کو وفات پائی۔ یعنی انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال پہلے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا اور ان کا کاروان حیات نومغل بادشاہوں کے عہد سے گزرا جو بہ ترتیب حکمرانی حسب ذیل ہیں۔

(۱) محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر۔ (وفات ۲۱۔ فروری ۱۷۰۷ء)

(۲) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول: (وفات ۱۸۔ فروری ۱۷۱۲ء)

(۳) معز الدین جہاں دار شاہ۔ (قتل ۱۰۔ جنوری ۱۷۱۳ء)

(۴) فرخ سیر۔ (قتل ۱۷۔ فروری ۱۷۱۹ء)

(۵) رفیع الدرجات۔ (وفات ۲۷۔ مئی ۱۷۱۹ء)

(۶) رفیع الدولہ۔ (وفات ۲۷۔ اگست ۱۷۱۹ء)

(۷) محمد شاہ معروف بہ رگھو۔ (وفات ۱۶۔ اپریل ۱۷۲۸ء)

(۸) ابراہیم شاہ صرف ایک ماہ آٹھ دن حکومت کی۔

(۹) ابوالنصر احمد شاہ۔ (وفات ۳۱۔ دسمبر ۱۷۷۷ء)

اس طویل عہد میں ہندوستان جن بیہت ناک واقعات اور خوں ریز حوادث سے دوچار ہوا، وہ برصغیر کی تاریخ حکمرانی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے حد ذہنی اذیت اور قلبی کوفت کا باعث ہیں۔ اس مدت میں یہ پورا خطہ ارض مختلف فتنوں اور مسلسل صدمات کی زد میں رہا۔ مرہٹوں کی بے پناہ سرکشی، سکھوں کے خون آشام مظالم، نادر شاہ کا قتل عام، سادات بارہ کا تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کی گرفتاری اور پھر اس کی انتہائی بے بسی کی موت، ملک کی سیاست میں روہیلوں کی شرکت، دربار شاہی کے ایرانی و تورانی امرا کی باہمی

کش کش، ارض ہند پر احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملے، مغربی طاقتوں کی ملکی سیاست میں بہ تدریج مداخلت، بنگال میں انگریزوں کا اقتدار اور مدراس کے بعض علاقوں پر ان کی حکومت کا قیام یہ وہ واقعات تھے جو تقریباً سب کے سب شاہ صاحب کی نظروں کے سامنے نمودار ہوئے۔ شاہ صاحب ان تمام واقعات سے بہ درجہ غایت متاثر اور انتہائی مغموم تھے۔

ہم یہاں واقعات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، اختصار کے ساتھ یوں لکھیے کہ اس وقت سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقتدار لب بام آچکا تھا، قدیم مسلم معاشرے کی توانائیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ پرانے سیاسی نظام کا قصر رفیع جو کم و بیش دو سو سال سے مغل حکمرانوں کے لیے مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، انہدام پذیر ہو چکا تھا، ہر شعبہ حیات میں زوال اور ہر گوشہ زندگی میں انحطاط کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ لوگوں کی دینی حالت اور اخلاقی اقدار میں بھی کوئی استحکام نہ رہا تھا۔ ہر طرف طائف المملوک، ہر جانب ابتری اور ہر سو نظمی پھیلی ہوئی تھی۔

دہلی کے لال قلعے کا وہ جھنڈا جو شاہ جہان اور عالم گیر کے دور حکومت میں کابل سے لے کر اس کماری تک مغل حکومت کی عظمت کا نشان تھا، سرنگوں ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے کتاب و سنت سے انحراف اور دین سے اغماض کی راہیں اختیار کر لی تھیں۔

یہ تھے نہایت اختصار کے ساتھ وہ حالات جو شاہ صاحب کے دور میں پیدا ہو چکے تھے اور جن سے ان کا کاروان زندگی گزر رہا تھا۔ ان حالات میں انھوں نے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تصنیف و تالیف کو بھی مرکز عمل قرار دیا۔

### کتاب و سنت کی راہ

مصنف کی حیثیت سے ان کا شمار معمرۃ ارض کے جلیل القدر مصنفین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور ان کو کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر گام زن ہونے کی تلقین فرمائی، اور یہی ان کے نزدیک فلاح اور کامیابی کی راہ ہے۔ چنانچہ وہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔

وصیت اول اس فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بہ تدبیر

ہر دو مشغول شدن ہر روز حصہ از ہر دو خواندن۔ واگر طاقت خواندن نہ دارد ترجمہ ورتے از ہر دو شنیدن۔ ودر عقاید مذہب خدمات اہل سنت اختیار کردن واز تفصیل آنچہ سلف تفتیش نہ کردہ اند، اعراض نمودن، و بہ تشکیکات معقولیان خام التفات نہ کردن۔ ودر فروغ پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن و دائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن، آنچہ موافق باشند در چیز قبول آوردن الا ”کالائے بدبریش خاوند“ دادن۔ امت را بیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنائیمست، وخن متعطفہ فقہا کہ تقلید عالے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نہ شنیدن و نظر بہ ایثاں التفات نہ کردن، و قربت خدا بہ دوستی بہ دوری ایثاں۔

یعنی اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت (قرآن و حدیث) سے تمسک کیا جائے اور ان کے تدبر میں برابر مشغول رہا جائے اور دونوں کو روزانہ بالالتزام پڑھا جائے۔ اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے شخص سے دونوں کے کسی ورق کا ترجمہ ہی سن لیا کرے۔ عقاید میں قدمائے اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے اسلاف کرام نے جس چیز کی کھود کر پید نہیں کی اس کے پیچھے نہ پڑا جائے فروغ فقہ میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث و فقہ میں جامعیت رکھتے ہیں۔ فقہی مسائل کو لازماً کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے جو بات اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ ”کالائے بدبریش خاوند“ والا معاملہ کیا جائے (یعنی اسے نظر انداز کر دیا جائے) یہ یاد رہنا چاہیے کہ امت ”مجتہدات فقہا“ کو کتاب و سنت کی بنیاد پر جانچنے سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ وہ متعطف فقہا جو کسی عالم کی بات کو دستاویز قرار دے کر اس کی تقلید کرتے ہیں اور سنت کی پیروی سے دور ہٹ گئے ہیں ان کی بات نہ سنی جائے اور نہ انھیں قابل التفات گردانا جائے بلکہ ان سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی خوش نودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

## شاہ صاحب کی عدم تقلید

شاہ صاحب مقلد تھے یا غیر مقلد اور یہ کہ تقلید کے بارے میں ان کا کیا نقطہ فکر تھا؟ اس پر تفصیلی بحث تو آگے آئے گی، یہاں ہم صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شاہ صاحب کسی ایک امام فقہ یا مجتہد کے مقلد نہ تھے۔ وہ اسی بات پر عمل کرتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سے ہم آہنگ ہوتی، اس ضمن میں وہ احناف یا شوافع میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

ونحن نأخذ من الفروع ما اتفق عليه العلماء لاسيما هاتان  
الفرقتان العظيمتان الحنفية والشافعية وخصوصا في الطهارة  
والصلوة فان لم يتيسرا لاتفاق واختلفوا فناءخذ بما يشهد له  
ظاهر الحديث ومعروفه. <sup>(۱)</sup>

(ہم فروع میں ان مسائل پر عمل کرتے ہیں، جن پر علما کا اتفاق ہو، خصوصیت سے جن پر اہل سنت کی دو بڑی جماعتیں حنفی اور شافعی متفق ہوں۔ طہارت اور نماز سے متعلق مسائل میں ہم خاص طور سے اس کا التزام کرتے ہیں۔ اگر کسی بات پر ان دو بڑی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو تو ہم مسائل طواہر حدیث کے موافق ہوں، ان کو مدار عمل ٹھہراتے ہیں۔)

## نواصول:

شاہ صاحب نے مختلف محدثین کے (جن میں عبدالرحمن بن مہدی، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون، اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل، علی بن ابی بکر بن ابوشیبہ وغیرہ مشاہیر و اکابر اہل حدیث شامل ہیں) مسائل و معاملات پر عمل کرنے کے بارے میں کچھ بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں، جن کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے۔ تعداد میں یہ نواصول بنتے ہیں، جنہیں اہل حدیث مسائل و معاملات میں پیش نگاہ

رکھتے تھے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اگر کوئی حکم قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہو تو اہل حدیث کے نزدیک اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسری طرف ملتفت ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ اگر حکم قرآنی میں تاویل کی گنجائش ہو اور مختلف مفہوم پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا اور قرآن کے اسی مفہوم کو صحیح قرار دیا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

۳۔ اگر کسی حکم کے بارے میں قرآن خاموش ہے تو سنت پر عمل کیا جائے گا۔ وہ سنت تمام فقہاء میں متعارف و معلوم ہو یا کسی خاص شہر خاص علاقے اور خاندان سے مروی ہو۔ کسی نے اسے معمول بہا قرار دیا ہو یا نہ دیا ہو ائمہ حدیث کے نزدیک اس سنت کو قابل حجت اور لائق استناد گردانا جائے گا۔

۴۔ کسی مسئلے کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی مجتہد اور امام کے قول کو ہرگز اہمیت نہیں دی جائے گی، نہ کوئی اثر لائق التفات ہوگا۔

۵۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کسی مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کرام کے ارشادات اور تابعین کے اقوال کو قابل عمل ٹھہرایا جائے گا اور اس میں کسی شہر کسی علاقے یا خاندان کی قید یا تخصیص نہیں ہوگی۔

۶۔ اگر کوئی مسئلہ قرآن یا حدیث میں نہ ہو اور جمہور فقہاء اس کے متعلق متفق ہوں تو ان کے اتفاق کو عمل کے لیے کافی سمجھا جائے گا۔

۷۔ اگر فقہاء کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو تو ان فقہاء کا قول قبول کیا جائے گا جو تقویٰ اور ضبط و حفظ میں زیادہ اچھی شہرت رکھتے ہوں یا وہ قول قابل قبول ہوگا جو زیادہ مشہور ہو۔

۸۔ اگر علم و فضل و ورع و تقویٰ اور ضبط و حفظ میں تمام فقہاء ایک سے ہوں اور زیر بحث



مسئلے میں مختلف ائمہ سے متعدد اقوال منقول ہوں تو جس امام کے قول پر مناسب سمجھیں عمل کر لیا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۹۔ اگر اس میں بھی اطمینان بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن و سنت کے عمومی اقتضا اور ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کو دیکھا جائے گا۔ پھر اس کی روشنی میں حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اس میں اصول فقہ کے مروج و مشہور قواعد پر اعتماد نہیں کیا جائے گا بلکہ اطمینان قلب اور ضمیر کے سکون کو قابل اعتماد گردانا جائے گا۔<sup>(۱)</sup>

اہل حدیث کے یہ وہ اصول ہیں جن کو بیان کرنے سے پہلے شاہ صاحب نے فرمایا:  
انا ابینھا لک فی کلمات یسیرۃ<sup>(۲)</sup>

(میں تمہارے لیے یہ اصول آسان اور مختصر پیرایہ اظہار میں بیان کرتا ہوں۔)  
اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب تقلید کے قائل نہیں ہیں اور مسائل میں کتاب و سنت کو ہر حال میں مقدم رکھنے کے حامی ہیں اور اس ضمن میں ان کا رویہ نہایت سخت ہے۔ ان کے نزدیک ائمہ سلف اور مجتہدین فقہ کے قول و عمل کا درجہ کتاب و سنت سے بہت بعد میں آتا ہے۔ وہ شرعی معاملات میں کسی کی آراء و افکار اور تقلید کے جمود و تقید سے ذہنوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

### استنباط مسائل کے دو طریقے

شاہ صاحب کے نزدیک اہل سنت دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقے کو وہ ”اہل حدیث“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ایک کو ”اہل رائے“ کے نام سے۔۔۔! اہل حدیث کے طریق عمل کو وہ اہل رائے پر ترجیح دیتے اور زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ مصنفی (شرح موطا) میں تحریر فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ بردو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع می کردند و از اہل استنباط می نمودند و ایں طریقہ اصل راہ محدثین

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۹۔ ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۹۔

است۔ و دیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح و تہذیب آں کردہ اند یاد گیرند بے ملاحظہ  
ماخذ آں ہا۔ پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد جواب آن از ہم قواعد طلب می کردند و اس طریقہ  
اصل راہ فقہا است و غالب بر سلف طریقہ اولی بود و بعض آ خر طریقہ ثانیہ۔ (۱)

(یاد رکھنا چاہیے کہ سلف میں فتاویٰ اور مسائل میں استنباط کے دو طریقے مروج  
تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ جمع کرتے تھے اور انھیں بنیاد  
قراردے کر پیش آئند مسائل پر غور کرتے تھے۔ یہ محدثین کا طریقہ ہے۔۔۔ دوسرا  
طریقہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقح و مہذب کیے ہوئے قواعد کلیہ کی روشنی میں پیش آنے  
والے مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور اصل ماخذ کو لائق اعتنا قرار دینے کو ضروری نہ سمجھا  
جائے۔ یہ فقہا کا طریقہ ہے۔ سلف کا بہت بڑا طبقہ پہلے طریقے کا پابند ہے اور ایک طبقہ  
دوسرے طریق عمل کا۔۔۔!)

اب مندرجہ ذیل سطور میں چند وہ مسائل بیان کیے جاتے ہیں جن میں اہل  
حدیث اور احناف کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب ان مسائل کے  
بارے میں اہل حدیث کی تائید کرتے ہیں اور اس سلسلے میں احادیث پر عمل کرنے کی  
تاکید فرماتے ہیں۔

### امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ

ان مسائل کے ضمن میں سب سے پہلے امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ کو لیجیے، یہ اہل  
حدیث اور احناف کے درمیان مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ اہل حدیث فاتحہ خلف الامام کو  
ضروری قرار دیتے ہیں جب کہ حضرات احناف سورہ فاتحہ نہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں۔ شاہ  
صاحب اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

وان كان ماموماً وجب عليه الانصات والاستماع فان  
جهر الامام لم يقرأ الا عند اسكاته وان خافت فله الخير فان قرأ  
فليقرأ الفاتحة قراءة لا يشوش على الامام وهذا أولى الاقوال

عندی، وہ یجمع بین احادیث الباب۔ (۱)  
 (مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے، اگر امام اونچی آواز سے  
 پڑھے تو مقتدی سکتوں میں پڑھے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی کو  
 اختیار ہے، جس طرح چاہے پڑھے۔ لیکن سورہ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ امام  
 کی قرأت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔۔۔ میرے نزدیک یہ نقطہ نظر اولیٰ  
 ہے اور اس مسئلے کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ان میں توافق و تطابق کی یہ  
 صحیح صورت ہے۔)

### رفع یدین

حضرات احناف نماز میں رفع یدین کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کی  
 تحقیق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے کی احادیث ”اکثر“ اور ”اشتب“ ہیں۔ اسی طرح وہ  
 وتر کی ایک رکعت کو بھی ”سنت“ قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف کے نزدیک وتر کی تین  
 رکعتیں ہیں، ایک نہیں۔ لیکن شاہ صاحب ان مسائل میں جھگڑا پسند نہیں کرتے۔ وہ  
 فرماتے ہیں:

والحق عندی فی مثل ذالک ان کل سنة ونظیره الوتر برکعة  
 واحدة او بثلاث. والذی یرفع احب الی ممن لا یرفع، فان  
 احادیث الرفع اکثر واثبت، غیر انه لا ینبغی لانسان فی مثل هذه  
 الصور ان یتیر علی نفسه فتنة عوام بلده۔ (۲)

(میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔  
 یہی معاملہ ایک رکعت یا تین رکعت وتر پڑھنے کا ہے۔ رفع یدین کرنے والا  
 میرے نزدیک نہ کرنے والے سے بہتر ہے، کیوں کہ رفع یدین کی احادیث  
 تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن انسان کو چاہیے کہ اس قسم  
 کے مسائل میں اپنے شہر کے لوگوں کو اپنے خلاف ہنگامہ بپا کرنے کا موقع نہ

۱۔ حجة اللہ بالادعج ۲ ص ۹۔ ۲۔ حجة اللہ بالادعج ۲ ص ۱۰۔

(دے۔)

وتر پڑھنا سنت ہے

فقہائے احناف وتر کو واجب قرار دیتے ہیں اور اہل حدیث اسے سنت ٹھہراتے ہیں۔ شاہ صاحب بھی اس ضمن میں اہل حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

والحق ان الترسنة هو اوكد السنن، بينه على وابن عمرو عبادة

بن الصامت رضى الله عنهم<sup>(۱)</sup>

(صحیح مسئلہ یہ ہے کہ وتر سنت موکدہ ہے۔ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور انھوں نے واضح طور سے اسے سنت موکدہ فرمایا ہے)

جمع بین الصلواتین

کسی عذر کی بنا پر جمع بین الصلواتین (یعنی دو نمازیں جمع کرنے) کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہائے حنفیہ نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں نہ جمع تاخیر کے لیکن اہل حدیث کی طرح شاہ صاحب جمع تقدیم کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جمع تاخیر کو بھی تحریر فرماتے ہیں۔

ومنها الجمع بين الظهر والعصر والمغرب والعشاء.<sup>(۲)</sup>

(ایک مسئلہ نماز ظہر اور نماز عصر کو اور نماز مغرب اور نماز عشاء کو جمع کر کے پڑھنے

کا ہے جو فقہائے احناف اور محدثین کے درمیان باعث اختلاف ہے)

فشرع لهم جمع التقديم والتأخير لكنه لم يواظب عليه ولم يعزم

عليه مثل ما فعل في القصر.<sup>(۳)</sup>

(اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کی اجازت دی

۳۔ ایضاً۔

۲۔ ایضاً ص ۲۳۔

۱۔ حجة الله بالآخ ۲ ص ۱۷۔

ہے، لیکن نہ اس پر بیٹگی کا حکم دیا اور نہ اس کی اس طرح تاکید فرمائی، جس طرح کہ سفر میں نماز قصر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔)

دیہات میں جمعہ پڑھنے کا مسئلہ

جمعة القرئی یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ علمائے احناف اور اہل حدیث کے درمیان یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ علمائے احناف دیہات میں جمعے کے قائل نہیں ہیں؛ جب کہ حدیث کی روشنی میں اہل حدیث کے نزدیک دیہات میں جمعہ پڑھنا ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بھی دیہات میں جمعے کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الجمعة واجبة على كل قرية. (۱)

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جمعہ ہر گاؤں میں پڑھنا واجب ہے)

اس سے آگے فرماتے ہیں۔

ومن تخلف عنها فهو لآثم. (۲)

(اور جو شخص جمعہ ترک کر دے وہ گناہ گار ہے۔)

دیہات میں فرضیت جمعہ کے مسئلے میں شاہ صاحب اہل حدیث کے موید ہیں۔

تکبیرات عمیدین کی تعداد

عمیدین کی تکبیرات میں فقہائے حنفیہ اور اہل حدیث کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اہل حدیث کا مسلک اس باب میں وہی ہے جو اہل حرمین (ساکنان مکہ اور باشندگان مدینہ) کا ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہی جائیں اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد خطبہ دیا جائے۔ شاہ صاحب بھی اسی طریق عمل کو ترجیح

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

یکبر فی الاولى سبعا قبل القراءة وفی الثانی خمساً قبل القراءة و  
عمل الکوفیین ان یکبر اربعا کتکبیر الجنائز فی الاولى قبل  
القراءة وفی الثانیۃ بعدھا وھما سستان وعمل الحرمین ارجع ثم  
ینخطب یامر بتقوی اللہ ویعظ ویذکر۔<sup>(۱)</sup>

(پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری میں قراءت  
سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں (یہ عمل اہل حرین کا ہے) لیکن اہل کوفہ کا  
عمل یہ ہے کہ تکبیرات جنازہ کی طرح پہلی رکعت میں قراءت سے قبل چار  
تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں قراءت کے بعد کہی جائیں۔ اگرچہ یہ  
دونوں طریقے مسنون ہیں، لیکن اہل حرین کا عمل زیادہ رائج اور قابل حجت  
ہے۔ دو رکعتیں پڑھنے کے بعد خطیب خطبہ دے، جس میں اللہ کا تقویٰ  
اعتبار کرنے کی تلقین اور وعظ و نصیحت کی جائے۔)

ماء کثیر اور قلین کے بارے میں شاہ صاحب کا مسلک

فقہائے حنفیہ اور فقہائے شافعیہ میں اس مسئلے سے متعلق سخت اختلاف ہے کہ ”ماء  
کثیر“ کیا ہے اور پانی کتنی مقدار میں ہو تو نجس ہو جاتا ہے اور کتنی مقدار میں ہو تو نجاست  
سے آلودہ نہیں ہوتا۔ شوافع کا مسلک اس ضمن میں یہ ہے کہ پانی ”قلین“ ہو تو نجاست  
سے محفوظ رہتا ہے اور احناف ”عشر فی العشر“ (یعنی دہ در دہ) کی مقدار کے پانی کو نجاست  
کی آلودگی سے مبرا گردانتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر کنوئیں میں کتا، بلی، چوہا وغیرہ گر جائے تو  
احناف کے نزدیک پانی کے ڈولوں کی ایک خاص تعداد مقرر ہے، جن کا کنوئیں سے نکالنا  
واجب ہے اگر اس تعداد میں ڈول نہ نکالے جائیں تو پانی نجس ہی رہتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلے کو بھی موضوع بحث  
ٹھہرایا ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ کنوئیں میں جانوروں کے مرنے سے پانی کی نجاست اور

طہارت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اقدس یا آپ کی حدیث مبارکہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بحث کو فقہانے خواہ مخواہ طول دیا ہے۔

وقد اطال القوم فی فروع موت الحيوان في البئر، والعشر في  
العشر، والماء الجاري وليس في كل ذلك حديث عن النبي  
صلى الله عليه وسلم. البته. (۱)  
(کنوئیں میں مختلف قسم کے حیوانات (کتا، بلی، چوہا وغیرہ) کے مرنے اور وہ  
دردہ اور ماء جاری سے متعلق مسائل میں فقہانے جو طویل بحثیں کی ہیں، ان  
میں سے کسی مسئلے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعاً کوئی  
حدیث مروی نہیں ہے۔)  
اس سے آگے شاہ صاحب رقم فرماتے ہیں۔

وبالجملة فليس في هذا الباب شئ يعتد به ويجب العمل عليه  
وحديث القلتين اثبت من ذلك كله بغير شبه. (۲)  
(بات یہ ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے قابل  
اعتماد اور واجب العمل گردانا جائے۔ البتہ قلتین والی حدیث بلاشبہ زیادہ صحیح  
اور ثابت ہے۔)

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب ہر مسئلے میں کتاب و  
سنت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں، خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین  
فرماتے ہیں۔ اگر کوئی بات کتاب و سنت میں موجود نہ ہو تو کبار صحابہ و خلفاء کے عمل کو دیکھتے  
ہیں، اس کے بعد ائمہ فقہ میں سے جس امام کے قول کو سنت رسول سے اقرب یا اوفق پاتے  
ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں اور پھر سب کو تاکید فرماتے ہیں کہ اسی کو معمول بہا ٹھہرایا جائے۔  
وہ حق کو کسی ایک ہی امام فقہ یا مجتہد کے قول و عمل میں منحصر نہیں سمجھتے۔

۱۔ حجة الله البالغ ص ۱۸۵۔ ۲۔ ایضاً۔

## اصل راہ۔۔۔ کتاب وسنت

ان کا انداز بیان طرز استدلال اور اسلوب تحریر اس ضمن میں بالکل صاف ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی الجھن ہے اور نہ کسی نوع کی پیچیدگی۔ ان کے نزدیک مسائل پر غور کرنے اور عمل پیرا ہونے کی اصل راہ وہ ہے جس کی نشان دہی کتاب وسنت نے کی ہے، تقلید و تقلید کی راہ کو اصل راہ نہیں گردانا جاسکتا۔ اس ضمن میں اصحاب فکر اور اہل نظر کے لیے ان کا لہجہ بڑا سخت ہے جس کا اندازہ تفہیمات الہیہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

خضتم كالخوض فى استحسانات الفقهاء من قبلكم وتفرعاً  
تھم۔ اماتعرفون ان الحكم حكم الله ورسوله ورب انسان منكم  
يلفغه حديث من احاديث نبيكم به، ويقول انما عملي على  
مذهب فلان لا على الحديث ثم اختال بان فهم الحديث  
والقضاء به من شان الكمل المهرة وان ائمة لم يكونوا ممن  
يخفى عليهم هذا الحديث فماتركوه الالوجه ظهر لهم فى الدين  
من نسخ او امر جو حية. (۱)

(تم نے پوری طرح اپنے سے پہلے کے فقہاء کے استحسانات اور تفرعات کو  
مدار عمل اور مرکز توجہ ٹھہرا رکھا ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ درحقیقت حکم صرف  
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔ تم میں سے بہت  
سے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پہنچ جاتی ہے، لیکن وہ کہتے  
ہیں کہ ہم تو فلاں امام کے مذہب پر عمل کرنے کے پابند ہیں، حدیث پر عمل  
کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ حدیث کو  
سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو حدیث میں پوری مہارت  
رکھتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق مرتبہ کمال پر فائز ہیں۔ ائمہ کرام سے  
کوئی بات مخفی نہ تھی، انھیں اس حدیث کا ضرور علم ہوگا۔ انھوں نے اس پر عمل



نہیں کیا اور اسے ترک کر دیا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ یہ حدیث منسوخ ہوگئی ہے یا یہ ہوگی کہ یہ مرجوح ہے۔ اگر ان میں سے کوئی وجہ نہ ہوتی تو وہ ضرور اس پر عمل کرتے۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ان حضرات سے شدید ذہنی اذیت اور فکری کوفت محسوس کرتے ہیں، جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کو ترک کر کے برہنہ تقلید اپنے ائمہ فقہ کے اقوال کے تتبع کا عزم کر رکھا ہے۔

چند الفاظ ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے بارے میں

شاہ صاحب کثیر التصانیف عالم تھے، ان کی ایک تصنیف ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے متعدد اقتباسات گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ ان کی نہایت مہتمم بالشان کتاب ہے۔ حضرت نواب صدیق حسن خان اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار در راں کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمود، تا آں کہ در فن خود غیر مسبوق الیہ واقع شدہ و مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت از پیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیف بہ وجود نیامدہ، و من جملہ تصانیف مولفش مرضی بودہ است، و فی الواقع بیش از اں است کہ وصفش تو اں نوشت۔<sup>(۱)</sup>

(یعنی اگرچہ یہ کتاب علم حدیث کے متعلق نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سی احادیث کی شرح کر دی گئی ہے اور ان میں جو فلسفہ اور اسرار و حکمت پنہاں ہے، اسے اس منہج سے معرض بیان میں لایا گیا ہے کہ اپنے موضوع میں یہ منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے، اس سے قبل کوئی کتاب اس اسلوب سے نہیں لکھی گئی۔ یہاں تک کہ اسلام کے گزشتہ بارہ سو سال کے عرصے میں علمائے عرب و عجم میں کوئی شخص اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کر سکا۔ اس کے مصنف شہیر کی تصانیف میں یہ عمدہ ترین تصنیف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب

بے بہا معلومات پر مشتمل ہے، لہذا اس کی توصیف کے تمام پہلوؤں کو محیطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔)

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز کتاب میں حضرت مصنف نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس میں کتاب تصنیف کرنے کی وجہ بیان کی ہے، نیز طبقات محدثین اور علم حدیث کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

### خدمت حدیث

شاہ صاحب نے اپنے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی بے حد خدمت کی ہے۔ انھوں نے حجاز مقدس میں اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ تکمیل علم کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے اور اس علم کو خاص طور سے مرکز التفات ٹھہرایا۔

اس کی نشر و اشاعت کے لیے انھوں نے تحریری خدمت بھی انجام دی اور تدریسی بھی۔ تحریری خدمت یہ ہے کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ یہ حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے، اس کے اسلوب سے شاہ صاحب نہایت متاثر تھے۔ ”وصیت نامہ“ میں لکھتے ہیں کہ طالب علم کو جب عربی زبان میں قدرت حاصل ہو جائے تو اسے موطا امام مالک لازماً پڑھانا چاہیے۔ یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے طالب علم بے شمار علمی فیوض سے بہرہ اندوز ہو جاتا ہے۔

بعض حیثیتوں سے شاہ صاحب موطا امام مالک کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے موطا کی دو شرحیں سپرد قلم کیں۔ ایک فارسی میں اور دوسری عربی میں۔ فارسی شرح کو ”مصطفیٰ“ کے نام سے موسوم کیا اور عربی شرح کا نام ”مسوی“ رکھا۔ ان کے زمانے میں یہ دونوں زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں، اس لیے انھوں نے ان دونوں زبانوں کے ذریعے اس کتاب کے مضامین و مندرجات سے اہل علم کو متعارف کرایا۔

مسوی اور مصطفیٰ کے علاوہ انھوں نے شرح تراجم ابواب صحیح البخاری کے نام سے ایک

کتاب تصنیف کی جس میں بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ عوام میں اشاعت حدیث کے لیے بھی انھوں نے مختصر مگر بعض اہم کتابیں لکھیں، جن میں چہل حدیث، النوادر من الحدیث اور الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم خاص اہمیت کی کتابیں ہیں۔

### خدمت قرآن

شاہ صاحب کی بوقلموں خدمات دینیہ میں ایک رفیع المرتبت خدمت، قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ان کے زمانے میں برصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور مدارس میں زیادہ تر اسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن قرآن مجید کا فارسی زبان میں کوئی ترجمہ متداول نہ تھا۔ اس سے قبل قاضی شہاب الدین دولت آبادی (وفات ۸۳۶) نے سلاطین جون پور کے ابتدائی عہد میں ”بحر مواج“ کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر سپرد قلم کی تھی، جس میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ بھی درج تھا، لیکن یہ پورے قرآن کا ترجمہ نہ تھا، قرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تھا، اس لیے اسے شہرت و قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ شیخ سعدی کی طرف بھی قرآن مجید کا ایک فارسی ترجمہ منسوب کیا جاتا ہے، لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ترجمہ انہی کا ہے اور پھر یہ ترجمہ اہل علم میں کبھی مروج نہیں ہوا۔

شاہ صاحب برصغیر کے اولیس عالم دین ہیں، جنھوں نے شروع سے آخر تک پورے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس سے قبل قرآن مجید حفظ تو کیا جاتا تھا، اس کی تفسیریں بھی لکھی گئیں، لیکن اس کے الفاظ کے معانی کو سمجھنے کے لیے سر زمین ہند میں فارسی ترجمہ شاہ صاحب نے کیا اور اس ترجمے نے بڑی شہرت پائی۔

اس ترجمے کی مزید تفصیل ان شاء اللہ راقم کی کتاب ”برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن“ میں بیان ہوگی۔ شاہ صاحب نے باسٹھ سال کی عمر پا کر ہفتے کے روز ظہر کے وقت محرم کی آخری تاریخ ۶۱۷ھ (۲۱ اگست ۱۷۷۲ء) کو دہلی میں وفات پائی۔



## نواں باب

# اہل حدیث کے فکر و عمل کے مختلف پہلو

جب کسی شخص کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہے تو کسی طرف سے اس پر کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح جب کسی کو مالکی، شافعی یا حنبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے تو اسے بھی کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں سمجھا جاتا، صرف یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کہ یہ حضرات فقہی اعتبار سے ایک خاص نقطہ نظر کے حامل اور ایک خاص کتب فکر کے پیرو ہیں اور مسائل کے استنباط و استدلال میں دینی لحاظ سے ایک متعین فرقے سے ان کا تعلق ہے۔ لیکن اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص کے متعلق جب یہ پتا چلا کہ یہ اہل حدیث ہے تو اکثر لوگوں کے قلب و ذہن کی کیفیت بالکل بدل گئی، دماغ میں عصبیت و عناد کی ایک غیر معمولی لہر اٹھنے لگی اور نظر و بصر کے دائروں میں آتش غضب بھڑک اٹھی۔

یہ حالت صرف عوام ہی کی نہیں ہے، بڑے بڑے اصحاب دعوت و ارشاد اور ارباب علم و مسند کو دیکھا گیا ہے کہ ادھر اہل حدیث کا لفظ ان کے کان میں پڑا، ادھر قلم حرکت میں آ گیا، زبان کی رفتار تیز ہو گئی اور الزامات و تنقیدات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جو منہ میں آیا کہہ ڈالا اور جودل میں آیا اگل دیا۔ کیا بات غلط ہے اور کیا صحیح ہے یہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس قلم ہے کہ سطح قرطاس پر بے محابا دوڑ رہا ہے اور زبان ہے کہ حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچنے بغیر تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔

کبھی اہل حدیث کہلانے والوں کو ظاہریت کی طرف منسوب کیا گیا، کبھی یہ فرمایا گیا کہ یہ لوگ صرف الفاظ و حروف کی سرحدوں میں بند ہیں، ذوق و معنی کی وسعتوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ کبھی ائمہ اربعہ کے نافرمان کہہ کر دل کو تسلی دی گئی، کبھی اولیائے کرام

اور بزرگان دین کے منکر کا طعنہ دے کر جی کی بھڑاس نکالی گئی۔ کبھی نعوذ باللہ گستاخ رسول کا الزام عائد کیا گیا۔

حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ اہل حدیث ائمہ اربعہ کی جلالت قدر کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتے ہیں، مختلف مسائل میں ان کی علمی و فقہی کاوشوں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی تحریروں میں جا بجا ان کے حوالے دیتے اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے مقلد نہیں ہیں، پیش آئند مسائل میں آخری فیصلہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مانتے ہیں۔

بزرگان دین اور اولیائے کرام کی پاکیزہ زندگی، ان کے بلند ترین کردار، ان کے طریق تفہیم اور نصح تبلیغ کو بھی اہل حدیث انتہائی لائق تکریم گردانتے اور ان کی دینی خدمات کو بے درجہ غایت اہمیت دیتے ہیں۔ اپنی تصنیفات میں ان کا تذکرہ کرتے اور اپنے مواعظ میں لوگوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ان کی تقویٰ شعاری، خشیت الہی اور جذبہ اطاعت رسول کو اپنی زندگیوں میں جذب کیا جائے۔

بد نصیب ہیں وہ لوگ جو ائمہ اربعہ اور ائمہ حدیث و فقہ کو نشانہ طعن بناتے اور ان کی مساعی جیلہ کو ہدف اعتراض ٹھہراتے ہیں۔ محروم القسمت ہے وہ گروہ جو اولیاء اللہ کا احترام نہیں کرتا اور ان کی بے لوث خدمات کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔۔۔ اہل حدیث نے اس قسم کی حرکت نہ کبھی کی ہے اور نہ کر سکتے ہیں۔ یاد رہے حدیث پر عمل کرنے والا کوئی شخص ہرگز کسی بزرگ یا امام کی تنقیص نہیں کر سکتا۔

اہل حدیث پر ایک نہایت بے جان اور گھٹیا الزام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی کا عائد کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مکرم ہی تو ہے جسے اہل حدیث کے نزدیک مرکز محبت اور منبع الفت کی حیثیت حاصل ہے اور جس کی ہر ادا، ہر قول اور ہر عمل کی اطاعت ان کا اولیں فریضہ ہے، جس مقدس ہستی کے کردار و گفتار کے ہر گوشے اور شوشے کی فرماں برداری ان کا لازمہ حیات ہے، اس سے گریز کی راہ تلاش کرنا، آپ کے فرمان کے کسی بھی حصے سے روگرداں ہونا اور اس کے مقابلے میں کسی امام فقہ کے قول و

فعل کا سہارا لینا اہل حدیث کے نقطہ نگاہ سے قطعاً غلط ہے۔ آپ کے طریق عمل اور آپ کی کسی سنت کو کوئی چھوٹی قرار دے یا بڑی، اہل حدیث اس پر ہر حال میں عمل پیرا ہوں گے۔ یہی ان کی زندگی کا نقطہ ماسکہ اور یہی ان کا مقصد اصلی ہے۔

### ایجابی اور وسیع دعوت

ہم دیکھتے ہیں کہ نہ خفی کو شافعی سے کوئی خفگی ہے اور نہ حنبلی یا مالکی کو خفی پر طیش آتا ہے، لیکن اہل حدیث کے خلاف تنفر کی ایک مسموم فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ اہل حدیث کوئی محدود مسائل رکھنے والا فرقہ نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل دعوت ہے اور ایک ایجابی اور وسیع الاثرات پیغام ہے۔ اپنے انداز و نچ کا ایک منفرد سلسلہ ہے۔ یہ فرقہ نہیں، اصل ہے۔ یہ کسی مذہب کی شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ ہے۔ اسے فقہی اصطلاح میں ایک مکتب فکر سے تعبیر نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ دین کا ایک ہمہ گیر اور جامع تصور ہے۔ عقاید میں اس کے خاص تصورات ہیں اور اعمال میں اس کا وہ اسلوب ہے جو دور نبوت سے طے شدہ ہے۔ مختلف مسائل کو محیطہ فکر اور فہم کی گرفت میں لانے اور ان کے استنباط و استدلال میں اس کی اپنی شرائط ہیں، جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کیوں کہ وہ شرائط کتاب و سنت اور ارشادات سلف کے ہم آہنگ ہیں۔

اگر اہل حدیث صرف ایک ایسے گروہ کا نام ہوتا جس کے دائرہ عمل میں چند فقہی مسائل ہی داخل ہوتے، تو ان کے خلاف خفگی و برہمی کا سلسلہ ہرگز دراز نہ ہوتا، لیکن یہاں تو معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اہل حدیث چوں کہ خالص اور کامل اسلام کے داعی اور ترجمان ہیں، جس میں اللہ کی توحید اور اطاعت رسول کے تمام پہلو شامل ہیں اور ان میں اکثر پہلو وہ ہیں جو بہت سے لوگوں کے مفادات و رجحانات سے لگا نہیں کھاتے، لہذا ان کی مخالفت کو ضروری قرار دے دیا گیا اور ان کے خلاف ایک مجاز قائم کر لیا گیا۔

## ایک مثال

ایک خاص دعوت اور ایک خاص مذہب کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس مسئلے پر غور کیجیے کہ دنیا میں بہت سے مذاہب موجود ہیں جو اپنا الگ الگ ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ ان مذاہب میں یہودیت بھی ہے، عیسائیت بھی ہے، مجوسیت بھی ہے اور بدھ مت بھی ہے۔ ان مذاہب کے بارے میں تمام مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کر لیجیے وہ کھلے دل سے بتائیں گے کہ یہودیت میں کون کون سے اوصاف و کمالات جمع ہیں۔ وہ اس بات کا تذکرہ نہایت فراخ حوصلگی سے کریں گے کہ مجوسیت کون سے لائق تعریف امور کا دل کش مجموعہ ہے، وہ بدھ مت کے متعلق انتہائی ادب و احترام سے اظہار خیال کریں گے اور اس میں جو فلسفہ و حکمت پنہاں ہے اس کی حقانیت کے سامنے بلا تامل ان کی گردنیں جھک جائیں گی، اس سے آگے بڑھ کر جب وہ عیسائیت پر پہنچیں گے تو اس کی چوکت پر تو یہ بہ درجہ غایت نیاز مندی کے ساتھ اپنا سر رکھ دیں گے اور اس وقت تک انھیں اطمینان قلب نصیب نہیں ہوگا جب تک کہ حضرت مسیح کو الوہیت کے مرتبے تک نہ پہنچا دیں اور ان کی تعلیمات کو حیات دنیوی کی آخری معراج اور اخروی زندگی کے لیے نجات کا بنیادی ذریعہ نہ قرار دے لیں، اور ان کے افکار و تصورات کو کامیابیوں کا مرکز اصلی نہ ٹھہرا لیں، لیکن جیسے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و فتوحات کی سرحدوں کا آغاز ہوا، اور آپؐ کی کامرانیوں کے بوقلموں اور وسعت پذیر میدانوں پر نگاہ پڑی، جبین قلم شکن آلود ہو گئی، ذہن پر تعصب کی تہیں جم گئیں اور چہرے پر بغض و عناد کی سیاہیاں پھیل گئیں۔

تمام مستشرقین کا یہی حال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر نگاہ پڑتے ہی ان کی تحریر کے تیور بدل جاتے ہیں اور ان کا طرز نگارش یک دم غضب ناک ہو جاتا ہے۔

## اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ بدھ اور حضرت مسیح کے ساتھ ان کے دل میں عقیدت و احترام کے

بے پناہ جذبات کیوں موجزن ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و عناد اور جنگ دلی کا مظاہرہ کس وجہ سے ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ بدھ اور حضرت مسیح نے اگرچہ بعض حکیمانہ خدمات سرانجام دی ہیں اور ان کے اقوال و اعمال فلسفیانہ نصائح پر مبنی ہیں، لیکن ان کی کوششوں سے قدیم معاشرے میں تبدیلی کے آثار نہیں پیدا ہوئے، نظم و نسق کے اجتماعی دائروں میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، اور ان کی زندگی میں عملی اعتبار سے دنیا کسی انقلاب سے روشناس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو اپنانے کی تبلیغ کی ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ فلسفہ و حکمت کا ایک دل آویز گستاں سجا ہوا ہے، بلکہ بہت جلد اس میں عملی انقلاب پیدا ہوا، ایک ایسا عظیم معاشرہ عالم وجود میں آیا، جس کی اس سے قبل سطح ارض پر کوئی مثال نہیں ملتی، عالم انسانیت کو آنحضرت ﷺ نے نئی قدریں عطا کیں، اصلاح احوال کی جدید راہوں کا تعین کیا اور صاف ستھری تعلیمات کا ایک درخشاں باب لوگوں کے سامنے کھل گیا، جس سے نہایت مختصر مدت میں معاملات کہیں سے کہیں پہنچ گئے، ہر سو خیر و صلاحیت کی فضا پیدا ہو گئی اور فوٹوحات اسلامی کے دائرے دور تک پھیل گئے۔

واقعات کی رو سے اگر صورت حال یہی ہے اور یقیناً یہی ہے تو اہل حدیث یہ دعویٰ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ ان کی دعوت وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی اور جسے آپ کے صحابہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا عزم کیا اور اس میں وہ کامیاب رہے، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اب بتائیے کہ ان کے ساتھ لوگ وہی سلوک کیوں روا نہ رکھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روا رکھا گیا۔ جب یہ توحید کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کریں گے اور اربابا من دون اللہ کی تفصیلات معرض بیان میں لائیں گے تو ان پر کیوں تنقید نہیں کی جائے گی؟ جب یہ فقط کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ وابستہ رہنے کا اعلان کریں گے تو اس حلقے سے تعلق رکھنے والے کیوں انھیں دلی انس کا مستحق گردانیں گے جو ہر حال میں تقلید و جمود پر قائم رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں؟ اسی طرح جب یہ جرأت



منوانہ لہجے میں بدعات و محدثات کو نشانہ تردید بنائیں گے اور مسلمانوں پر اس قباحت سے محفوظ رہنے کے لیے زور دیں گے تو وہ طبقہ ان سے کیوں کراٹھا کر سکے گا، جس کی تحریروں اور تقریروں کا دار و مدار بنی بدعات و رسوم پر ہے۔

گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ اہل حدیث چوں کہ متعین نفع حیات کا نام ہے اور اصل دین اور اساس اسلام سے تعبیر ہے اعمال و عقاید میں ان کا تعلق براہ راست اسوہ پیغمبر سے ہے، کتاب و سنت سے تمسک ان کا بنیادی زاویہ فکر ہے، بدعات و رسوم سے دامن کشاں رہنا ان کا محور حیات ہے، اس لیے بعض حلقوں کا ان کی مخالفت پر اتر آنا قدرتی امر ہے۔ اہل حدیث کو اس مخالفت پر نہ کبیدہ خاطر ہونا چاہیے اور نہ اس پر تعجب کا اظہار کرنا چاہیے۔ مثبت انداز میں اپنا سلسلہ تبلیغ جاری رکھنا چاہیے۔ کسی سے الجھنے اور بحث و نزاع میں اپنی طاقت خرچ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

### فکر و عمل کے تین پہلو

اہل حدیث کے سامنے فکر و عمل کے تین پہلو ہیں اور یہی ان کے اصلاحی کارنامے ہیں، جن کی طرف انھوں نے ہمیشہ توجہ مبذول کیے رکھی۔

ایک الہیات کا پہلو ہے، جس میں انھوں نے بدعات کلامیہ کو ہدف بحث ٹھہرایا اور اعتراف و حشویت کی گم راہیوں کی نہ صرف نشاں دہی کی بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید کی۔ سلف کے عقاید کو وضاحت سے بیان کیا اور اسلام کی سادہ اور پرکشش تعلیم سے لوگوں کو روشناس کرایا اور اس پر کاربند رہنے پر زور دیا۔

دوسرے پہلو کا تعلق تہیات سے ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ تقلید و تقلید سے کنارہ کش ہو کر کتاب و سنت کو اپنا معیار نظر قرار دیں اور اطاعت و اتباع کا اصل سرچشمہ فقط فرامین الہی اور ارشادات پیغمبر کو ٹھہرائیں۔

تیسرا پہلو بدعات و رسوم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے اور غیر اسلامی امور سے دامن بچا کر زندگی بسر کرنے کا ہے۔

یہ نہایت صاف اور سیدھی باتیں ہیں جن کی اہل حدیث تبلیغ کرتے اور جن پر عمل کی

دیواریں استوار کرنے کی عام مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں۔ اگر ان باتوں کو مدِ اہلِ ٹھہرا لیا جائے تو اسلامی سلسلے سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات درست رخ اختیار کر لیتے ہیں اور فکر و عقیدے کی صحت و اصلاح کا اہم مسئلہ بالکل آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ تم میں ایک جماعت بہر حال ان اوصاف کی حامل ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی صحیح فکر کے لیے ہر وقت کوشاں رہے اور واقعہ یہ ہے کہ اہل حدیث کی یہی حیثیت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (آل عمران: ۱۰۴)

(اور تم میں ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور برائی کے ارتکاب سے روکے۔ یہی لوگ کامیابی سے ہم کنار ہونے والے ہیں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت کو یہ مژدہ سنایا ہے۔

لاتزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق. (۱)

(میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ برسرِ حق رہے گا)

قرآن کی اس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو جہاں ایک دعوت کی حیثیت حاصل ہے وہاں یہ ایک بنیادی ذریعہ ہدایت اور باعثِ رشد و خیر بھی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ فکر و عمل کی دنیا میں جب بھی کوئی بگاڑ پیدا ہوتا اور برائی سر اٹھاتی ہے اللہ کا کرم اپنا رنگ دکھاتا اور رحمت الہی جوش میں آ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی جماعت کو ظہور میں لاتا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی اور دنیا میں حق و صداقت کا علم لہراتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار ابتلاؤں اور قسم قسم کی برائیوں کے باوجود اسلام زندہ ہے اور اس کے ہر حکم میں وہی تازگی اور شکستگی پائی جاتی ہے جو چودہ سو سال قبل اس کا طرہ امتیاز تھی۔

وہ جماعت خالص کتاب و سنت کی داعی بن کر میدانِ عمل میں اترتی اور صاف

۱۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب لاتزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق

ستھرے اسلام کی تبلیغ کرتی ہے، جس میں نہ بدعات و رسوم کا دخل ہوتا ہے اور نہ اس میں تقلید و جمود کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔

مختلف ادوار میں مختلف نام:

مختلف ادوار میں اس جماعت کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق ان کے فکر و عمل کی سمتیں بھی بدلتی رہی ہیں اور ان کے کارناموں میں بھی تغیر رونما ہوتا رہا ہے۔

کبھی ان کو محدثین کے نام سے پکارا گیا کہ انھوں نے حدیث و سنت کی جمع و تدوین کو اپنا فرض منصبی قرار دے لیا تھا اور اس اہم خدمت کی انجام دہی کے لیے یہ حضرات دور دراز کی مسافتیں طے کرنے لگے تھے۔ جہاں کسی چھوٹے بڑے ارشاد پیغمبر سے فیض یاب ہونے کی بھٹک کالان میں پڑی وہاں جا پہنچے اور اس وقت تک چین نہیں لیا، جب تک اس ارشاد کو تحریر و کتابت میں نہیں لے آئے۔ اس کے حصول کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی اور بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا اور طویل عرصے تک جاری رہا۔

معتزلہ، جہمیہ، حشویہ اور شیعہ وغیرہ کے مقابلے میں انھیں اہل سنت کا جامع لقب عطا کیا گیا، اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مذاہب اور ان کے افکار و تصورات سے انھیں امتیاز حاصل ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مسئلے اور فلاں معاملے میں اہل سنت کا شعار یہ ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث اور شروح احادیث کی کتابوں میں تابعین اور محدثین کی سلسلے میں اپنے مسلک اور نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ هذا من اهل السنة۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ اس کے بالمقابل کسی مسئلے کی تعبیر ان حضرات کی ہے، جن کا تعلق اہل سنت سے نہیں ہے۔

اہل حدیث کو سلف کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ عقیدہ و عمل میں یہ صرف صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین اور محدثین کے نقطہ نظر کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

انھیں اثری بھی کہا گیا ہے کہ یہ انہی آثار و فرامین پر عمل کناں ہیں جو حدیث و سنت سے ثابت اور اسلاف سے منقول ہیں۔

اس وضاحت سے مقصد اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ اہل حدیث عقاید و اعمال کی تمام جزئیات اور اس کے تمام گوشوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی اتباع کا دم بھرتے اور صحابہ و تابعین کے زاویہ فکر کو مبنی بر صحت ٹھہراتے ہیں۔ ہر دور میں ان کا یہی اسلوب رہا اور یہ اسی اسلوب پر کار بند رہے۔

سلف کی راے کو ترجیح دینے کی بنیادی وجہ

اسلاف کرام کے بارے میں یہ بات کامل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ حضرات تادیل بالراے کے قائل نہیں تھے اور مذہب کے متعلق اپنی خواہشات و نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کتاب و سنت کا سہارا ہرگز نہیں لیتے تھے۔ دین ہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور سرمایہ حیات تھا۔ ان کی اقلیم ذہن اور مملکت فکر پر دین ہی کی حکمرانی تھی اور اسی کی رہنمائی میں وہ اپنا سفر حیات طے کرتے تھے۔ اسی کو نجات اخروی کا ذریعہ قرار دیتے تھے اس سے ایک انج بھی ادھر ادھر ہونا انھیں گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صفات و عقاید اور اعمال و اقوال میں سلف کے نقطہ نظر کو صحیح مانتے اور اس ضمن میں ان کی بیان کردہ تشریحات کو ترجیح دیتے ہیں۔

سلف کے نقطہ نظر کو ترجیح دینے کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ اس سے علم و عمل کی تاریخ میں ایک طرح کا تسلسل قائم رہتا ہے اور اس حقیقت کی نشان دہی ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر صحابہ کرام، تابعین، عظام اور ائمہ ہدیٰ تک اہل حدیث کے افکار و تصورات کی صورت حال کیا رہی ہے۔ ان کے عقاید کس قالب میں ڈھلے ہیں، صفات میں کون سی کیفیت رہی ہے، امت کن کن فکری اور عملی منزلوں سے گزری ہے اور اس راہ میں اگر کئی مشکل مرحلہ پیش آیا ہے تو اس سے کس انداز میں نمٹا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں تاریخی تسلسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دور ماضی میں حالات نے جو کروٹیں بدلیں، وہ کس نوعیت کی تھیں اور ہمارے اسلاف کا ان کے متعلق کیا زاویہ فکر رہا اور اس سے کیا نتائج اخذ کیے۔

نبی ﷺ کی تعلیمات نے ابتدائی دور ہی میں ایک بہت بڑا معاشرہ پیدا کر دیا تھا اور وہ معاشرہ صحابہ کرام پر مشتمل تھا، جن کے رگ و پے میں دینی احکام رچے ہوئے تھے اور وہ ہر حال میں ان پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ یہی ہمارے اسلاف تھے اور یہ وہ نفوس قدسیہ تھے جن کے قلوب واذہان میں قرآن و حدیث نے پہلی دفعہ اپنا نشیمن بنایا، جن کی موجودگی میں شیعہ نبوت فروزاں ہوئی اور اس کی روشنی چار داگ عالم میں پھیلی، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جمال نبوی کا نظارہ کیا، جن کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور انہوں نے خود لسان نبوت سے قرآن کی سماعت کا شرف حاصل کیا اور اس کے مطالب کو سمجھا۔ جنہوں نے براہ راست ارشادات پیغمبر کو سنا اور جو آپ کے روح پرور اور دل نواز مواظظ سننے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جن کی صمسمیں اور شامیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامرو احکام کی صدائیں سننے اور ان پر عمل کرنے کی فضاؤں میں بسر ہوئیں۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور سالہا سال آپ کی صحبت و رفاقت میں رہے اور آپ کی خوش نودی کے حصول کے لیے سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیا اور زندگی کا ایک لمحہ آپ کی مجلس پر نور میں گزارنے کی سعی کی۔ پیش آئند مسائل میں اہل حدیث اسی واجب الاحترام گروہ کی تعبیرات و تشریحات کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

### سلف کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے

سلف کا اطلاق سب سے پہلے یقیناً اسی گروہ پر ہوگا، جن کے دل پر آفتاب رسالت کی اولین کرنیں پڑیں اور جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نشینی اور رفاقت کا شرف حاصل کیا، اور یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں، جنہیں صحابہ رسول کے پر افتخار لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے بعد اس سعادت کے مستحق تابعین ہوں گے جو عقیدہ و عمل میں انہی راہوں پر چلے جن کی تعلیم انہوں نے اپنے اساتذہ (صحابہ کرام) سے حاصل کی تھی۔ یہ وہ عالی مرتبت لوگ تھے جنہوں نے کتاب و سنت کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور اسی کے سائے میں تزکیہ نفس کی روح پرور منزلیں ملے کی تھیں۔ تابعین کے بعد ان کے شاگردوں یعنی تبع تابعین کا زمانہ آیا۔

یہ سب وہ حضرات تھے جنہوں نے دین کو پھیلایا، اسلامی تعلیمات کو عام کیا اور جس دور اور جس مقام میں جس انداز میں خدمت دین کی ضرورت تھی، اسی انداز میں خدمت سرانجام دی۔ امام مالک نے مسجد نبوی میں اشاعت حدیث کی مسند بچھائی اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور پھر ان سے حاصل کردہ تعلیم کو مختلف علاقوں اور ملکوں میں مروج اور عام کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

امام احمد بن حنبل نے خلق قرآن کے مسئلے پر معتزلہ کی بہت بڑی جماعت کا مقابلہ کیا اور مسلسل تین عباسی خلفا سے نبرد آزما ہوئے۔ ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے، جو ہر اعتبار سے صحیح موقف تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، اللہ کی مخلوق نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں بعض لوگوں کو ممکن ہے، یہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہو، مگر اس زمانے میں یہ بہت بڑا مسئلہ تھا اور اب بھی بہت بڑا مسئلہ ہے، اس کے لیے امام احمد کو بڑی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ ہر ابتلا اور ہر آزمائش میں کامیاب رہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں، جنہیں قرآن ”عزم الامور“ سے تعبیر کرتا ہے اور انھیں پوری ہمت اور طاقت سے سرانجام دینے والوں کو ”اولوالعزم“ قرار دیتا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ قید خانے میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جسم پر کوڑے پڑ رہے ہیں، اس حالت میں ان کے پاس بہت سے لوگ آئے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جان بچانے کے لیے کسی حد تک اپنے موقف میں لچک پیدا کر لیں۔ لیکن ان کا سب کے لیے ایک ہی جواب تھا۔

اعطونی شینا من کتاب اللہ او من سنة رسول اللہ حتی اقول بہ۔

(مجھے اللہ کی کتاب یا رسول اللہ کی سنت سے کچھ دکھاؤ تو میں اقرار کر لوں)

گا اور تمہاری بات مان لوں گا)

امام احمد کے عزم راسخ اور جذبہ اتباع سنت نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ ان سے محبت کرنے والے کو بھی پابند سنت کہا جانے لگا اور اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ کرام برملا

کہا کرتے تھے۔

اذا رایت الرجل یحب احمد بن حنبل فاعلم انه صاحب سنۃ.  
(اگر کسی شخص کو دیکھو کہ وہ امام احمد بن حنبل سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو جان لو کہ وہ صاحب سنت ہے)

یہ بھی ایک معیار قرار دیا گیا تھا کہ مسلمان کو زندگی سے پرکھا جائے تو امام احمد کے نام سے پرکھا جائے۔ یعنی اگر وہ امام احمد کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتا ہے تو مسلمان ہے اور اگر ان کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔

امام احمد کو جن عباسی خلفاء کے دور میں بتلاے اذیت کیا گیا، وہ تھے مامون الرشید، معتصم باللہ اور واثق باللہ۔! مامون الرشید اور معتصم باللہ نے ان کو شدید جسمانی آفات و مصائب میں مبتلا کیا۔ واثق باللہ نے انھیں جسمانی اذیتیں تو نہیں پہنچائیں، البتہ اس ذہنی اذیت سے دوچار کیا کہ ان کے نام شامی فرمان جاری کر دیا کہ وہ خاموشی سے گھر میں بیٹھے رہیں، کسی سے کوئی میل جول نہ رکھیں۔ یعنی انھیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور زبان پر پابندی لگا دی گئی۔

اب چوتھے خلیفہ متوکل علی اللہ کا دور آیا، اس نے یہ تمام پابندیاں ختم کر دیں۔ لیکن اب ان کے نفس کے لیے آزمائش کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ یعنی ان کے قدموں میں مال و دولت کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے اور تمام شامی مراعات کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے تھے۔ یہ بھی انتہائی اذیت کا مرحلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں بھی انھیں ثابت قدم رکھا اور انھوں نے خلیفہ وقت اور حکمرانوں کی شدید خواہش کے باوجود نہ مال و دولت کو ہاتھ لگایا اور نہ سرکاری مراعات قبول کیں۔

امام احمد کے علاوہ امام شافعی کو لیجے جن کا طریق استنباط اور نفع استدلال حدیث پیغمبر کے عین ہم آہنگ تھا اور پہلے پہل حجت و استنباط حدیث کی طرح انہی نے ڈالی۔ ان کی فقہ ارشادات نبوت سے ماخوذ اور اعمال صحابہ کا حصہ ہے۔

پھر امام سفیان ثوری، سعید بن مشیب، محمد بن سیرین، عبد اللہ بن مبارک، امام زہری

حسن بصری، عبدالرزاق بن ہمام، عمرو بن دینار، عبدالرحمن اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، سفیان بن عیینہ، امام ابو حنیفہ، کبج بن الجراح، یحییٰ بن سعید القطان۔ ان سے آگے امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ابوداؤد وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے۔ یہ وہ حضرات ائمہ ہدیٰ ہیں جو اپنے اپنے انداز میں مختلف علاقوں میں جمع حدیث اور ترویج سنت میں اور مسائل فقہ کے استنباط میں مشغول ہیں اور بے شمار حضرات ان سے مصروف استفادہ ہیں۔

اس قافلے کے سالارِ اعظم رسول اللہ ﷺ تھے

آسمانِ علم و ہدایت کے یہ وہ چند تابندہ ستارے ہیں جن میں سے بعض کا شمار تابعین کی پر شکوہ جماعت میں ہوتا ہے، بعض کا جامعین حدیث کے مقدس گروہ میں اور بعض کا کتب حدیث کے مرتبین و مؤلفین کے طائفہ باکمال میں اور یہی وہ اصحاب فضل ہیں جنہیں سلف کہا جاتا ہے۔ اہل حدیث کا تعلق اسی کاروانِ رشد و ہدایت سے ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلہ خیر و صلاح کے سالارِ اعظم ہیں۔

اس قافلہ کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسوۂ حسنہ نے ترتیب دیا تھا۔ اس لیے اہل حدیث کے تصور سلفیت کی عمر بہت طویل ہے اور اتنی ہی طویل ہے جتنی کہ خود اسلام کی عمر ہے۔ سلف کی اس پاکیزہ خصال جماعت کی تصنیفی و تعلیمی سرگرمیوں کا دائرہ بے انتہا وسیع ہے۔ انھیں زہد و ورع کی فراوانیاں بھی خوب میسر آئی ہیں اور ان کے ایثار و عمل کی حدود بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ہر دور میں خلفاء و ملوک کی چہرہ دستیوں کا بے درجہ غایت ہمت و جرات کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انھوں نے اللہ کی توحید کو پھیلا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کی ترویج کو اپنا منصب اصلی قرار دیا اور اس سلسلے میں بے حد تکلیفیں جھیلیں۔ ان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام امورِ بلا کس صلہ و انعام کے سرانجام دیے اور خلعت و دربار سے ہمیشہ دور رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے صفاتِ شانِ دور سے لے کر اب تک حالات میں بے شمار تغیرات رونما ہوئے عالم اسلام میں انقلاب و تحول کی لاتعداد لہریں اٹھیں اور لوگ بہت



سے عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوئے۔ لیکن یہ کاروان خیر و صلاح ہر دور اور ہر حالت میں راہ حق پر گامزن رہا۔ انھوں نے نہ کبھی کسی سے صلہ و انعام کی توقع رکھی نہ سرکارِ دربار سے ربط و تعلق پیدا کیا اور نہ کبھی خلعت و اکرام کے لیے کسی آستانہ فرماں روائی کا رخ کیا۔ جو کچھ کیا خالصتاً لوجہ اللہ کیا اور ان کا مقصد محض حصولِ رضاے خداوندی رہا۔

### کلامی بحثوں سے دامن کشاں رہنے کی تاکید

یہ ہے اہل حدیث کے نزدیک سلفیت کا مفہوم اور یہ ہیں وہ نفوسِ قدسیہ جن پر سلف کے پر عظمت لقب کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ وہ عالی قدر حضرات ہیں جن کی متعین خدمات ہیں اور انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام اپنی اصلی روح اور صحیح خدو خال کے ساتھ دنیا میں موجود ہے۔ تمام مذاہب تحریف کی زد میں آ گئے اور ہر دین کی بنیادی تعلیمات متقلب ہو گئیں، لیکن سلف کی اس مقدس جماعت کی ہمہ گیر مساعی اور بوقلموں خدمات کی بنا پر اسلامی احکام میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ، ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ. (یونس: ۶۴)

(اللہ کے فرمانِ اٹل ہیں، کبھی بدلنے والے نہیں اور یہی سب سے بڑی فیروز

مندى ہے جو کسی مسلمان کے حصے میں آ سکتی ہے۔)

اس کے سوا بہت سے گروہوں نے اللہ کے احکام سے روگردانی کی اور انھیں بدل

ڈالا۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ. (البقرہ: ۵۹)

(جن لوگوں نے ظلم و شرارت کی راہ کو اپنایا، انھوں نے اللہ کی بتلائی ہوئی

بات کسی دوسری بات سے بدل ڈالی۔)

سلف نے وہی راہ اپنائے رکھی اور اسی پر قائم رہے جس کا اللہ اور رسول نے قرآن و حدیث میں حکم دیا تھا اور یہی اصل اور حقیقی راہ ہے۔ کتاب و سنت کے یہ فدائی ہمیشہ اسی راہ پر گام فرسارے۔ اللہ کی صفات اور احکام کے بارے میں انھوں نے نہ کبھی قیل و قال کو پسند کیا اور نہ کلامی اور بدعی طرز فکر سے کوئی سروکار رکھا۔ ہر دور میں اس سے مجتنب رہے

اور اسے لائقِ مذمت گردانا۔ اس ضمن میں امام شافعی کا مشہور قول ہے۔

ما رایت احدا ارتدئی بالکلام فافلح.

(میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے علمِ کلام سے شغف رکھا ہو اور

پھر وہ دینی اعتبار سے کامیاب رہا ہو۔)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے قرآن کے بارے میں اور مسئلہ تقدیر کے متعلق

سوال کیا۔ حضرت امام نے اس کا طرزِ کلام سن کر فرمایا۔

لعلک من اصحاب عمرو بن عبید، لعن اللہ عمروا فانه ابتدع

هذه البدعة من الکلام، ولو کان الکلام علما نافعا لتکلم به

الصحابۃ والتابعون رضی اللہ عنہم کما تکلموا فی الاحکام

والشرائع و لکنه باطل یدل علی باطل.

(تمہارا تعلق شاید عمرو بن عبید سے ہے، اللہ عمرو پر لعنت کرے، سب سے پہلے

کلامی بدعتوں کی طرح اسی نے ڈالی ہے۔ اگر یہ کوئی فائدہ مند علم ہوتا تو

صحابہ اور تابعین کرام اسی اسلوب میں اس کے متعلق وضاحت سے گفتگو

کرتے، جس طرح کہ انھوں نے احکام و شرائع کے مختلف گوشوں کے متعلق

کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ علم ہی باطل ہے اور باطل پر دلالت کرتا ہے)

اسی طرح کی باتیں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے کلامی بحثوں میں الجھنے کی سخت مذمت کی ہے اور اس موضوع پر

گفتگو کرنے سے لوگوں کو روکا ہے، اس لیے کہ وہ اس کی مضرتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ

چکے تھے اور اس کی وجہ سے انھیں شدید ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ امرائے وقت

اور خلفائے عہدان کے سامنے کتاب و سنت کی اہانت کرتے اور بدعات کو صحیح قرار دیتے

تھے۔ امام کے لیے ان کی اس قسم کی باتیں سننا اور برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔۔۔ وہ اعلان

فرماتے ہیں۔

علیکم بالسنة والحديث وما ينفعکم وایاکم والخوض فانه

لا یفلح من احب الکلام.

(قرآن وحدیث سے وابستہ رہو اور وہ چیزیں سیکھو جو تمہارے لیے فائدہ مند ہوں۔ بحث و مناظرے سے دامن بچائے رکھو جو شخص کلامی مباحث میں پڑا وہ فلاح و کامرانی سے محروم رہا۔)  
علامہ جوینی رحمۃ اللہ علیہ علم کلام کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اپنے عزیزوں اور عیادت کے لیے آنے والوں سے کہا۔

استشهدوا علی انی قد رجعت عن کل مقالة قلتها اخالف فیها  
السلف الصالح، وانی اموت علی ما یموت علیہ عجائز نیسابور۔  
(تم لوگ اس پر گواہ رہو کہ میں نے ہر اس بات سے رجوع کر لیا ہے جو سلف صالح کے خلاف کہی گئی تھی۔ میں اس سادہ عقیدے پر مر رہا ہوں جس پر نیسابور کی بڑی بوڑھی عورتیں مرتی تھیں۔)

کلامی مباحث سے اجتناب کی دو وجہیں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ محدثین اور سلف کلامی مباحث سے کیوں دامن کشاں رہے اور کیوں لوگوں کو اس سے مجتنب رہنے کی تاکید کی؟  
اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس نوع کی بحثوں میں وہ لوگ حصہ لیتے تھے جن کی دینی عصیبت کم زور ہو چکی تھی اور وہ اسلامی احکام پر غور و فکر کے لیے زیادہ تر اعتماد عقل پر کرتے تھے اور ان کی عقلیت پسندی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کے مقابلے میں کتاب وسنت کے بعض اہم مسائل بھی ان کی نظروں میں جھپٹے نہ تھے۔ اسلام کے متعین اور واضح عقائد و اعمال سے وہ بالکل روگرداں ہو گئے تھے اور ان پر کھلے بندوں تنقید کرنے لگے تھے۔ ان کی تنقید آرائی کی وسعتیں یہاں تک ممد ہو گئی تھیں کہ صحابہ کو بھی وہ نشانہ طعن بناتے اور ان پر کئی قسم کے الزامات دھرتے تھے۔ ان کے اپنے عمل و عقیدے کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں اور دوسروں کو بھی وہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم کرنے کا عزم کر چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سلف کے نقطہ نظر کی رو سے اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات کا مسئلہ سر اسر دینی ہے۔ اس ضمن میں اسی بات کو قطعی اور حتمی قرار دیا جائے گا جو کتاب اللہ اور آثارِ پیغمبر و صحابہ میں موجود ہے۔ یہاں عقل و خرد کے دروازوں پر دستک دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس موضوع سے متعلق صحیح علم وہی ہے جو اللہ کے فرامین اور ارشادات رسول اللہ سے ماخوذ اور صحابہ کے آثار و اعمال پر مشتمل ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی صحیح بات ارشاد فرمائی ہے کہ دوسرے علوم و معاملات میں عقل کی روشنی مفید مطلب ہو سکتی ہے لیکن صفاتِ الہی کے سلسلے میں کام نہیں دے سکتی۔

فالراى لیل والحدیث نہار .

(یعنی رات کی طرح تاریک اور حدیث و سنت دن کی مانند روشن ہے)

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کا مسئلہ عقلی نہیں، خالص دینی ہے اور اسے دینی نقطہ نظر ہی سے مرکز فکر ٹھہرایا جائے گا۔ یہاں عقل کی رسائی کا کوئی امکان نہیں۔

موجودہ دور میں بھی لوگ اس پر عقلی نقطہ نگاہ سے گفتگو کرتے اور اسے موضوع بحث ٹھہراتے ہیں۔ مگر بجز مباحثہ و مجادلہ کے کوئی بات کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ وہیں پہنچ کر بات ختم ہو جاتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اسلام عقل کا حریف یا مخالف نہیں ہے، بلکہ وہ بار بار انسان کو عقل و شعور اور فہم و تدبیر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وجود باری اور صفاتِ الہی کے معاملے میں عقل کام نہیں دیتی، اسے انسانی فہم کی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ عقل کی سرحدیں اس میدان میں قدم رکھتے ہی سکڑ جاتی ہیں اور شعور کے دائرے یہاں تک پہنچتے ہی مٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ صحیح ہو گا جس کے ماننے پر محدثین و سلف زور دیتے ہیں۔ مسلک سلف کو ترک کر کے عقل آرائی یہاں کئی قسم کے فتنوں کو جنم دے گی اور ذہنوں میں وسوسے پیدا کرے گی۔ لہذا مسلک محدثین پر عمل پیرا ہونا نہایت ضروری ہے اور یہی طریق صواب ہے۔

اہل حدیث کے بارے میں ایک بہت بڑا مغالطہ کچھ مدت سے اہل حدیث کے بازے میں یہ مغالطہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ یہ کوئی مکتب فکر نہیں ہے بلکہ حفاظ حدیث کی جماعت اور اس فن کے ماہرین کو اہل حدیث کہا جاتا ہے۔

یہ نقطہ نظر بالکل غلط ہے۔ بقول حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے اس مغالطے کو پھیلانے اور عام کرنے کے ”دو ہی سبب ہیں۔ قلت مطالعہ اور تعصب“<sup>(۱)</sup> مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

”اہل حدیث وہ جماعت ہے جو اپنے افکار میں شخصی پابندیوں سے آزاد ہے۔“<sup>(۲)</sup> یعنی محض فن حدیث کے حفاظ کا نام اہل حدیث نہیں۔ ان کے فہم و استدلال کے کچھ اصول ہیں جن کا تعلق ائمہ کی تقلید سے نہیں بلکہ براہ راست کتاب و سنت سے ہے۔ اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ نے جو کچھ حجۃ اللہ البالغہ اور بعض دیگر تصانیف میں تحریر فرمایا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ:

✽ اہل حدیث کا اطلاق صرف فن حدیث کے ماہرین پر نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک متعین مکتب فکر ہے جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ہے۔

✽ یہ لوگ قیاس جلی اور نظائر کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں اور اجتہاد و استنباط کے قائل ہیں۔

✽ یہ اہل ظاہر سے الگ ہیں۔

✽ یہ کتاب و سنت کو بنیادی اہمیت دیتے اور صحابہ و سلف کے ارشادات سے استدلال کرتے ہیں اور اسے اپنے فہم و استدلال کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔



## دسواں باب

## فقہی مذاہب کی تاریخ اور ان کے عالم وجود میں آنے کے اسباب

اسلام کے دور آغاز میں اسلام کا دائرہ فقط حدود عرب تک محدود تھا اور عربوں کی معاشرت سادہ تھی۔ ان کی ضروریات کا دامن سمٹا ہوا تھا اور مسائل و وسائل کے دائرے محدود تھے۔ لہذا تقاضے مصلحت یہی تھا کہ لوگوں کو ضروریات زندگی کی حد تک اصولی اور بنیادی امور سے مطلع کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان اساسی اور بنیادی اصولوں میں اتنی لچک اور وسعت بہر حال ملحوظ رکھی جائے کہ عند النوازل اور بہ وقت ضرورت ان سے مسائل کا استنباط کیا جاسکے۔ زیادہ واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ اسلام کے عہد ابتدا میں ماخذ مسائل شرعیہ صرف دو تھے۔ اور وہ تھے (۱) کتاب اللہ اور (۲) سنت رسول اللہ۔

### سوال سے صحابہ کا اجتناب

کوئی مسئلہ پوچھنے سے صحابہ کرام بہت اجتناب کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد نبوت تیس سال پر مشتمل ہے۔ تیرہ سال آپ مکہ مکرمہ میں پیغمبر کی حیثیت سے تشریف فرما رہے جسے کئی زندگی کہا جاتا ہے اور دس برس کا زمانہ مدینہ منورہ میں گزرا جو مدنی زندگی سے عبارت ہے۔ تیس سال کے اس طویل عرصے میں جو کچھ اور مدینے میں بسر ہوا، صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف چند ہی مسائل پوچھے، جن کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد آخر میں صحابہ کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلے

ہوئے تھے۔ لیکن وہ عمل کے عادی تھے سوال کرنے اور بلا ضرورت مسائل پوچھنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کے مطلب کی باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بیان فرمادیا کرتے تھے یا قرآن مجید کے ذریعے انہیں بتادی جاتی تھیں۔

### علم الفقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد جب خلفائے راشدین کا زمانہ آیا تو عرب کے باہر اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کی حدود تیزی کے ساتھ پھیلنے لگیں۔ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اس نے اس درجہ وسعت اختیار کی کہ عراق، ایران، مصر اور شام وغیرہ کے متمدن اور زرخیز علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے۔ پھر جلد ہی اندلس، افریقہ، ترکستان، ہندوستان اور سندھ وغیرہ کے دور دراز مقامات پر ان کی فتح و نصرت کے علم لہرانے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو نئے مسائل، نئے تمدن، نئے معاشرے، نئی تہذیب، نئی ثقافت اور نئی معاشروں سے واسطہ پڑا۔ آمدنی و خرچ کے نئے ذرائع سامنے آئے، نیا سلسلہ زراعت دیکھنے میں آیا، نئی اقتصادیات سے متعارف ہونے کا موقع ملا اور مختلف معاملات کی نئی سے نئی شکلیں ظہور پذیر ہوئیں۔ ان سے بہ طریق احسن عہدہ برآ ہونے کے لیے نظر و بصر میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور فکر و فہم کے زاویوں میں شدت سے احساس تبدیلی رونما ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تابعین کے عہد آخر میں ائمہ عظام نے کتاب و سنت کو پیش نگاہ رکھ کر اس کے مقرر کردہ حدود و قوانین کے مطابق ایک ایسا ضابطہ زندگی مرتب کرنے کی طرح ڈالی جو اس دور کے تقاضوں کو اچھی طرح پورا کر سکے۔ اس طرح وقت و ضرورت کے مصالح ایک نئے علم کی تدوین کا باعث بنے، جسے بعد میں ”علم الفقہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس وقت روم، عراق اور مصر بے حد ترقی یافتہ ملک تھے۔ مصر کی حالت تو یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دو ہزار سال قبل وہاں کی عورتیں چھری کا نئے سے کھاتی تھیں چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کو اپنے دام محبت میں پھنسانا چاہا اور وہاں کے

اونچے گھرانوں کی خواتین کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے اس کی اس حرکت کو نہایت معیوب گردانا اور اسے مطعون کیا۔ اس پر اس نے ان خواتین کو اپنے گھر کھانے پر بلایا اور کھانے کے لیے اس دور کی تہذیب اور طریقے کے مطابق انھیں چھریاں پیش کیں۔ قرآن اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَكًا وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ (يوسف: ۳۰-۳۱)

(اور پھر جب اس معاملے کا چرچا پھیلا تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں کہ دیکھو عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے کہ اسے رجھائے وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بد چلتی میں پڑ گئی ہے۔ جب عزیز کی بیوی نے ان کی مکاری کی یہ باتیں سنیں تو انھیں بلوا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے مطابق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی (کہ کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسف سے کہا: ان سب کے سامنے نکل آؤ (جب یوسف نکل آئے اور) ان عورتوں نے اسے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں سبحان اللہ! یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبے والا فرشتہ۔)

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے کی مصری معاشرت اس درجہ شائستہ تھی کہ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں، نشست کے لیے مسندیں لگائی جاتی تھیں۔ کھانے کے لیے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی۔ مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مورخوں کے بیان کردہ واقعات سے پتا چلتا ہے کہ



وہاں کا معاشرہ بڑا متمدن اور مہذب تھا۔ آثار قدیمہ میں امر کی مجلسوں کا جو مرقع دکھایا گیا ہے اس سے قرآن کے ان الفاظ کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے، بلکہ اس مرقعے کو ان الفاظ کی عملی تفسیر سے تعبیر کرنا چاہیے۔

### فقہ اسلامی کے ماخذ

فقہ اسلامی کے استدلال و استنباط کی تین بنیادیں ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔  
(۱) کتاب اللہ۔ (۲) سنت رسول اللہ۔ (۳) رائے و قیاس صحیح۔

فقہ اسلامی کے ان ماخذ ثلاثہ کی مختصر الفاظ میں وضاحت کی جائے تو بات یوں بنتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آپ کے انتقال تک قرآن مجید کی آیات و سور کا نزول بہ تدریج ہوتا رہا۔ آغاز اسلام میں اولیں ضرورت توحید کی تبلیغ اور تردید شرک کی تھی اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے عقیدہ و فکر کی اصلاح، تذکیر و موعظت اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور جلا بخشنے کا سلسلہ تھا۔ اس لیے سب سے پہلے عقاید، تذکیر اور اخلاق سے متعلق آیات نازل ہوئیں۔ پھر دوسرا مرحلہ احکام و اوامر کا تھا لہذا اس کے بعد آیات احکام کا نزول ہوا۔ آیات احکام مستقل طور پر بھی نازل ہوئیں اور ان واقعات کے جواب میں بھی اتاری گئیں جو وقتاً فوقتاً اس زمانے میں مسلمانوں کو پیش آتے رہے۔

قرآن کے احکام و اوامر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی عمل کرتے اور صحابہ کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم صادر فرماتے۔ پھر ضرورت کے مطابق ان کی وضاحت بھی فرماتے اور پیش آئند مسائل کے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب بھی دیتے۔ اللہ کی طرف سے جو احکام نازل کیے جاتے تھے ان میں چوں کہ قلت تکلیف اور عدم حرج خاص طور سے ملحوظ تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی تبیین و توضیح میں اس کا خیال رکھتے۔

### اقسام احکام

قرآن مجید اسلامی احکام کا اولیں ماخذ ہے اور یہ وہ صحیفہ نور ہے جو بہت سے مضامین کا بدرجہ غایت روح پرور مجموعہ ہے۔ اس میں امم سابقہ کا ذکر بھی ہے واقعات و قصص بھی

خاص اسلوب سے بیان کیے گئے ہیں اور پند و موعظت کا بھی نہایت دل نشین سلسلہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں آیات احکام ہیں، جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے، اور یہ احکام دو اقسام میں منقسم ہیں۔

۱۔ وہ احکام جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج اور دوسری عبادات۔

اس کے علاوہ زکوٰۃ، عشر، صدقات، خیرات اور جہاد وغیرہ۔

۲۔ حقوق العباد کے بارے میں احکام تین اقسام پر محیط ہیں۔

اول: وہ جو استقلال خاندان اور روابط معاشرہ سے متعلق ہیں مثلاً نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ۔

ثانی: وہ جو باہمی معاملات کی وضاحت کرتے ہیں، جیسے بیع، وشر، تجارت، اجارہ اور ہبہ وغیرہ۔

ثالث: وہ جو تعزیر اور انتظام مدن کے ضمن میں معرض بیان میں آئے ہیں۔ مثلاً قصاص، حدود، سیاسی معاہدات، جزیہ اور مفاد عامہ سے متعلق امور۔

### احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن مجید کے بعد احکام اسلامی کا دوسرا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ آپ کی اطاعت فرض اور آپ کے طریقے اور عمل کی اتباع قرآن میں ضروری قرار دی گئی ہے۔ دین کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال وارشادات کو ماننا ہر حال میں لازم ٹھہرایا گیا ہے اور اسے وحی کی حیثیت دی گئی ہے۔ صحابہ بلا حیل و حجت نبی ﷺ کے اعمال و فرامین پر عمل کرتے تھے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، ادھر اس کی بجا آوری ہوئی۔

عہد نبوت میں احکام کے بارے میں فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ وغیرہ اصطلاحات مروج نہیں تھیں۔ صحابہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے یا جس طرح آپ کو عمل کرتے دیکھتے، اسی طرح خود بھی عمل کرتے۔ مثلاً آپ کو وضو کرتے دیکھا تو اسی طرح وضو کر لیا۔ یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ

افعال وضو میں کون سے افعال فرض ہیں، کون سے مسنون ہیں اور کون سے مستحب۔ صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل بھی بہت کم پوچھتے تھے۔ وہی مسائل پوچھتے تھے جو ان کے نزدیک انتہائی ضروری ہوتے یا کسی سلسلے میں کسی بات کی وضاحت و صراحت کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ اس قسم کے مسائل مسئلہ کی تعداد بہت کم ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کی خود ہی ہدایت فرما دیتے تھے جن کی عام لوگوں کے لیے ضرورت محسوس فرماتے۔

صحابہ اور تابعین کی اجتہادی آرا

امور اسلامی کا تیسرا ماخذ کتاب و سنت کی روشنی میں رائے و قیاس صحیح ہے۔ اس کا ثبوت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اس واقعے سے ملتا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ عرصہ پیشتر ۱۰ ہجری میں ان کو یمن کا قاضی مقرر کر کے بھیجا۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو کچھ فرمایا اور انھوں نے آپؐ سے جو کچھ عرض کیا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما اراد ان يعث معاذ الى اليمن قال كيف تقضى اذا عرض لك قضاء؟ قال اقضى بكتاب الله. قال فان لم تجد في كتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله صلي الله عليه وسلم. قال فان لم تجد في سنة رسول الله صلي الله عليه وسلم ولا في كتاب الله؟ قال اجتهد رأيي ولا آلو. فضرب رسول الله صلي الله عليه وسلم صدره وقال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضى رسول الله.<sup>(۱)</sup>

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنا چاہا تو فرمایا: کوئی فیصلہ طلب معاملہ تمہارے سامنے پیش کیا جائے تو کس طرح

۱۔ سنن ابوداؤد کتاب الاقضية۔ باب اجتہاد الرائی فی القضاء۔ نیز ملاحظہ ہو جامع ترمذی کتاب الاحکام باب ما جاء فی القاضی کیف تمسح۔

فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔  
 فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے  
 مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور کتاب  
 اللہ دونوں میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ بولے: پھر اپنی رائے سے کام لوں گا  
 اور صحیح رائے قائم کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہ سن  
 کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ازراہ مسرت) ان کے سینے پر ہاتھ مارا  
 اور فرمایا سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے رسول کے پیغام پر کو  
 اس بات کی توفیق عطا فرمائی کہ جس سے اللہ کے رسول کی رضامندی  
 وابستہ ہے۔)

اسی طرح امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عامل حضرت ابو موسیٰ  
 اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا۔

الفہم الفہم، فیما یختلج فی صدرک مالم یبلغک فی الکتاب  
 والسنۃ. اعرف الامثال والا شباہ، ثم قس الامور عند ذالک،  
 فاعمد الی احبھا عند اللہ واشبھھا بالحق فیما تری. (۱)  
 (فہم وادراک سے کام لو ان مسائل کے متعلق جو کتاب و سنت میں نہ ہونے  
 کی وجہ سے تیرے دل میں غلبان پیدا کریں۔ مسائل میں امثال و اشباہ کو  
 پہنچانے اور پھر ان پر قیاس کرو اور ان کی روشنی میں ان کے بارے میں ایسی  
 رائے قائم کرو جو تمہیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے قریب تر نظر  
 آئے۔)

اجتہاد

اجتہاد کا شریعت اسلامی میں ایک خاص درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و

۱۔ سنن دارقطنی مع التعلیق المغنی (مولانا شمس الحق عظیم آبادی) مطبع فاروق دہلی جلد ۴ ص ۵۲۱۔ نیز الفاظ کے کچھ  
 تغیر کے ساتھ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین جلد اول ص ۲۷ طبع معرو۔

سنت سے حکم شرعی مستنبط کرنے میں چند قیود و شرائط کے ساتھ پوری پوری کوشش کی جائے۔۔۔۔۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ کتاب و سنت کی منصوص عبارت سے استخراج مسائل کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت کے منصوص مسائل سے بذریعہ قیاس استخراج مسائل کیا جائے۔

عصر صحابہ میں استنباط و تخریج کا سلسلہ فقط انہی مسائل تک محدود تھا جو خارج میں پیدا ہوتے اور ظہور میں آتے تھے امکانی تفریعات کو موضوع بحث نہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو صحابہ اسے ہدف غور و فکر قرار دیتے۔ پہلے اسے قرآن مجید میں تلاش کرنے کی سعی کی جاتی۔ قرآن مجید سے اس کا سراغ نہ ملتا تو احادیث رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جاتا۔ قرآن اور حدیث دونوں اس کے تذکرے سے خالی ہوتے تو مجلس صحابہ میں اس مسئلے کی نوعیت پر غور کیا جاتا اور کتاب و سنت کی روشنی میں کسی امر پر صحابہ متفق ہو جاتے تو اس اتفاق اور اجماع کو حجت شرعی سے تعبیر کیا جاتا اور یہ امر معمول بہ قرار پاتا۔

اجماع نہ ہونے کی صورت میں اہل افتا صحابہ اپنے اپنے اجتہاد اور رائے سے استنباط مسئلہ کرتے۔ اختلاف کی صورت میں کسی ایک صحابی کی تخریج پر عمل کر لینے کو بھی کافی سمجھا جاتا۔ بالعموم لوگ اپنے اپنے شہر اور علاقے کے اہل افتا صحابہ اور ان کے تلامذہ یعنی تابعین کی پیروی کرتے۔ اس طرح عہد صحابہ ہی میں استخراج مسائل کے چار اصول متعین ہو گئے تھے اور وہ تھے۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(۳) قیاس۔۔۔۔۔ اور

(۴) اجماع۔

### استنباط مسائل میں اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد عہد صحابہ میں فتوحات کا سلسلہ وسعت پذیر ہوا اور اس کے دائرہ عمل نے پھیلاؤ اختیار کیا تو مسلمانوں کا

بہت سے ایسے امور سے سابقہ پڑا جن میں اجتہاد و استنباط کی شدید ضرورت تھی۔ بعض اس قسم کے معاملات بھی سامنے آئے جن کا عہد نبوی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے مواقع پر اہل علم کو استنباط، حمل النظر علی النظر اور قیاس وغیرہ سے کام لینا پڑا۔ ان معاملات میں سے نجران، سواد کے محاصل، شام اور الجزیرہ کا بندوبست، صحابہ کے وظائف، پانی اور زمین سے متعلق مسائل، قوانین جنگ وغیرہ بہت سے معاملات شامل ہیں، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔

فہم مسائل اور ان کی تعبیر و تشریح میں متعدد مقامات پر اہل علم کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔

### اصحاب فتویٰ صحابہ اور تابعین

دینی نوعیت کے پیش آئند واقعات و مسائل کے بارے میں کسی ماہر شریعت کے دینی فیصلے کو ”فتویٰ“ کہا جاتا ہے اور فتویٰ جاری کرنے والے ماہر شرع اور عالم دین کو مفتی اور مجتہد کے پر اعزاز لقب سے پکارا جاتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اصل فیصلہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا جاری فرمودہ ہو۔ اسی بنا پر اس شخص کے فیصلے کو مستند اور قابل تسلیم گردانا جاتا ہے جس کے فیصلے کی اساس کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتی ہو۔ عہد نبوت میں اس قسم کے فیصلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نافذ فرماتے تھے۔ آپ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام کی ایک جماعت بھی اس خدمت کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اس مقدس جماعت میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلے کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور بعض کو فیصلے کے اصول سمجھائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین اور دیگر اصحاب فتویٰ صحابہ نے یہ عظیم خدمت انجام دینا شروع کی۔ جن مجتہدین صحابہ کے فتوے محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں ان کی تعداد ایک سو انچاس ہے۔ ان عالی مرتبت لوگوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔۔۔ فتاوے کی نوعیت کے اعتبار سے ایک سو انچاس کی اس تعداد کو تین

حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ ایک حصے کو مکلفین، دوسرے کو متوسلین اور تیسرے کو مقلین قرار دیا جاتا ہے۔

### مکلفین صحابہ

مکلفین سے وہ اہل فتویٰ صحابہ مراد ہیں جن میں سے ہر صحابی سے منقول و مروی فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ اور کثیر مواد موجود ہے۔ وہ صحابہ سات ہیں جن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق، امیر المومنین حضرت علی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ یہ ساتوں حضرات صحابہ قرآن و حدیث اور فہم مسائل میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

### متوسلین صحابہ

متوسلین سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی وہ جماعت مراد ہے جن میں سے ہر صحابی سے فتاویٰ کا کچھ حصہ مروی اور منقول ہے۔ یہ بیس صحابہ کرام ہیں جن میں سے چند صحابہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان بن عفان، ام المومنین حضرت ام سلمہ، انس، ابو ہریرہ، معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری، عبدالرحمن بن عوف، زبیر بن عوف، طلحہ، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، سلمان فارسی، معاویہ بن ابوسفیان اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم۔

### مقلین صحابہ

ان صحابہ کو مقلین کہا جاتا ہے جن سے فتوے بہت کم تعداد میں منقول ہیں۔ بعض سے تو صرف ایک یا دو فتوے منقول ہیں۔ ان سب کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو بالکل چھوٹے مجموعے پر محسوس ہوں گے۔ مقلین صحابہ کی تعداد ایک سو بائیس ہے۔ مندرجہ ذیل صحابہ مقلین کے زمرے میں شامل ہیں۔

ابوالدرداء، ابوذر غفاری، ابویوب انصاری، ابوعبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، جعفر بن

ابوطالب، حسن بن علی، حسین بن علی، ام المومنین حفصہ، ام المومنین حضرت صفیہ، ام المومنین ام حبیبہ، نعمان بن بشیر، ابوسعود، براء بن عازب، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، سعد بن معاذ، خالد بن ولید، عقیل بن ابوطالب، فاطمہ الزہراء، عبدالرحمن بن ابوبکر، سعد بن عبادہ، عدی بن حاتم، عوف بن مالک، عبداللہ بن سلام، ام شریک، حبیب بن سلمہ، مقداد بن اسود، سہیل بن سعد الساعدی، عبداللہ بن رواحہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔<sup>(۱)</sup>

### مراکز فقہ و فتویٰ

عہد خلافت راشدہ میں اور اس کے بعد اسلامی فتوحات کے دائرے بڑھے اور آبادیوں کا سلسلہ پھیلا تو ضروریات کے پیش نظر حدود اسلامی میں مختلف مراکز فقہ اور مراکز افتا قائم ہوئے، جن میں اہم اور لائق تذکرہ سات مراکز تھے۔ وہ تھے مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں فقہ و افتا کے ان مراکز سب سے مختصر الفاظ میں تعارف کرا دیا جائے۔

#### ۱۔ مدینہ منورہ

زمانہ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لے کر خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت (۳۵ ہجری) تک مدینہ منورہ کو بلاد اسلامیہ کے عظیم مرکز دینی کی حیثیت حاصل رہی۔ خلفائے ثلاثہ۔۔۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔۔۔ کے علاوہ صحابہ کرام میں سے حضرت علی، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زید بن ثابت (۲) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کے اکابر اصحاب فتویٰ حضرات تھے۔

۱۔ مکرم بن موسطین اور مقلین صحابہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۱۲۹۔

۲۔ والھین والفقہ والعلم انتشر فی الارض من اصحابہ ابن مسعود واصحاب زید بن ثابت واصحاب عبداللہ بن عمرو واصحاب عبداللہ بن عباس۔ (اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۶) یعنی دنیا میں دین، فقہ اور علم عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے شاگردوں کی وساطت سے پھیلا۔

ان حضرات کے خلافہ میں سے ہر بزرگ اپنی محکمہ علمی و فقہی اعتبار سے نہایت عظمت و رفعت کے مالک تھے۔



ان کے علاوہ طبقہ تابعین میں مدینہ منورہ کے مشہور اصحاب حدیث و فتویٰ حضرات میں سے عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، مخزومی، ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام، مخزومی، علی بن زین العابدین، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، سالم بن عمر، قاسم بن محمد بن ابوبکر، سلیمان بن یسار، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر، امام باقر محمد بن علی جعفر صادق، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابوالثرثاء عبداللہ بن ذکوان رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ حضرات تابعین تھے جو حدیث و فقہ میں بہت بڑے مرتبے کے حامل تھے اور علم و فضل اور تدین و تقویٰ کے اعتبار سے مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں جن کا کوئی حریف نہ تھا۔ انھوں نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا اور پھر آگے خود ان کے شاگردوں کی فہرست بھی بہت وسیع تھی۔

## ۲۔ مکہ مکرمہ

حدیث و افتاء کا دوسرا بڑا مرکز اس وقت مکہ مکرمہ تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں آفتاب اسلام طلوع ہوا اور یہی وہ بلدہ طیبہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور جو پہلی دفعہ دین اسلام کی درخشندہ کرنوں سے آشنا ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد کچھ عرصے کے لیے مدینہ منورہ سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کے مفتی اور معلم مقرر کر کے بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی زندگی کا آخری دور وہیں بسر کیا۔ اہل مکہ ان کے علم و فضل کی فراوانیوں سے بے حد مستفیض ہوئے۔ صحابہ کا اولین مرکز یہی شہر تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ پہلے پہل اسی شہر کے لوگوں کے پردہ سماع سے نکل کر انہیں نزول قرآن کا آغاز اسی مقدس وادی میں ہوا تھا۔

تابعین میں سے مجاہد بن جبر، عکرمہ مولیٰ حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء بن ابی رباح اور عبدالعزیز بن محمد بن مسلم زنجی رحمہم اللہ وہاں کے مشہور اہل الحدیث اور اصحاب فتویٰ حضرات تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے تابعین وہاں فروکش تھے جن کی خدمت میں

حصول فیض کے لیے لوگ بے حد ذوق و شوق کے ساتھ حاضری دیتے تھے۔

### ۳۔ کوفہ

کوفہ اور بصرہ کی حیثیت ابتدا میں فوجی چھاؤنیوں کی تھی۔ یہ دونوں شہر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں آباد کیے تھے اور صحابہ کرام کی اچھی خاصی جماعت ان شہروں میں سکونت پذیر ہو گئی تھی۔ پہلے پہل کوفہ میں حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلم و مفتی اور وہاں کا وزیر مقرر کر کے بھیجا تھا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں اقامت گزیر رہے اور اس شہر کے قرب و جوار کے باشندوں نے ان سے استفادہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی وہاں رہے۔

کوفہ ۳۵ سے ۴۰ ہجری تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دار الخلافہ رہا۔ حضرت علی سے بھی باشندگان کوفہ نے استفادہ کیا۔ ان حضرات کے شاگردوں (تابعین) اور پھر ان کے شاگردوں (تابع تابعین) کی وجہ سے وہاں دینی مسائل کی اشاعت ہوئی۔

کوفہ کے مجتہد مفتی اور اصحاب حدیث اچھی خاصی تعداد پر مشتمل تھے جو حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور دیگر متعدد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیض یافتہ اور ارشد تلامذہ تھے۔۔۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

- (۱) علقمہ بن قیس نخعی: انھوں نے فقیہ عراق کے طور پر شہرت پائی۔
- (۲) مسروق بن اجدع: یہ وہاں کے مفتی اور عالم و معلم تھے۔
- (۳) عبیدہ بن عمرو سلمانی: انھیں معلم عراق کہا جاتا تھا۔
- (۴) عامر شعبی: یہ کوفہ کے فقیہ اور مفتی تھے۔
- (۵) حماد بن ابوسلیمان: ان کا شمار وہاں کے اساتذہ حدیث و فقہ میں ہوتا تھا۔
- (۶) عبدالرحمن بن ابولیل۔

- (۷) سعید بن جبیر۔  
 (۸) عمرو بن شریک۔  
 (۹) ابراہیم بن یزید نخعی۔  
 (۱۰) شریح بن حارث کندی: یہ کوفہ کے قاضی تھے۔ قاضی کی حیثیت سے انھیں بے حد شہرت حاصل ہوئی۔  
 (۱۱) اسود بن یزید نخعی۔  
 ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات تھے جنہوں نے اپنے دور میں کوفہ اور اس کے نواح میں دینی علوم پھیلانے کے لیے تگ و تاز کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ
- ۴۔ بصرہ

بصرے سے تعلق رکھنے والے اصحاب فتویٰ اور ارباب مسند صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اس شہر اور علاقے میں علم حدیث کی شمع روشن کرنے اور روشن رکھنے میں بڑی محنت اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ان کے بعد جن تابعین نے وہاں خدمات سرانجام دیں اور تدریس حدیث کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے رکھا، ان میں ابو العالیہ رفیع بن مہران، ابوالشعشا جابر بن یزید، حسن بن ابوالحسن بصری، محمد بن سیرین اور قتادہ بن دعامہ سدوجی کے نام رجال کی کتابوں میں ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے شاگردوں نے بھی اس باب میں بہت کام کیا، رحمۃ اللہ علیہم۔

## ۵۔ شام

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں کچھ مدت کے لیے حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم کو معلم اور مفتی کا منصب عطا کر کے شام کے علاقے میں بھیجا تھا۔ ان حضرات نے وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا۔

ان صحابہ کرام کے بعد تابعین عظام میں سے وہاں مشہور اصحاب افتاء اور اہل حدیث مندرجہ ذیل حضرات ہوئے۔

عبدالرحمن بن غنم، ابودریس خولانی، عمر بن عبدالعزیز، قبیصہ بن ذویب، رجاء بن حیوۃ اور کھول بن مسلمہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔۔۔ یہ وہ تابعین کرام ہیں جنہوں نے حضرت معاذ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت معاذ بن ابوسفیان، حضرت انس بن مالک اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے علم حدیث و فتویٰ حاصل کیا۔

۶۔ مصر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصر فتح کیا۔۔۔ یہ انتہائی ترقی یافتہ ملک تھا اور وہاں کے لوگ بے حد امیر اور زیور علم سے آراستہ تھے۔ عقل و فہم میں بھی ان کا مقام بڑا بلند تھا، تہذیب و شائستگی کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی۔ وہاں کا منصب افتاء حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا تھا۔ ان کے بعد وہاں کے تابعین میں جن حضرات نے خصوصیت کے ساتھ شہرت پائی اور ان دیار میں علم حدیث عام کیا، ان میں ابوالخیر مرشد بن عبد اللہ اور یزید بن حبیب رحمہم اللہ کے اسامے گرامی شامل ہیں۔ یہ دونوں بزرگ علاقہ مصر کے مفتی اور محدث تھے۔

۷۔ یمن

حدیث و فقہ اور افتاء کے مشہور مراکز میں ساتواں مرکز یمن تھا۔ اس مرکز کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عرصے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عامل و قاضی اور معلم مقرر کر کے بھیجا۔ پھر آپ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو اس خدمت پر مامور کر کے یمن روانہ فرمایا۔ ان حضرات نے وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم سے متمتع کیا اور انھیں مسائل دینی سکھائے۔

وہاں کے تابعین میں سے طاؤس بن کیسان، وہب بن منبہ اور یحییٰ بن ابوکثیر نے بڑی شہرت پائی۔ رحمۃ اللہ علیہم  
 یہی وہ حضرات ہیں جن کی وجہ سے یمن اور اس کے گرد و نواح میں علم حدیث پھیلا اور لوگوں میں دینی مسائل کی سمجھ پیدا ہوئی۔

### فقہ و فتویٰ کے دو اہم مراکز۔۔۔ حجازی اور عراقی

حدیث اور فقہ و فتویٰ کے یہ سات مراکز جن کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک ہی میں معرض وجود میں آ گئے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ عالم اسلامی میں فقہ و افتاء کے دو اہم مرکز قائم ہوئے۔ ایک کوفہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سنی و مگرانی میں عراقی فقہ کا مرکز قرار پایا۔ دوسرا مدینہ منورہ جسے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی علمی سیادت و قیادت میں حجازی فقہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں فقہ اسلامی کی تدوین کا آغاز ہوا۔

معاشرہ چوں کہ جامد نہیں ہے، تغیر پذیر ہے، نوع بنوع مسائل کا گہوارہ ہے اور ہر آن یہاں مسائل جنم لیتے ہیں اور اسلام دائمی مذہب ہے، لہذا دونوں کا یکساں اور ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہے۔ اس کا احساس پہلی صدی ہجری میں اسی وقت ہونے لگا تھا جب مسائل میں تنوع پیدا ہوا، ہمہ گیری ابھری اور ان کی تعبیر میں بوقلموں افکار نے ایسی صورت اختیار کر لی جس کے پیش نظر اہل علم کو تدوین فقہ کی طرف عنان توجہ مبذول کرنا پڑی اور کتاب و سنت کی روشنی میں اسے باقاعدہ ایک مستقل شرعی علم کے قالب میں ڈھالنے کا جذبہ ان کے قلب و ذہن میں ابھرا۔ یہ چار متعارف و مشہور فقہیں ہیں جن کا چند الفاظ میں یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

### امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

تدوین فقہ کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سرفہرست نظر آتا ہے۔ وہ پہلے جلیل القدر بزرگ ہیں جو اقتدار بنو امیہ کے خاتمے کے بعد اپنے تلامذہ کی

ایک جماعت کے ساتھ اس میدان میں اترے۔ حضرت امام کی ولادت ۸۰ ہجری میں ہوئی اور ۱۵۰ ہجری میں وہ اس دنیا سے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

### طریق استنباط

امام ابو حنیفہ کا مسائل دینی میں طریق استنباط یہ تھا کہ پہلے جواب مسئلہ کتاب اللہ سے تلاش کرتے۔ وہ جواب کتاب اللہ کی عبارت النص سے ہو، دلالت النص سے ہو، اشارۃ النص ہو یا اقتضاء النص سے۔ اگر اس میں کامیاب ہو جاتے تو اسی کا تعین کرتے۔ اگر اس کا کتاب اللہ سے سراغ نہ ملتا یا کتاب اللہ کی روشنی میں بات کا فیصلہ نہ ہو سکتا تو سنت مشہورہ کی طرف رجوع فرماتے۔ اگر سنت مشہورہ کے ذریعے سے کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتے تو اہل فتویٰ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور قضایا میں اس کی تلاش شروع کرتے۔ اجماع کی طرف آتے اور اہل عراق صحابہ اور اہل عراق تابعین کے مسلک و مذہب کو محل فکر ٹھہراتے۔ اگر یہاں سے بھی جواب نہ ملتا تو قیاس اور استحسان سے مسئلے کا حل ڈھونڈتے۔

احادیث کے متعلق یہ بات ان کے پیش نظر رہتی کہ اگر مجازی اور عراقی صحابہ سے مروی مرفوع احادیث میں اختلاف ہوتا تو بر بنائے فقہ راوی، روایت فقہیہ کو ترجیح دیتے۔

### قبل از وقوع واقعہ پر غور

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ امام ابو حنیفہ سے قبل اصحاب فتویٰ قضاۃ میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب تک کوئی نئی صورت حال ابھر کر سامنے نہ آتی، مسئلے پر غور نہ کرتے۔ لیکن امام صاحب کا نقطہ نظر اس کے برعکس یہ تھا کہ جن امور میں لوگوں کے جتلا ہونے کا اندیشہ یا امکان ہے، ان پر اہل علم کو پہلے ہی غور کر لینا چاہیے تاکہ نئی صورت حال پیش آ جانے کی صورت میں اور عند النوازل انھیں کوئی حیرانی نہ ہو اور وہ اسے ایسی بات نہ سمجھیں جس سے وہ پہلے سے آگاہ نہ تھے۔

امام صاحب کا نقطہ فکر یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان معاملات سے کوئی

فخص دو چار ہو جائے تو از روئے شریعت اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان بہت سے مسائل فقہیہ کو ہدف فہم ٹھہرایا جن کا عالم وقوع میں آنا ممکن تھا۔  
امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں چار شاگردوں نے بڑی شہرت پائی اور وہ عمود فقہ حنفی کہلائے۔ وہ ہیں امام زفر امام ابو یوسف امام محمد اور امام حسن بن زیاد۔ ان کی وجہ سے فقہ امام ابو حنیفہ اور ان کے مسلک کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

فقہ اسلامی کے دوسرے مضبوط ترین ستون امام مالک بن انس بن مالک بن ابو عامر ہیں۔ امام مالک مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کے پردادا حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے جنھوں نے غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات نبوی میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی تھی۔

امام مالک نہایت موثر شخصیت کے مالک تھے حدیث و فقہ میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کی کتاب ”موطا“ نے اہل علم میں بے حد شہرت پائی اور ہر حلقے میں متداول و مقبول ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس دور کے بارہ سو اہل علم نے ان سے موطا پڑھا۔

استنباط

امام مالک کم و بیش پچاس برس مسجد نبوی میں مسند درس و افتاء پر رونق افروز رہے اور بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ امام مالک کے نزدیک تعامل اہل مدینہ مستقل حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ استنباط مسائل میں فقہ مالکی کے ذرائع مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) تعامل اہل مدینہ۔

(۴) قیاس۔

(۵) استصلاح۔

امام مالک کی ولادت ۹۳ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہیں ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جنہوں نے امام کے فقہی اور شرعی نقطہ نظر کی بے حد اشاعت کی، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

### علم حدیث کی تعظیم

امام مالک بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ ان کا دل عظمت حدیث سے معمور تھا۔ اس کا اندازہ علامہ زرقانی کی اس عبارت سے ہوتا ہے جو انہوں نے مقدمہ شرح موطا میں حضرت امام کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔

اخذ عن تسعمائة شيخ فاکثر وما اُفتي حتى شهد له سبعون اماما  
انه اهل لذلک و کتب بیده مائة الف حدیث و جلس للدرس  
وهو ابن سبعة عشر عاما وصارت حلقة اکبر من حلقة مشائخه  
فی حياتهم، وکان الناس یزدحمون علی بابہ لاخذ الحدیث  
والفقه کا زدحامهم علی باب السلطان، وله حاجب یاذن  
اولا للخاصة، فاذا فرغوا اذن للعامة واذا جلس للفقه جلس  
کیف کان، واذا اراد الجلوس للحدیث اغتسل وتطیب ولبس  
ثيابا جودا وتعمم وقعد علی منصته بخشوع و خضوع وقار  
ویبخر المجلس بالعود من اوله الی فراغه تعظیما للحدیث حتی  
بلغ من تعظیمه له انه لدغته عقرب وهو یحدث ستة عشر مرة  
فصار یصفو ویتلوی حتی تم المجلس ولم یقطع کلامه.

(مقدمہ زرقانی شرح موطا ص ۳۰)

(امام مالک نے نو سو اساتذہ سے علم حاصل کیا اور اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جب تک سترائے کرام نے فتوے کے لیے ان کی صلاحیت کی شہادت نہیں دی۔ اپنے ہاتھ سے انہوں نے ایک لاکھ حدیثیں لکھیں۔ وہ سترہ برس کی عمر میں مسند درس پر بیٹھ گئے تھے اور ان کا حلقہ درس ان کے اساتذہ کی زندگی ہی



میں ان کے حلقہ ہائے درس سے بڑھ گیا تھا۔ حدیث و فقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے ان کے دروازے پر لوگوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا جیسا کہ بادشاہ کے دروازے پر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ایک دربان مقرر کر رکھا تھا جو پہلے ان خاص لوگوں کو ان کے حلقہ درس میں جانے کی اجازت دیتا تھا جو باقاعدگی کے ساتھ ان سے سماع علم کرتے تھے جب وہ فارغ ہو جاتے تو ان عام لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی تھی جو مسائل وغیرہ دریافت کرنے کے لیے آتے تھے۔

حضرت امام فقہ پڑھانے بیٹھتے تو زیادہ اہتمام نہیں کرتے تھے بس آتے اور مسند پر بیٹھ جاتے لیکن جب حدیث پڑھانے کا ارادہ فرماتے تو بے حد اہتمام کرتے۔ غسل فرماتے خوشبو لگاتے نیا لباس زیب تن فرماتے عمامہ باندھتے اور خشوع و خضوع کے ساتھ یک سو ہو کر بیٹھتے۔ درس حدیث کے دوران شروع سے آخر تک مجلس میں خوشبودار چیزیں جلتی رہتیں۔ اس تمام اہتمام کی تہہ میں حدیث کی تعظیم و تکریم کا مقصد پنہاں تھا۔ تعظیم حدیث کا جذبہ ان کے دل میں یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ ان کی قمیص میں بچھو داخل ہو گیا اور اس نے ان کے جسم پر سولہ دفعہ ڈنگ مارا۔ تکلیف سے ان کی حالت متغیر ہو ہو جاتی اور چہرے کا رنگ بدل بدل جاتا لیکن وہ مجلس کے اختتام تک بہ دستور حدیث کا درس دیتے رہے۔

یہ تھا حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث کا طریقہ اور یہ تھی ان کے دل میں ارشادات پیغمبر (ﷺ) کی تعظیم و تکریم۔

ان کی کتاب موطا کو اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں بے حد پذیرائی بخشی اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور علمائے کرام نے ہر شرح کا نہایت ذوق و شوق اور اخلاص و توجہ سے مطالعہ کیا۔ خود امام مالک سے موطا بارہ سو اصحاب علم نے پڑھا۔ اس کے بعد آج تک اس کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور اب تک لاکھوں اصحاب علم اسے پڑھا چکے اور پڑھ چکے ہیں۔

موطا کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے

موطا کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔  
 وان شئت الحق الصراح فقس کتاب الموطا بکتاب الآثار لمحمد  
 والامالی لابن یوسف تجلینہ و بینہما بعد المشرقین؛ فما سمعت  
 احداً من المحللین والفقہاء تعرض لہما واعتی بہما؟<sup>(۱)</sup>  
 (اگر تم موطا کی مقبولیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس کا مقابلہ  
 امام محمد کی کتاب الآثار اور امام ابو یوسف کے الامالی سے کرو اور پھر سوچو کہ  
 کسی محدث اور فقیہ نے ان دونوں کی کتابوں سے کوئی تعرض کیا اور انھیں  
 لائق اعتناء گردانا؟ واقعہ یہ ہے کہ موطا امام مالک اور ان دونوں بزرگوں کی  
 کتابوں کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہے)

نواب صدیق حسن کا فرمان

حضرت سید نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فارسی کتاب ”اتحاف  
 العلماء“ میں موطا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا یہاں اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ  
 فرماتے ہیں۔

”موطا امام مالک قدیم بابرکت و باسعادت کتاب ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے  
 کہ ائمہ اربعہ کی تصانیف میں سے حدیث کے موضوع پر اس وقت صرف یہی  
 کتاب دست یاب ہے۔ اس کے علاوہ کسی امام کی کوئی کتاب موجود نہیں  
 ہے۔ دوسرے ائمہ کی جو مسانید دنیا سے علم میں مشہور ہیں وہ خود ان کی تصنیف  
 کردہ نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے ان کی مرویات جمع کی  
 ہیں اور ان کی مسند کے نام سے موسوم کر دی گئی ہیں۔“  
 اس سے آگے نواب صاحب رقم فرماتے ہیں۔

”حلیہ میں ابو نعیم، امام مالک سے روایت بیان کرتے ہیں کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں موطا کو کعبۃ اللہ میں آویزاں کر دیتا ہوں اور لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ اس کے مطابق عمل کریں۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے روک دیا، اس لیے کہ یہ کتاب تعامل اہل مدینہ کے مطابق تصنیف کی گئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بعض مسائل کی تعبیر میں مختلف آراء رکھتے ہیں اور متعدد شہروں اور علاقوں میں پھیل گئے ہیں اور سب کا نقطہ نظر صحیح ہے۔ ہارون الرشید نے میری یہ بات سن کر کہا: اے ابو عبد اللہ! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔“

اس سے آگے نواب صاحب طبقات ابن سعد کے حوالے سے امام مالک کی یہ روایت بیان کرتے ہیں۔

”عباسی خلیفہ منصور نے حج کے موقع پر ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں آپ کی کتاب موطا کا ایک ایک نسخہ اپنی قلمرو کے ہر شہر کے مسلمانوں کو بھجوادوں اور انھیں حکم دوں کہ اس کے مندرجات کے مطابق عمل کریں اور اس سے سرمو تجاوز نہ کریں جو کچھ اس میں مرقوم ہے اس کے پابند رہیں۔ لیکن میں نے کہا: امیر المؤمنین! لوگوں کو یہ حکم نہ دیجیے اس لیے کہ لوگوں کو پہلے سے احادیث پہنچ گئی ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان کے مطابق عمل کر رہے ہیں اور وہ صحیح سمت اختیار کیے ہوئے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔“ (اتحاف البیلاص ۱۶۳، ۱۶۵)

یہ ہے نہایت مختصر الفاظ میں موطا امام مالک کی اہمیت و فوقیت اور یہ ہے خود امام مالک کا مقام و مرتبہ۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

### امام شافعی

فقہ اسلامی کے تیسرے عظیم المرتبت امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس بن عثمان بن شافع الشافعی المصطفیٰ ہیں۔ امام شافعی کی ولادت ۱۵۰ ہجری میں صوبہ عسقلان کے ایک مقام ”غزہ“ میں ہوئی۔ انھوں نے امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی سے حصول علم کیا۔

امام شافعی کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تین مسالک فقہی کے جامع تھے۔ مسلک محدثین اور مسلک اہل حجاز کے امام مالک کے واسطے سے اور مسلک اہل عراق کے امام محمد کی وساطت سے۔ اس طرح وہ تینوں مسالک پر عبور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسی فقہ مدون فرمائی جس میں محدثین، اہل حجاز اور اہل عراق تینوں کا اسلوب فکر کارفرما تھا۔

جوفقہ انھوں نے عراق میں مرتب کی اس میں عراقی رنگ غالب ہے اسے ان کا مذہب قدیم کہا جاتا ہے۔ پھر مصر تشریف لے جانے کے بعد جوفقہ مصر میں ترتیب دی اس میں حجازی رنگ نمایاں ہے اسے ان کے مذہب جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام شافعی کی مدونہ فقہ کو ”فقہ شافعی“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

### وسعت علم

حافظ ابن حجر نے ”توالی التائیس بمعالی الامام محمد بن ادریس“ کے نام سے امام شافعی کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے اس میں وہ حضرت امام کی وسعت علم اور فہم و فراست کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔

فكان الشافعي رجلا قرشي العقل والفهم والذهن، صافي العقل والفهم واللباغ سريع الاصابة<sup>(۱)</sup>

(امام شافعی قرشی بے حد عاقل و فہیم تھے۔ ان کا ذہن و دماغ نہایت صاف تھا۔ بات کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے)

اسی کتاب میں حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کا ذکر کیا ہے اور الگ الگ ان کے نام تحریر کیے ہیں۔ پھر لکھا ہے۔

فهؤلاء شيوخه الذين نقل عنهم العلم والحديث والفقه والاخبار  
سمع منهم بمكة والمدينة واليمن والعراق ومصر وكان مكثرًا

۱۔ توالی التائیس بمعالی الامام محمد بن ادریس ص ۵۶۔

من الحديث. (۱)

(ان تمام حضرات کا شمار امام شافعی کے اساتذہ میں ہوتا ہے ان سے انھوں نے حدیث و فقہ اور رجال کا علم مکہ مدینہ عراق اور مصر میں حاصل کیا اور حدیث انھوں نے کثرت سے روایت کی) ابن خلکان لکھتے ہیں۔

اجتمعت فیہ من العلوم بکتاب اللہ وسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکلام الصحابة و آثارهم واختلاف اقاویل العلماء وغیر ذالک من معرفة کلام العرب واللغة والعربی والشعر مالم یجتمع فی غیرہ. (۲)

(امام شافعی کی ذات میں قرآن و حدیث اقوال و آثار صحابہ اختلاف اقوال علما کلام عرب علم لغت اور شاعری وغیرہ سب علوم جمع تھے۔ علوم کی جو جامعیت ان میں پائی جاتی تھی کسی میں نہ تھی۔)

### امام شافعی کا بیج استدلال

امام شافعی مسائل میں ظاہر قرآن سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے بعد حدیث کی طرف رجوع فرماتے ہیں اگرچہ وہ حدیث کسی مقام کے اہل علم سے حاصل کی گئی ہو لیکن شرط یہ ہے کہ حدیث متصل ہو اور اس کے راوی ثقہ ہوں۔ اسی بنا پر علمائے اہل حدیث میں امام شافعی کو حسن قبول حاصل ہوا۔ اہل بغداد تو انھیں ناصر ابنہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔

حدیث کے بعد وہ اجماع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن حدیث اور اجماع تینوں میں مسئلے کی عقدہ کشائی نہ ہو تو قیاس پر اس شرط کے ساتھ عمل کرتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی اصل معین ہو۔

اہل عراق کے استحسان اور اہل حجاز کے استصلاح کے وہ مخالف ہیں۔ البتہ

”استدلال“ کو قابل عمل مانتے ہیں جو اس کے قریب قریب ہے۔  
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۰۴ ہجری کو مصر میں وفات پائی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

فقہ اسلامی کے چوتھے جلیل القدر امام ابو عبد اللہ احمد بن حنبل بن ہلال ذہلی مروزی ہیں جو ۱۶۴ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔

امام احمد بن حنبل کی فقہ بہت صاف اور سادہ ہے۔ درحقیقت وہ طریق اہل حدیث کو پسند فرماتے ہیں جس میں درایت و رائے کا حصہ بہت کم ہے۔  
فقہ حنفی کی تحصیل انھوں نے امام ابو یوسف سے کی۔ فقہ شافعی کے لیے براہ راست امام شافعی کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ تکمیل حدیث کے لیے مختلف محدثین کی خدمت میں گئے اور اس میں مہارت پیدا کی۔ چنانچہ علم حدیث میں ان کے عمق و انہماک کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

وكان اعظمهم شانا و اوسعهم رواية و اعرفهم للحديث مرتبة و اعلمهم فقها احمد بن حنبل ثم اسحاق بن رهاويه. (۱)

(محدثین میں سب سے بڑے مرتبے والے سب سے زیادہ روایت والے  
سب سے زیادہ مراتب حدیث کو پہنچانے والے اور نصوص کے معانی کو سب  
سے زیادہ سمجھنے والے احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔)

اصول استدلال

مسائل شرعی کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا اصول یہ تھا کہ قرآن حکیم اور صحیح السند حدیث پر عمل کی دیواریں استوار کی جائیں۔ درایت، تنقیح مناط اور قیاس سے وہ حتی الامکان دامن کشاں رہتے ہیں۔ مالکیہ کا تعامل اہل مدینہ بھی ان کے نزدیک قابلِ حجت نہیں۔ وہ مرفوع اور موقوف صحیح حدیث کو لائق عمل قرار دیتے ہیں۔ قیاس سے بہ درجہ

۱۔ حجة الله البالغة ج ۱ ص ۱۵۰۔ باب الفرق بین اہل الحدیث و اہل الرائی۔

مجبوری کام لیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے ۷۷ سال عمر پا کر ۱۲۔ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری کو سفر آخرت

اختیار کیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں فقہی مذاہب کی تاریخ، ان کے عالم وجود میں آنے کی وجہ فقہ اسلامی

کے مراکز سب سے کا تذکرہ ائمہ فقہ اسلامی کا ذکر اور یہ ہیں ان کے مقرر کردہ اصول و ضوابط۔



## گیارھواں باب

# فقہ اور اس کے حدود و اطلاق

گزشتہ سطور میں موضوع کی رعایت سے بہ قدر ضرورت فقہی مذاہب اور ان کی تاریخ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ فقہ کیا ہے اور اس کے حدود و اطلاق کیا ہیں؟

فقہ کے لفظی اور لغوی معنی قرآن کی رو سے

فقہ کے لفظی معنی علم و ادراک، سمجھ بوجھ، فہم و فراست اور عقل و فطانت کے ہیں۔ قاموس، اقرب الموارد اور مجمع البحار وغیرہ کتب لغت میں اس کے لغوی معنی یہی مرقوم ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بھی مختلف مقامات پر انہی معنوں میں آیا ہے۔

۱۔ سورہ نساء میں مخالفین اسلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے اور اگر کسی تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ یہ تکلیف آپ کی وجہ سے پہنچی ہے۔

۱. قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ فَمَالِ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ بِفَقْهُونَ

حَدِيثًا (النساء: ۷۸)

(اے پیغمبر انھیں کہہ دیجیے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہو یہ سمجھ بوجھ کے قریب ہی نہیں پہنچتے۔)

۲. وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ. (الانعام: ۲۵)

(اور ہم نے مکرین حق کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ بات کی سمجھ تک نہیں پہنچتے۔)



۳. اَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفَ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ. (الانعام: ۶۵)  
(اے پیغمبر! دیکھو ہم کس طرح گونا گوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں بوجھیں۔)
۴. قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُفْقَهُوْنَ. (الانعام: ۹۹)  
(جو لوگ بات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں ان کے لیے ہم نے اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔)
۵. لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا. (الاعراف: ۱۷۹)  
(ان کے دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔)
۶. ..... مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ. (الانفال: ۶۵)  
(..... کافروں کا گروہ ایسا گروہ ہے جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے۔)
۷. قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُوْنَ. (التوبہ: ۸۰)  
(اے پیغمبر! کہہ دیجیے دوزخ کی آگ کی گرمی تو اس سے کہیں زیادہ گرم ہو گی کاش انھوں نے سمجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا۔)
۸. وَطَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ. (التوبہ: ۸۷)  
(اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی پس یہ کچھ سمجھتے نہیں۔)
۹. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ لَّيَشْفَقَهُوْا فِي الدِّينِ. (التوبہ: ۱۲۲)  
(پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی جو کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرتی۔)
۱۰. صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ. (التوبہ: ۱۲۷)  
(اللہ نے ان کے دل پھیر دیے کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے کورے ہو گئے۔)
۱۱. قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقْتَ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ. (ہود: ۹۱)  
(لوگوں نے کہا: اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں تو

ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔)

۱۲. وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ.

(بنی اسرائیل: ۴۴)

(ہر شے اللہ کی پاکیزگی کا زمرہ بلند کر رہی ہے مگر تم ان کی زمرہ بخیاں سمجھتے نہیں۔)

۱۳. وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ. (بنی اسرائیل: ۴۶)

(اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف ڈال دیے ان کی سمجھ کا ہم نہیں دیتی۔)

۱۴. إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ. (الکھف: ۵۷)

(بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ کوئی بات سمجھ نہیں پاتے۔)

۱۵. وَجَدَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا.

(الکھف: ۹۳)

(ذوالفرقین) دو پہاڑوں کی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کی جائے تو بالکل نہیں سمجھتی۔)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کے مطابق فرعون کی طرف احکام خداوندی کی تبلیغ کے لیے روانہ ہونے لگے تو یہ دعا مانگی۔

۱۶. رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَأَخْلِلْ عُقْدَةَ مِنْ

لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي. (طہ: ۲۵، ۲۸)

(اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام میرے لیے آسان فرما دے۔ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ جائیں۔)

۱۷. بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا. (الفتح: ۱۵)

(بلکہ یہ لوگ اصل بات کم ہی سمجھتے ہیں۔)



وسلم) ہمیشہ امور حق پر قائم رہے گی؛ قیامت تک اس کے مخالفین اسے تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔)

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو بھلائی اور خیر سے نوازنا چاہے اسے دینی معاملات کی سمجھ بوجھ سے آشنا فرما دیتا ہے اور پھر ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جن حقائق دیہیہ سے مجھے سرفراز کیا جاتا ہے، میں وہ حقائق تمہیں بتا دیتا ہوں اور دین کی ہر بات تمہارے علم میں لے آتا ہوں۔ بہت سے لوگ اس امت کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں گے اور اذیت رسانی کا ہر حربہ استعمال کریں گے، مگر اسے اس نوع کا کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے جو اسے ختم کرنے کا باعث ہو سکے۔ یہ امت قیامت تک اپنے فرائض تبلیغ مختلف انداز سے حالات کے مطابق سرانجام دیتی رہے گی۔

ایک حدیث کے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے الفاظ یہ ہیں۔  
الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خيارهم في الجاهلية  
خيارهم في الاسلام اذا فقهوا۔<sup>(۱)</sup>

(انسان بھی اسی طرح کی کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کانیں ہیں۔  
جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بھلائی کے حامل تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بھلائی کے  
حامل ہیں جب کہ وہ علم و ادراک کی نعمت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔)

اس حدیث کے الفاظ بھی معنی و مطلب کے اعتبار سے بالکل صاف ہیں۔ یعنی  
انسانوں کی حیثیت وہی ہے جو سونے اور چاندی کی کانوں کی ہے۔ کانوں میں سونے اور  
چاندی کے بے شمار ڈھیر پڑے ہیں۔ انسانوں کے ذہن و فکر میں بھی بھلائی، نیکی، صالحیت  
اور امور خیر کی بہت بڑی مقدار موجود ہے، بشرطیکہ وہ علم و عقل سے روشناس ہوں، جو لوگ  
دور جاہلیت میں مکارم اخلاق، شرافت و نجابت اور علم و فہم کے مالک تھے، دور اسلام میں بھی  
وہ ان اوصاف سے متصف ہیں۔ انسان اگر طبع خیر کا حامل ہو اور عقل و شعور کی دولت سے

۱۔ صحیح مسلم۔ مشکوٰۃ، کتاب العلم۔

کوئی حصہ اسے میسر آیا ہو تو وہ ہر دور اور ہر حال میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

## حضرت عمر فاروق کا قول

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

تفقهوا قبل ان تسودوا۔<sup>(۱)</sup>

(قبل اس کے کہ تمہیں کسی منصب پر فائز کیا جائے، علم و دانائی حاصل کر لو)  
کسی کو کسی بھی عہدے پر متمکن کیا جائے، کسی معاملے کی سیادت اس کے سپرد کی جائے، کسی ذمے داری کے مقام پر اسے متعین کیا جائے، کہیں بھی اس کی تقرری عمل میں لائی جائے، اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس عہدہ و منصب کے آداب اور تقاضوں سے کامل آگاہی حاصل کی جائے اور اس کے مالہ و ماعلیہ سے پوری طرح واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کو وسیع معنوں میں لینا چاہیے، جس میں حکومتی منصب بھی شامل ہے اور دینی ذمے داریاں بھی اس کے ذیل میں آتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی منصب پر فائز ہو گئے، لیکن اس کے تقاضوں کا کوئی علم نہ ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس منصب کی ذمے داریاں کس انداز کی ہیں اور وہ کس طریقے سے پوری کی جائیں۔

یہاں فقہ یعنی ”تفقهوا“ کا اطلاق حکومت و سیادت کے معاملات سے آگاہ ہونے اور اس نہایت اہم ذمہ دارانہ منصب کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور اس کی جزئیات و تفصیلات سے متعلق عبور حاصل کرنے پر ہوا ہے۔ لفظ ”تفقهوا“ سے یہاں وہ فقہ مراد نہیں، جسے اصطلاحی معنوں میں فقہ کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ مروجہ فقہ کا علم حاصل کرو اور جی لگا کر اس کی دو چار کتابیں پڑھ لو۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغباط فی العلم والحدیث

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

## مختلف معانی

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے:

الفقه هو التوصل على علم غائب بعلم شاهد فهو اخص من العلم.<sup>(۱)</sup>

(فقہ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنے کے ہیں)  
اس کے ساتھ ہی مرقوم ہے۔

والفقه العلم باحكام الشريعة يقال فقه الرجل فقاها اذا صار فقيها.<sup>(۲)</sup>

(احکام شریعت کا علم حاصل کرنے کو فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اس علم کو سمجھ لیا۔)

امام ابن عبدالبر نے اسے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ وہ اس کے اصطلاحی معنوں کی وضاحت کرتے ہوئے ہشام بن عبداللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

من لم يعرف اختلاف الفقهاء فليس بفقيه.<sup>(۳)</sup>

(جو شخص مسائل میں اہل علم کے باہمی اختلاف سے آگاہ نہیں، اسے فقیہ نہیں کہا جاسکتا۔)

اس سلسلے میں وہ قتادہ کے یہ الفاظ بیان فرماتے ہیں۔

من لم يعلم الاختلاف لم يشم الفقه بانفه.<sup>(۴)</sup>

(جو شخص اصحاب علم کے اختلافات کا علم نہیں رکھتا، اس نے فقہ کو سونگھا تک نہیں۔)

ان الفقيه من فقه في القرآن و عرف مكيدة الشيطان.<sup>(۵)</sup>

(فقیہ وہ ہے جو قرآن کو سمجھتا ہے اور شیطان کی فریب کاریوں سے آگاہ

۱۔ مفردات القرآن، ذیل لفظ فقہ۔ ۲۔ مفردات القرآن۔

۳۔ جامع بیان العلم، ص ۳۶۔ ۴۔ ایضاً ص ۳۶۔ ۵۔ ایضاً ص ۳۷۔

(ہے۔)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ کیا اہل علم کے اختلافات سے مراد اہل  
الرأے کے اختلافات ہیں؟

جواب دیا: اس سے مسائل کی تعبیر میں صحابہ کے باہمی اختلافات مراد ہیں۔

مجاہد کا بیان ہے۔

الفقیہ من خاف اللہ.

(فقیہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بیان کرتے ہیں: جس  
کے الفاظ یہ ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الا ابتکم بالفقیہ؟ قالوا بلی. قال من لم یقنط الناس من رحمة اللہ

ولم یؤسہم من روح اللہ ولم یؤمنہم من مکر اللہ ولا یدع القرآن

رغبة عنہ الی ماسواہ. الا لاخیر فی عبادۃ لیس فیہا تفقہ. (۱)

(کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ صحابہ نے عرض

کیا: ضرور بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمتوں سے

ناامید اور اس کی کرم نوازیوں سے مایوس نہ کرے اللہ کی تدبیروں سے انہیں

بے خوف نہ کرے قرآن سے بے رغبتی کر کے ماسوا کو مرکز توجہ نہ ٹھہرائے۔

خبردار! جس عبادت میں تفقہ نہ ہو وہ خیر سے خالی ہے)

امام ابن عبد البر نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا ہے۔

رب حامل فقہ غیر فقیہ و رب حامل فقہ الی من ہوا فقہ منہ.

(یعنی بسا اوقات فقہ کا مبلغ خود فقیہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ

جسے فقہ کی تلقین کی جا رہی ہو وہ تلقین کرنے والے سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔)

ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں۔

فسمی الحديث فقها مطلقا وعلما. <sup>(۱)</sup>

(یعنی حدیث اور علم کو فقہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔)

ليس الفقه بكثرة المسائل ولكن الفقه يوتيه الله من يشاء من خلقه. <sup>(۲)</sup>

(فقہ زیادہ مسائل بیان کرنے کا نام نہیں، بلکہ یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جسے وہ عنایت فرمادے۔)

”فقہ اکبر“ مشہور کتاب ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔ فقہ کی تعریف کے بارے میں اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

الفقه معرفة النفس مالها وما عليها. <sup>(۳)</sup>

(نفس پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کا نام فقہ ہے۔)

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جب منطق اور فلسفہ وغیرہ یونانی علوم کی نشر و اشاعت ہونے لگی اور متکلمین نے مناظرات و نزاعات کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف مسائل میں تاویلات و تعبیرات نے راہ پائی تو علم الکلام کو بھی ”فقہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

بہر کیف فقہ کا لفظ صرف چند معروف کتابوں میں درج شدہ مسائل پر ہی نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے حدود و اطلاق بہت وسیع ہیں، اختصار کے ساتھ اس کے دائرے میں مندرجہ ذیل امور آتے ہیں۔

✽ فکر و دانش اور فہم و فراست۔

✽ علم و ادراک اگرچہ وہ علم کسی نوعیت کا ہو۔

✽ مسائل شرعی میں صحابہ کرام کے مجتہدانہ اختلافات سے آگاہی۔

✽ متقدمین کی اجتہادی آراء سے کامل واقفیت۔

۱۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۳۵۔ ۳۔ فقہ اکبر ص ۱۰۔



- ❁ قرآن پر عبور اور اس کے احکام سے مکمل آگاہی۔
- ❁ شیطان کی فریب کاریوں کے مختلف پہلوؤں کا علم۔
- ❁ اللہ کے خوف کا دل میں جاگزیں ہونا اور لوگوں کو اس کی لائق رہتوں اور غیر محدود شفقتوں سے باخبر کرنا۔
- ❁ دین کی نشر و اشاعت کرنا اور حصول علم کے لیے کوشاں ہونا۔
- ❁ انسان پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں پورا کرنا۔
- ❁ حدیث اور علوم حدیث کی معرفت۔
- فقہ میں اور بھی بہت سے علوم آتے ہیں جن کا پڑھنا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ پھر اس کا اطلاق صرف ایک ہی فقہ پر نہیں ہوتا، تمام ائمہ مجتہدین کی آراء و افکار کو غور و فہم کی میزان میں رکھنا اور ان کے اصولوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے ذہن میں وسعت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو تنگ نظری اور تعصب کے دائرے میں محدود کر کے فہمیات سے شناسائی نہیں ہو سکتی اور نہ تہلید کی جکڑ بندیوں سے حصول علم کی راہوں میں کشادگی کے آثار نمایاں ہو سکتے ہیں۔



## تدوین فقہ کی بحث

یہاں ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہ کی تدوین کا سلسلہ کس امام فقہ نے شروع کیا اور کب کیا؟

مولانا شبلی نعمانی نے اس مسئلے پر اپنی تصنیف ”سیرۃ النعمان“ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس علم کی باقاعدہ تدوین کا آغاز حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کا تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا۔ عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتبہ مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت میں قدرتی طور پر لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔“ (۱)

اس کے آگے مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں۔

”امام ابوحنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ تھی اور غیر معمولی متقیانہ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں

سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف بلاد سے ہر روز جو سیکڑوں ضروری استغنا آتے تھے ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے۔ قضاات اور حکام فصل قضا یا میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔“ (۱)

### تدوین فقہ کی مجلس کے ارکان

اس کے بعد مولانا رقم طراز ہیں کہ کن کن حضرات اہل علم کو امام صاحب نے اس اہم خدمت کے لیے اپنے ساتھ ملایا اور وہ حضرات کن کن علمی و تحقیقی خصوصیات کے حامل تھے۔ اس ضمن میں خود انہی کے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

”امام صاحب نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پُرخطر تھا، اس لیے انھوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کیے، جن میں اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لیے ضروری تھے، استاد زمانہ تسلیم کیے جاتے تھے، مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان، مندل، حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔ امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی۔ امام طحاوی نے بہ سند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے: ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد تمیمی، یحییٰ بن ابی زائدہ۔

”امام طحاوی نے یہ بھی پہچانتی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی

اور وہ تیس برس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔“ (۱)

تدوین فقہ کی مدت، تیس سال۔۔۔ ۱۲۱ ہجری سے ۱۵۰ ہجری تک

مولانا شبلی کے بقول تدوین فقہ پر تیس سال صرف ہوئے۔ یعنی ۱۲۱ھ سے ۱۵۰

ہجری تک یہ کام ہوتا رہا اور ۱۵۰ ہجری میں امام صاحب فوت ہوئے۔ (۲)

مولانا شبلی کی یہ تحریر بالکل واضح ہے اور اس کا ایک ایک لفظ نہایت آسانی سے ہر شخص کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض حضرات ائمہ کی معیت میں ۱۲۱ ہجری میں تدوین فقہ کا سلسلہ شروع فرمایا جو ان کی وفات (۱۵۰ ہجری) تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں کہ فقہ کی تدوین کرنے والی جماعت میں امام طحاوی نے جن حضرات کا نام لیا ہے، ان میں یحییٰ بن ابی زائدہ بھی شامل ہیں۔۔۔ پھر مولانا شبلی فرماتے ہیں:

”لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحییٰ ۱۲۰ ہجری

میں پیدا ہوئے، اس لیے وہ شروع سے کیوں کر شریک ہو سکتے ہیں۔“ (۳)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ۱۲۱ ہجری میں جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین فقہ کا آغاز فرمایا اس وقت یحییٰ بن ابی زائدہ جنھیں طحاوی نے اس جماعت کا رکن قرار دیا ہے، بقول شبلی صرف ایک برس کے تھے، لہذا تدوین فقہ والی جماعت میں ان کی شمولیت کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔۔۔ یعنی شبلی نے ان کو اس جماعت سے خارج کر دیا۔

اس باب میں مولانا رحیم آبادی کی تحقیق

یحییٰ حکمے بعد اب اس جماعت کے بعض دوسرے ارکان کے بارے میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی تحقیق کا مطالعہ کیجیے۔

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی معروف اہل حدیث عالم دین تھے جو ہندوستان کے

صوبہ بہار کے موضع رحیم آباد میں ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) کو پیدا ہوئے اور اپریل ۱۹۱۹ء (۱۳۳۸ھ) کو فوت ہوئے۔ انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی ”سیرۃ النعمان“ کے جواب میں ”حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان“ کے نام سے کتاب تصنیف کی جو نہایت محققانہ کتاب ہے اور مولانا شبلی نعمانی سے جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں اس کتاب میں ان کا انتہائی اعتدال اور بے حد توازن سے جواب دیا گیا ہے۔

### امام محمد کی عمر

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ فقہ کی تدوین کرنے والی جماعت میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد بھی شریک تھے اور انھیں ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔۔۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی فرماتے ہیں۔

”امام محمد علیٰ اختلاف الروایات ۱۳۵ھ یا ۱۳۲ھ یا ۱۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ابن خلکان میں بہ ذیل ذکر امام محمد لکھا ہے۔ مولدہ خمس و ثلاثین و قیل اثنین و ثلاثین مائة۔ مولوی عبدالحی صاحب لکھنؤی تطبیق المنجد میں امام محمد کی پیدائش ۱۳۲ھ لکھتے ہیں۔ پھر ان کی شرکت سے وہ مجلس کیوں کر ترتیب دی گئی جو ۱۲۱ھ میں مرتب ہوئی۔<sup>(۱)</sup>

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امام محمد تدوین فقہ والی مجلس کی ترتیب سے ایک روایت کے مطابق چودہ سال بعد ایک کے مطابق گیارہ سال بعد اور ایک کے مطابق دس سال بعد پیدا ہوئے۔ مولانا شبلی بہت بڑے مورخ ہیں، لیکن تعجب ہے اس طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا اور وہ یہ نہیں سوچ سکے کہ جو شخص اس مجلس کی ترتیب سے دس سال بعد پیدا ہوتا ہے وہ اس کا رکن کس طرح بن گیا اور اسے ادب اور عربیت میں اتنا کمال کیسے حاصل ہو گیا؟ جو اس مجلس کی رکنیت کے لیے ضروری ہے؟

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

قاضی ابو یوسف کی عمر

اب قاضی ابو یوسف کی طرف آئیے۔ وہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تاریخ ابن خلکان میں ہے۔

وكانت ولادة القاضي ابي يوسف سنة ثلاث عشرة ومائة  
ببغداد. (۱)

(قاضی ابو یوسف کی ولادت ۱۱۳ھ کو بغداد میں ہوئی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں ان کا سن آٹھ برس کا تھا۔ پھر ۱۲۱ھ میں ان کی شرکت اس مجلس میں کیوں کر ثابت ہوئی؟ کیا آٹھ سال کا بچہ اس قسم کی اونچے درجے کی علمی مجلسوں میں شریک ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے؟

امام زفر کی عمر

امام زفر کے متعلق ابن خلکان میں لکھا ہے۔

مولده سنة عشرة ومائة و توفي في شعبان سنة ثمان و  
خمسين. (۲)

(وہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور شعبان ۱۵۸ھ کو انھوں نے وفات پائی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں امام زفر کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ اتنے کم سن بچے کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تدوین فقہ کی مہتم بالشان مجلس کا رکن تھا قطعاً قرین صواب نہیں ہے۔

حبان کی عمر

حبان کی نسبت تقریب الحمذیہ میں لکھا ہے کہ وہ ۱۷۱ یا ۱۷۲ھ کو ساٹھ برس کی عمر یا کثرت ہوئے۔ الفاظ یہ ہیں۔

حبان بن علي العنبري بفتح العين والنون ثم الراء. ابو علي

۱۔ حسن البیان ص ۱۳۳

۲۔ ایضاً

الکوفی ضعیف من الثامنة وكان له فقه وفضل مات سنة احدى

او اثنين و سبعين وله ستون سنة. (۱)

(حبان بن علی کوفہ کے رہنے والے ہیں، ضعیف ہیں، آٹھویں طبقے سے تعلق

رکھتے ہیں۔ ان میں فقہات اور فضیلت تھی۔ ۱۷۱ یا ۱۷۲ میں ان کا انتقال ہوا،

اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس تھی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں وہ آٹھ نو برس کے ہوں گے۔ اس عمر میں اس قسم کی عظیم

الشان مجلس کی رکنیت ناممکنات میں سے ہے۔

### مندل کی عمر

مندل کی پیدائش جیسا کہ تقریب العہد یب میں مرقوم ہے، ۱۰۳ھ میں ہوئی۔ ۱۲۱ھ

میں وہ سترہ اٹھارہ برس کے تھے۔ اس عمر کے شخص کے لیے یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ

حدیث و آثار میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔

مولانا شبلی نعمانی نے جن ائمہ کرام کو تدوین فقہ کی مجلس کے رکن قرار دیا ہے، ان کے

سنین کے سلسلے کی یہ باتیں ہم نے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی تصنیف ”حسن البیان

فیما فی سیرۃ النعمان“ سے درج کی ہیں۔ یہ کتاب مولانا شبلی کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی

اور ان کے مطالعے میں آئی تھی۔ انھوں نے ”سیرۃ النعمان“ کی دوسری اشاعت میں ان

بعض فروگزاشتوں کی اصلاح بھی کر لی تھی، جن کا ذکر مولانا رحیم آبادی نے ”حسن

البیان“ میں کیا تھا۔ لیکن تدوین فقہ کی مجلس کے ارکان کے سنین سے متعلق مولانا رحیم

آبادی نے جن حقائق کی نشان دہی فرمائی ہے، اس طرف مولانا شبلی نے توجہ نہیں کی۔ اگر وہ

اس طرف توجہ کرتے تو وہ تمام بنیادیں مخدوش ہو جاتی جس پر انھوں نے تدوین فقہ کی

عمارت کھڑی کی ہے۔

فقہ کی تدوین سے انکار نہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مرتبہ فقہات سے بھی کسی کو اختلاف

نہیں ہو سکتا، لیکن جس انداز سے اس کا تذکرہ مولانا شبلی نعمانی نے فرمایا ہے، وہ حقیقت کی

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۳-۱۴۴۔ بحوالہ تقریب العہد یب۔

میزان میں پورا نہیں اترتا۔ انتہائی تعجب انگیز بات ہے کہ اتنے بڑے صاحب مطالعہ مورخ سے اتنی بڑی چوک کیسے ہو گئی۔

سیرۃ النعمان میں انھوں نے جو لغزشیں کھائی ہیں، مولانا رحیم آبادی نے نہایت تحقیق کے ساتھ ان سب کی نشان دہی فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی نے اس کے بعد اس قسم کی خالص مسلکی انداز کی کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کے بعد ان کے رہوار قلم نے تحریر و نگارش کی دوسری راہ اختیار کر لی تھی۔

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا ذکر مولانا غلام رسول مہر نے ”سرگزشت مجاہدین“ میں کیا ہے، جس میں مولانا شبلی پر ان کی تنقید کا ذکر بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمن اور شیخ عبدالرحمن کے ہاں پھانک جش خاں میں قیام فرماتے۔ جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورہ ق اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصری تقریر بھی فرماتے۔ پھر وہ، حافظ عبداللہ غازی پوری اور دوسرے علما و رؤسائے دہلی اکھلا میں جمع ہوتے۔ وہاں ہنٹ کے کرتب دکھائے جاتے، جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اور حافظ عبداللہ غازی پوری کو مجاہدین سے بڑی الفت تھی اور جہاد کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کر کے ان کے لیے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ گھر سے آسودہ حال تھے۔ ہزاروں روپے جماعتی کاموں میں خرچ کیے۔ مولانا شبلی کی ”سیرۃ النعمان“ پر جو انتقاد انھوں نے ”حسن البیان“ کے نام سے شائع کیا، اس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔<sup>(۱)</sup>

### مسائل کی تعداد

تدوین فقہ کی اس مجلس میں جس کا ذکر مولانا شبلی نے فرمایا ہے، جو مسائل زیر بحث آئے اور مدون ہوئے، ان کی تعداد کتنی تھی؟ اس کے متعلق بھی مولانا شبلی ہی کے الفاظ

۱۔ سرگزشت مجاہدین ص ۶۳۳، ۶۳۴۔



ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں۔

”غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا۔ قلائد عقود الدرر والعقیان کے مصنف نے کتاب الصیانتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ شمس الائمہ کروری نے لکھا ہے کہ یہ مسائل چھ لاکھ تھے۔“ (۱)

اس کے آگے مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

”یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔“ (۲)

اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔

”لیکن افسوس ہے کہ یہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کا پتا نہیں چلتا۔“ (۳)

اب خدا ہی جانتا ہے کہ یہ مدونہ فقہی مسائل چھ لاکھ تھے یا بارہ لاکھ نوے ہزار سے زائد تھے اس کا مجموعہ تو مولانا فرماتے ہیں ”ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے۔“

تعب ہے اس درجہ اہم علمی ذخیرہ ضائع کیسے ہو گیا، جب کہ بقول مولانا کے فقہ حنفی کو ہمیشہ حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پھر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بارہ تیرہ لاکھ کے مجموعے میں سے کچھ بھی نہیں بچا۔ صرف فقہ حنفی محفوظ ہے اس کے مسائل ضائع ہو گئے ہیں۔

ایک گزارش اور سنئے!

اس باب کے شروع میں ہم مولانا شبلی کا یہ فرمان پڑھ آئے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ”اطراف بلاد سے ہر روز سیکڑوں ضروری استفتا آتے تھے“ ظاہر ہے مہینے میں وہ کئی ہزار استفتا ہو جاتے ہوں گے۔۔۔ لیکن مولانا نے نشان دہی کسی ایک

استخفا کی بھی نہیں کی۔

آخروہ استخفا کہاں گئے؟

مولانا شبلی کی ایک اور مورخانہ لغزش

مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

”صحابہ میں سے جن لوگوں نے استنباط واجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے ان

میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے۔ عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ۔“ (۱)

اس سے آگے لکھتے ہیں۔

”حضرت علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر کوفہ میں رہے اور وہیں ان کے احکام

کی زیادہ تر توجہ ہوئی، جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ کے تعلق

سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔“ (۲)

مولانا شبلی کے الفاظ قارئین کرام کے مطالعے میں آئے۔ انھوں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مقدس جماعت میں سے چار صحابہ (حضرت عمرؓ

حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ) کے بارے

میں فرمایا ہے کہ انھوں نے ”استنباط واجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے۔“

اصل معاملہ

مولانا شبلی نے جو کچھ فرمایا ہے، کیا وہ صحیح ہے؟ اس کے لیے بھی ہم حضرت مولانا

عبدالعزیز رحیم آبادی کے باب علم پر دستک دیتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ

اصل معاملہ کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

”یہ بات غلط ہے کہ صحابہ میں صرف یہی چار بزرگ فقہ اور استنباطیہ اہل

میں ممتاز تھے۔ فقہ و مسائل میں جو صحابہ ممتاز تھے، امام ابن حزمؒ نے سنائیں

صحابہ کے نام گنوائے ہیں اور کثیر الفتویٰ ان میں سے سات ہیں۔“ (۳)

۱۔ سیرۃ الہمامان ص ۱۳۷۔ ۲۔ ایضاً

۳۔ حسن البیان ص ۱۳۰۔

اس کے بعد وہ فتح المغیث (صفحہ ۳۷۹) کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

والمکثرون منهم افتاء سبعة عمرو علی وابن مسعود وابن عمر  
وابن عباس و زید بن ثابت و عائشه. قال ابن حزم. یمکن ان  
یجمع من فتیا کل واحد من هؤلاء مجلد ضخیم.

(یعنی صحابہ میں سے کثیر الفتویٰ سات بزرگ ہیں، حضرت عمر، علی، عبداللہ بن  
مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی  
اللہ عنہم۔ امام ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص کے فتوے اس قدر  
ہیں کہ اگر جمع کیے جائیں تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔)

یہ بات بھی غلط ہے کہ حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود زیادہ کوفہ میں رہے۔  
حضرت علی ۳۶ ہجری میں مدینے سے نکلے اور ۳۸ ہجری تک جنگ جمل،  
جنگ صفین اور جنگ نہروان میں مشغول رہے۔ اس کے بعد کوفہ میں صرف  
دو سال ان کی اقامت رہی۔<sup>(۱)</sup>

اس سے آگے مولانا رحیم آبادی الاصابہ فی تمییز الصحابہ کی جلد ۴ کے صفحہ ۴۷۷ سے یہ  
الفاظ درج فرماتے ہیں۔

بویع بعد قتل عثمان فی ذی الحجة سنة خمس وثلاثین و  
كانت واقعة الجمل فی جمادی الثانية سنة ست وثلاثین و  
وقعة صفین فی سنة سبع وثلاثین و وقعة النهروان مع الخوارج  
فی سنة ثمان وثلاثین. ثم اقام سنتین يعرض علی قتال البغاة  
فلم یتھیأ الی ان مات.

(یعنی حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں  
خلیفہ ہوئے اور جنگ جمل کا واقعہ ۳۶ ہجری میں پیش آیا۔ جنگ صفین ۳۷  
ہجری میں اور خوارج کے ساتھ جنگ نہروان ۳۸ ہجری میں ہوئی۔ اس کے

بعد حضرت علی نے دو سال (کوفہ میں) اقامت اختیار کی۔ اس اثنا میں لوگوں کو باغیوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتے رہے، لیکن اس کا سامان نہ مہیا ہو سکا اور وہ شہید ہو گئے۔

مولانا رحیم آبادی تحریر فرماتے ہیں۔

”اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچیس برس یعنی ۳۵ ہجری تک مدینہ طیبہ میں رہے اور کوفہ میں ان کی اقامت صرف دو برس ہوئی۔ اس صورت میں صاحب سیرۃ العثمان کا یہ قول کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ زیادہ تر کوفہ میں رہے (اندازہ کیجیے) کس قدر ٹھیک اور ان کے طرز مورخانہ کی دلیل ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ حضرت علی کی فقہ و استنباط کا زمانہ زیادہ تر کوفہ میں گزرا تو یہ بالکل غلط ہے۔“<sup>(۱)</sup>

باقی رہا مولانا شبلی کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بھی زیادہ تر کوفہ میں رہے۔ اس کے متعلق مولانا رحیم آبادی رقم طراز ہیں۔

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ابتدا سے مدینہ منورہ ہی میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار کو کوفہ کا حاکم بنا کر اور عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کا معلم بنا کر بھیجا، پھر ان کو موقوف کر کے مدینہ طلب کر لیا۔“

اس کے ثبوت میں مولانا رحیم آبادی ”اصابہ فی تمییز الصحابہ“ کی یہ عبارت پیش فرماتے ہیں۔

سیرہ عمر الی الکوفۃ ليعلمهم امور دينهم و بعث عمارا اميرا قال انهما من النجاء من اصحاب محمد فاقتلوا بهما ثم امره عثمان على الکوفۃ ثم عزله فامرہ بالرجوع الی المدینۃ۔  
(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ میں بھیجا تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو احکام دین کی تعلیم دیں اور حضرت عمار کو وہاں کا حاکم بنا کر

بھیجا اور فرمایا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہ دونوں ممتاز درجے پر فائز ہیں ان کی اقتدا کرو۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کو کوفے کا حاکم مقرر فرمایا۔ پھر انھیں اس عہدے سے معزول کر کے واپس مدینہ شریف بلا لیا۔<sup>(۱)</sup>

مولانا رحیم آبادی، مولانا شبلی کے اس نقطہ نظر کو بھی صحیح نہیں قرار دیتے کہ ”حضرت عمر اور عبد اللہ بن عباس کے تعلق سے حریم کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا۔“ وہ فرماتے ہیں۔

”یہ بات سراسر غلط ہے کہ حریم کو صرف حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ بن عباس کے تعلق سے دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا۔ حریم تو اصحاب و اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مجمع رہا۔ کوفہ میں چند روز حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رہے اور حریم ان لوگوں کا اصل مرکز تھا۔ علاوہ ازیں خلفائے راشدین و ازواج مطہرات و اہل بیت اور ہزاروں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں رہے۔ ایسی حالت میں کوفہ اور حریم کا علم میں موازنہ کرنا کمال درجے کی خیرہ چشمی ہے۔“<sup>(۲)</sup>

اپنے اس فرمان کے اثبات میں مولانا رحیم آبادی، حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی مشہور تصنیف مصفی شرح موطا کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کے (صفحہ ۶) کی مندرجہ ذیل عبارت نقل فرماتے ہیں۔

”مدینہ شرفہ در زمان او پیشتر از زمان متاخر بے شبه مرجع فضلا و محط رجال علما بودہ است؛ وزمانے بعد مفتیان عظیم الشان کہ ہمہ عالم را قبلہ توجہ علم ایشان بود پیدا شدند۔“

یعنی مدینہ منورہ حضرت امام مالک کے زمانے سے پہلے سے مرجع فضلا اور مرکز علما تھا۔ ہر زمانے میں وہاں ایسے عظیم القدر مفتی پیدا ہوتے رہے ہیں جن کا علم پوری دنیا کے اصحاب علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

۲۔ حسن البیان ص ۱۳۲۔

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۱۔

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

فقیہ اور غیر فقیہ صحابہ

یہاں ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ مولانا شبلی نے صحابہ کرام کو جو فقیہ اور غیر فقیہ (دو حصوں) میں تقسیم کیا ہے، کیا یہ تقسیم قرین صحت ہے؟ یہ بات تو لائق التفات ہے کہ بعض صحابہ کثیر الفتویٰ تھے اور بعض قلیل الفتویٰ تھے، لیکن یہ کہنا کہ چند صحابہ تو فقیہ تھے اور دوسرے غیر فقیہ تھے قطعاً لائق اعتنا نہیں۔ کیا فقیہ وہی ہوتا ہے جس نے مدارس میں فقہ کی چند کتابیں پڑھی ہوں اور ان فرضی مسائل کا جو وقوع پذیر نہیں ہوئے رٹا لگایا ہو؟ اور صحابہ نے آج کل کے مدارس کی نصابی کتابیں نہیں پڑھی تھیں اور خفی مدرسین کی شاگردی میں وہ مسائل یاد نہیں کیے تھے جو ان کتابوں میں درج ہیں، لہذا وہ فقیہ نہیں تھے۔ اس پیانہ نقاہت میں صحابہ بلاشبہ پورے نہیں اترتے۔

صحابہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا، بعض کو فقیہ اور بعض کو غیر فقیہ کہنا یا بعض کو مجتہد اور بعض کو غیر مجتہد قرار دینا، صحابہ کے مرتبہ عالی کے منافی ہے۔



## تیرھواں باب

## اہل حدیث اور اہل راے

## شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نقطہ نظر سے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے صحابہ و تابعین کے بعد آنے والے گروہوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک گروہ اہل حدیث کا ہے اور دوسرا اہل راے کا۔

## اہل حدیث کی تنگ و تاز

اہل حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وكان اكبر همهم رواية حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم. <sup>(۱)</sup>

(ان کی بہت بڑی کوشش یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کی جائیں۔)

اس سے چند سطور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

فطاف من ادرك من عظمائهم ذلك الزمان بلاد الحجاز والشام والعراق و مصر واليمن وخراسان وجمعوا الكتب وتبعوا النسخ وامنوا في التفحص عن غريب الحديث و نواد والاثر فاجتمع باهتمام اولئك من الحديث والآثار ما لم يجتمع لاحد قبلهم. <sup>(۲)</sup>

(پھر اس گروہ کے تمام سربراہ و ردہ لوگوں نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے دور دراز بلاد و ممالک کے سفر کیے وہاں جا کر حدیث کی کتابیں

۱۔ جزء البائع ص ۱۳۸۔ ۲۔ ایضاً

لکھیں اور ان کے نسخے ترتیب دیے۔ بے حد تلاش و جستجو کر کے انھوں نے کم یا ب احادیث و آثار کا پتا لگایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت کی سعی سے احادیث و آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اب تک کسی جماعت کے پاس نہیں ہوا تھا اور نہ کسی کی رسائی ان احادیث و آثار تک اس سے قبل ہوئی تھی۔ اس سے تین سطور آگے شاہ صاحب رقم فرماتے ہیں۔

وظہر علیہم احادیث صحیحہ کثیرہ لم تظہر علی اہل الفتویٰ من قبل۔<sup>(۱)</sup>

(اور پھر اس جماعت اہل حدیث کو اس درجہ کثرت کے ساتھ احادیث میسر آئیں کہ اس سے پیشتر کسی مفتی اور مجتہد کو میسر نہیں آئی تھیں۔)

حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے صاف پتا چلتا ہے کہ اصحاب حدیث کے علاوہ جتنے بھی فقہا اور قائل احترام مجتہدین گزرے تھے ان کے پاس احادیث ان حضرات سے کم تھیں جنہیں اہل حدیث کے لقب سے پکارا جاتا تھا اس لیے کہ ان کا اصل مشغلہ ہی حدیث کی جمع و تدوین تھا چنانچہ شاہ صاحب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں۔

قال الشافعی لاحمد انتم اعلم بالاخبار الصحیحہ منا فاذا کان خبر صحیح فاعلمونی حتی اذهب الیہ۔<sup>(۲)</sup>

(امام شافعی نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ کو صحیح احادیث کا ہم سے زیادہ علم ہے اس لیے جو صحیح حدیث آپ کو ملے وہ ہمیں بتا دیا کریں تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذخیرہ لوگوں کے پاس مکمل نہیں تھا اسی لیے وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ صحیح حدیث سے انھیں مطلع فرما دیا کریں۔



ہو سکتا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ ازراہ انکسار فرمائے ہوں۔ امام احمد ربیع الاول ۱۶۲ھ میں پیدا اور ۱۲۰ھ ربیع الاول ۲۳۱ھ کو فوت ہوئے۔

ان سے پہلے کا زمانہ امام شافعی کا تھا۔ ان کا سن ولادت ۱۵۰ اور سن وفات ۲۰۳ ہجری ہے۔

امام شافعی سے قبل کا دور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جن کی ولادت ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا عہد مبارک اس سے بھی پیشتر کا ہے۔ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی اور ۱۵۰ھ میں وہ عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ احادیث کی جمع و تدوین کا سلسلہ اگرچہ صحابہ کرام کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا، لیکن یہ سلسلہ محدود تھا۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے زمانے میں بھی بہ کثرت احادیث نہیں ملتی ہوں گی۔ البتہ امام احمد بن حنبل کے عہد میں تلاش حدیث کا سلسلہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک تو کونے میں قیام فرماتے، دوسرے ان کے دور میں احادیث کی کثرت نہ تھی، لہذا انھیں جو ”قلیل الحدیث“ کہا جاتا ہے، اس کا مطلب ان کی ذات گرامی پر ”قلت حدیث“ کا الزام عائد کرنا ہرگز نہیں ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت امام کونے میں قیام فرماتے اور کونے میں امارت و حکومت کے معاملات کے متعلق تو بے شک صحابہ کرام کی آمد و رفت رہی تھی، لیکن مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ یا شام کی طرح وہ شہر صحابہ کا ایسا مرکز نہ تھا، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی تدریس و تعلیم کے حلقے قائم ہوں۔

شاہ صاحب اہل حدیث اور محدثین کی مقدس جماعت کے بہت سے ارکان کا ذکر کرتے ہیں۔ حدیث سے متعلق ان کی مساعی اور رنگ و تاز کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ رقم فرماتے ہیں۔

وكان اوسعهم علما عندی وانفعهم تصنيفا واشهرهم ذكرا

رجال اربعة متقاربون فی العصر. (۱)

(ان حضرات میں سے سب سے زیادہ وسیع علم والے سب سے زیادہ مفید ترین کتابوں کے مصنف سب سے زیادہ مشہور باہم قریب الہد میرے نزدیک چار شخص ہیں۔)

اس کے بعد شاہ فرماتے ہیں: یہ چار شخص ہیں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب صحیح بخاری کی عظمت کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ولعمری انه نال من الشهرة والقبول له درجة لا یرام فوقها. (۲)

(بخدا اس کتاب کو جس درجہ شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اس سے زیادہ کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔)

اہل حدیث کے بالمقابل اہل رائے

اہل حدیث کی مساعی جیلہ کی تفصیل بیان کرنے اور احادیث و آچان میں ان بکھے بے حد انہماک کا تذکرہ کرنے، صحابہ کرام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق اور ان کے طرز عمل کے مطابق ان کے سفر حیات کی نگ و تاز کو معرض تحریر میں لانے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس جماعت کے ارکان رائے و قیاس سے دامن کشاں رہتے تھے اور ان کے فکر و عمل کا انحصار حدیث و سنت پر تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ان کے بالمقابل ایک دوسری جماعت تھی۔

وكان بازاء هؤلاء فی عصر مالک و سفیان و بعدہم قوم لایکروہون المسائل ولا یہابون الفتیا ، ویقولون علی الفقه بناء الدین فلا بد من اشاعته ویہابون رواية حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والرفع الیہ. (۳)

(اور اس جماعت اہل حدیث کے بالمقابل امام مالک، امام سفیان ثوری اور

۱۔ حجۃ اللہ بالخرج ص ۱۵۱۔ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً

ان کے بعد کے زمانے میں ایک دوسری جماعت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نہ تو غیر ضروری مسائل دریافت کرنے سے باز آتے تھے اور نہ ان کے جواب دینے میں کوئی جھجک محسوس کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ دین کی اصل بنیاد فقہ ہے اس لیے اس کی اشاعت کرنا ضروری ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے سے گریز کرتے تھے۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں:

فوقع تدوین الحديث والفقه والمسائل من حاجتهم بموقع من وجه آخر، وذلك انه لم يكن عندهم من الاحاديث والآثار ما يقدرون به على استنباط الفقه على الاصول التي اختارها اهل الحديث ولم تنشر صدورهم للنظر في اقوال علماء البلدان وجمعها والبحث عنها واتهموا انفسهم في ذلك وكانوا اعتقدوا في ائمتهم انهم في الدرجة العليا من التحقيق و كان قلوبهم اميل شنى الى اصحابهم. (۱)

(اہل راے نے اپنی مصلحت کے مطابق دوسرے انداز سے حدیث و فقہ اور مسائل کو جمع کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر احادیث و آثار پر اس درجہ وسیع نہ تھی کہ اہل حدیث کی طرح ان کے پسندیدہ اصول کے مطابق مسائل کا استنباط کر سکیں، ان کے دلوں میں بھی اس قدر وسعت نہ تھی کہ اپنے خاص علاقوں اور شہروں کے علما کے اقوال اور ان کی تصانیف پر تنقیدی نگاہ ڈال سکیں اور اسے موضوع بحث بنا سکیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھا اور اپنے ائمہ کے بارے میں یہ بات ذہنوں میں بٹھالی کہ اب ان

سے زیادہ کوئی شخص تحقیق نہیں کر سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل تمام امور سے کٹ کر اپنے ائمہ ہی کی طرف مائل تھے۔)

شاہ صاحب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کو اہل راے اس لیے کہا گیا کہ ذخیرہ حدیث پر ان کی نظر کم تھی اور مسائل بتانے اور بیان کرنے میں زیادہ محتاط نہ تھے۔ راے اور قیاس سے کام لے کر بلا تاہل مسائل بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ نقد و جرح سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ اہل حدیث کا انداز ان سے مختلف تھا وہ حدیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین کی تلاش میں رہتے تھے اور اسی کی روشنی میں بات آگے بڑھاتے تھے۔



## چودھواں باب

www.kitabosunnat.com

## اہل رائے کی ترقی کا بنیادی سبب۔۔۔ حکومت

کسی مذہب یا مسلک کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ عام طور سے حکومت کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاص شان و شوکت کی مالک ہوتی ہے اور نشر و اشاعت کے ذرائع اس کے قبضے میں ہوتے ہیں وہ لوگوں میں عہدے اور منصب تقسیم کرتی ہے۔ یہ تقسیم بعض دفعہ صلاحیت کے مطابق ہوتی ہے اور بعض دفعہ عدم صلاحیت کو بھی صلاحیت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ دور گزشتہ کی اسلامی حکومتوں میں علمائے دین کو قضاء و افتا کے مناصب عطا کیے جاتے تھے اور عوام ان منصب داروں کے محتاج ہوتے تھے اور یہ محتاجی مذہب و مسلک کی ترقی کا باعث بنتی تھی۔ خفی مسلک کے زیادہ پھیلاؤ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کان اشہر اصحابہ ذکرا ابو یوسف رحمہ اللہ فلولی قضاء القضاء  
ایام ہارون الرشید فکان سببا لظہور مذہبہ والقضاء بہ فی اقطار  
العراق و خراسان وما وراء النہر۔<sup>(۱)</sup>

(امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی وجہ سے یہ مذہب خوب پھیلا اور عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں اس کی بے حد اشاعت ہوئی۔) ہندوستان میں بھی خفی مذہب کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس خطہ ارض میں یہ مذہب

عراق، خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں سے پہنچا۔  
اس کے بعض فقہاء و مجتہدین کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ  
صاحب نہایت دلچسپ انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

من حفظ المبسوط كان مجتهداً وان لم يكن له علم برواية  
اصلاً۔<sup>(۱)</sup>

(جس نے فقہ کی کتاب مبسوط یاد کر لی، بس مجتہد ہو گیا، اگرچہ اسے ایک بھی  
روایت اور حدیث کا علم نہ ہو۔)

شاہ صاحب کا یہ تجزیہ بالکل مبنی برصحت اور واقعات کے عین مطابق ہے۔ ہم دیکھتے  
ہیں کہ حضرات احناف کے بڑے بڑے مدارس میں جس اہتمام و التزام سے فقہ حنفی کی  
کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس اہتمام و التزام سے حدیث کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں۔  
کتب فقہ کی تدریس برسوں جاری رہتی ہے اور اس کی ایک ایک جزئی طالب علم کے حلق  
میں اتاری جاتی اور راسخ کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس حدیث کی کتابوں کا چند مہینوں میں  
دورہ کرایا اور بات ختم ہوگئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسے موسوم ہی ”دورہ حدیث“ سے  
کیا جاتا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا بھی یہی فرمان ہے کہ فقہ حنفی کی اشاعت حکومتوں کی  
سرپرستی کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اس کا خاصی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔  
”ایک خاص بات یہ ہے کہ عثمان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی، وہ  
اکثر حنفی فقہ کے پابند تھے۔“<sup>(۲)</sup>

کیا سلطان محمود غزنوی حنفی تھا؟

یہاں مولانا شبلی نے مختلف ادوار اور ممالک کے بعض بادشاہوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ  
حنفی مسلک کے پابند تھے اور ان کی وجہ سے فقہ حنفی کو ترقی کے مواقع میسر آئے۔ ان  
بادشاہوں میں انھوں نے سلطان محمود غزنوی کا ذکر بھی کیا ہے۔

بلاشبہ مولانا شبلی بہت بڑے عالم تھے اور اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ لیکن محمود غزنوی کی حنفیت کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اصل واقعات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔۔۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وسعت مطالعہ کے باوجود اس موضوع کے حقائق مولانا کی نظر سے اوجھل رہے ہیں یا ان حقائق کو انھوں نے کسی خاص وجہ سے جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اگر دوسری صورت ہے تو اسے تاریخ نویسی کے دیانت دارانہ اصول کے مطابق نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی واقعہ کی تعبیر اپنے بنیادی فکر کی روشنی میں کی جائے، لیکن اصل واقعہ کی بالکل نفی کر کے اسے یکسر دوسرے انداز میں بیان کیا جائے یہ مورخ کی شان کے شایاں نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی ابتدا میں حنفی مسلک کا حامل تھا۔ لیکن بعد میں اس نے حنفیت ترک کر دی تھی۔ اس کی تفصیل تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں، امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی نے مغیث المخلوق فی ترجیح القول الحق میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے مسلک حنفی کیوں ترک کیا۔

ان حضرات نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں علمائے حنفیہ اور علمائے شافعیہ کثیر تعداد میں جمع تھے۔ ایک مرتبہ قتال مروزی نے ان علماء کی موجودگی میں سلطان کے سامنے پہلے شافعی مسلک اور پھر حنفی مسلک کے مطابق نماز پڑھی۔ امام شافعی کا مذہب چوں کہ ظواہر حدیث سے مطابقت رکھتا ہے اس لیے سلطان اس سے نہایت متاثر ہوا اور اس نے حنفیت ترک کر کے شافعییت قبول کر لی۔<sup>(۱)</sup>

سلطان محمود غزنوی کا ذکر حاجی خلیفہ نے بھی اپنی کتاب کشف الظنون میں کیا ہے۔ اس کی ایک تصنیف کا ذکر بھی کیا ہے جس کا نام ”التفرید“ تھا اور وہ حنفی فقہ کے مسائل پر

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مغیث المخلوق فی ترجیح القول الحق صفحہ ۵۹۲۵۔۔۔ وفیات الاعیان جلد ۴ صفحہ

مشتعل تھی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان پہلے حنفی تھا، پھر شافعی ہو گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے مطالعہ کے لیے یہاں حاجی خلیفہ کی پوری عبارت درج کر دی جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

التفريد في الفروع. للسلطان محمود بن سبكتگين الغزنوي الحنفى ثم الشافعى. المتوفى سنة اثنين وعشرين واربع مائة. قال الامام مسعود بن شيبه كان السلطان المذكور من اعيان الفقهاء وكتابه هذا مشهور في بلاد غزنة وهو في غاية الجودة وكثرة المسائل ولعله نحو ستين الف مسئلة وفي التاتارخانية نقول منه. ولما رائي ان المذهب الشافعى وافق لظوا هر الحديث تشفع بعد ان جمع علماء المذهبين كما ذكره ابن خلكان. (۱)

(الترید فی الفروع۔ سلطان محمود بن سبکتگین غزنوی حنفی ثم شافعی کی تصنیف ہے جو ۴۲۲ھ (۱۰۳۱) کو فوت ہوا۔ امام مسعود بن شیبہ کا کہنا ہے کہ سلطان کا شمار مشاہیر و اکابر فقہاء میں ہوتا تھا۔ اس کی یہ کتاب غزنہ کے علاقے میں بہت مشہور ہے۔ عمدگی اور کثرت مسائل میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کتاب تقریباً ساٹھ ہزار مسائل پر مشتمل ہے۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں اس سے مسائل درج کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ ابن خلکان نے (وفیات الاعیان میں) ذکر کیا ہے، سلطان محمود غزنوی نے 'شافعی اور حنفی دونوں مکاتب فقہ کے مجمع علماء میں جب یہ سمجھا کہ شافعی مذہب، ظواہر حدیث سے زیادہ موافق ہے تو اس نے شافعی مذہب اختیار کر لیا۔)

اس عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی پہلے حنفی مسلک کا حامل تھا، بعد میں اس سے الگ ہو گیا تھا۔ ”طبقات الشافعیہ“ میں اس کا تذکرہ اکابر شوافع



کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

حاجی خلیفہ نے سلطان کی کتاب ”التفرید“ کو ساٹھ ہزار مسائل پر مشتمل قرار دیا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے یہ کہاں تک صحیح ہے، یہ ظاہر یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے مسائل کے شمار میں کوئی صاحب غلطی کا شکار ہو گئے ہوں۔

کیا محمود غزنوی اہل حدیث تھا؟

سلطان محمود غزنوی کے مسلک کے بارے میں افغانستان اور سرحد کے علمائے کرام اور اصحاب تاریخ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ وہ مسلک اہل حدیث کا حامل تھا۔ بعض مواقع پر اس نے مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے حضرات کو سفارتی ذمے داریاں بھی تفویض کیں۔ چنانچہ جب لیلک خاں نے ماوراء النہر کا علاقہ آل سامان کی گرفت سے آزاد کرایا اور وہ مملکت خراسان پر قابض ہوا تو اس کی اطلاع اس نے محمود غزنوی کو دی۔ محمود غزنوی نے اس پر بے حد مسرت کا اظہار کیا اور اپنے دربار کے ایک نہایت معزز اور اہل علم رکن شیخ ابوالطیب سہل بن سلیمان معلو کی کو جو اہل حدیث مسلک کے حامل تھے، لیلک خاں کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا اور ان کے ہاتھ مختلف قسم کے قیمتی تحائف ارسال کیے۔ اس سلسلے میں فرشتہ کے الفاظ لائق ملاحظہ ہیں۔

لیلک خاں ماوراء النہر ایک بار از آل سامان متخلص گردانیدہ، دفع نامہ بہ سلطان محمود فرستادہ۔ اور ابہ استیلائے مملکت خراسان تہنیت گفت، بنا براین میان ہر دو بادشاہ بناے دوستی و یگانگی استحکام پذیرفت، و سلطان محمود نیز ابوالطیب سہل بن سلیمان معلو کی را کہ از ائمہ اہل حدیث بود بدرسم رسالت پیش لیلک خاں فرستادہ۔<sup>(۱)</sup>

(لیلک خاں نے جب خاندان سامان کے قبضے سے ماوراء النہر کا علاقہ آزاد کرایا اور خراسان پر فتح حاصل کی تو فتح نامہ تہنیت سلطان محمود کی خدمت میں ارسال کیا، جس کے نتیجے میں دونوں بادشاہوں کے درمیان اتحاد و دوستی کی

بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ اس کے جواب میں سلطان محمود نے ابو الطیب سہل بن سلیمان صعلوکی کو جو کہ اہل حدیث کے جلیل القدر علما میں سے تھے، اپنا سفیر اور پیغام رساں مقرر کر کے ایلک خاں کے پاس بھیجا۔

### مولانا شبلی کی لغزش

مولانا شبلی نعمانی کا شمار عربی اور فارسی کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم اور مصنف ہیں، مشہور مورخ اور سیرت نگار۔۔۔! لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ تاریخ اور رجال کی بعض ایسی کتابیں ان کے پیش نگاہ نہیں ہیں، جن کے بغیر اس راہ میں چند قدم چلنا بھی مشکل ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی کو حنفی قرار دیتے ہیں، لیکن تاریخ فرشتہ کے اس مقام کا مطالعہ نہیں فرماتے، جس میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ عبارت ان کی نظر سے اوجھل رہی جو ابھی قارئین کے مطالعہ میں آئی ہے۔ عربی رجال کی مشہور کتاب وفیات الاعیان بھی ان کے سامنے نہیں ہے۔ طبقات الشافعیہ کا، جس میں ممتاز شوافع کا ذکر کیا گیا ہے، وہ کہیں حوالہ نہیں دیتے۔ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون بھی جس میں ہر موضوع کی کتابوں اور ان کے مصنفوں کا ذکر مناسب تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، غالباً مولانا کی نظر سے نہیں گزری۔ پھر مغیث المثلث فی ترجیح القول الحق پڑھنے کا بھی شاید انھیں موقع نہیں ملا، جس میں سلطان محمود غزنوی کے دربار میں اس کے سامنے شافعی اور حنفی علما کی موجودگی میں قتال مروزی کے نماز پڑھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر سلطان نے شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا۔

یہ سب قدیم کتابیں ہیں اور کئی سو سال پہلے کی تصنیف شدہ ہیں۔ تاریخ و رجال کے موضوع پر کام کرنے والے وہ اہل علم جو عربی اور فارسی سے آشنا ہیں، ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا شبلی نے صرف اسی مقام پر ٹھوکر نہیں کھائی، بہت سے مقامات پر ان سے لغزش علمی ہوئی ہے۔ سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری (دو) جلدیں ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جو ان کی وفات کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے نظر ثانی کر کے شائع کیں۔ ان میں

بھی متعدد مقامات پر مولانا سے چوک ہوئی ہے۔ سید صاحب نے ان میں سے بعض مقامات کی نشان دہی کی اور بعض کی طرف عنان توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ اسی طرح ”الفاروق“ میں بھی بعض مقامات پر ان سے تسامح ہوا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ سلطان محمود غزنوی نے یکے بعد دیگرے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور اس کے حکمرانوں کا نہایت جرأت مندی سے مقابلہ کیا۔ اسی کے زمانے میں لاہور فتح ہوا۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے لاہور پر حملہ کیا اور اس شہر پر اسلامی پرچم لہرایا۔

### اور اب غیاث الدین غوری

سلاطین غزنویہ کی یمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد غوری برسرِ اقتدار آئے، جنہوں نے ہندوستان پر باقاعدہ حکومت کی۔ غوری خاندان میں سلطان غیاث الدین غوری اور شہاب الدین غوری بڑے بہادر اور مدبر حکمران گزرے ہیں اور انھیں ہندوستان کے عظیم مسلمان فاتحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ غیاث الدین غوری بڑا تھا اور شہاب الدین چھوٹا۔۔۔! اس زمانے میں غور کے زیادہ تر مسلمان فرقہ کرامیہ<sup>(۱)</sup> سے تعلق رکھتے تھے، یہ دونوں بھائی بھی اسی فرقے سے منسلک تھے۔ لیکن سلطان شہاب الدین غوری تخت غزنی پر متمکن ہوا تو اس نے حنفی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

رہا غیاث الدین غوری کا معاملہ، تو اس کے متعلق قاضی منہاج سراج رقم طراز ہیں کہ وہ شافعی مذہب سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک شافعی مذہب قرآن و حدیث سے ہم آہنگ تھا اور اس کے ماننے والوں کو اہل حدیث یا اصحاب حدیث بھی کہا جاتا تھا۔

۱۔ فرقہ کرامیہ کے بانی کا نام ابو عبد اللہ محمد بن کرام تھا۔ یہ فحش ۲۵۵ھ میں فوت ہوا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان صرف اقرار باللسان کا نام ہے اس کے لیے عمل بالجوارح اور یقین بالقلب کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اللہ انسانوں کی طرح جسم رکھتا ہے اور عرش کے اوپر اس کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فرقہ کرامیہ قول و عمل میں بدھ مت اور اسلام کی ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ منقول ہے کہ ہزاروں غیر مسلم محمد بن کرام کے اس فرقے میں شامل تھے۔ (طبقات ناصری جلد اہل اقصیٰ ص ۳۶۲)

قاضی منہاج سراج نے اس کے شافعی مسلک قبول کرنے کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ ”وہ اور قاضی وحید الدین محمد مروزی امام شافعی کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔“

یہ نہایت مختصر خواب ہے۔ اس سے دوسرے دن سلطان غیاث الدین غوری نے قاضی موصوف کو وعظ و تذکیر کے لیے دربار میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ وہ تشریف لائے اور وعظ شروع کیا تو وہی خواب بیان کیا جو گزشتہ رات سلطان نے دیکھا تھا۔ سلطان اس سے بہت متاثر اور متعجب ہوا کہ دونوں نے اتفاق سے ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا خواب دیکھا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے شافعی مذہب اختیار کر لیا۔

اس باب میں قاضی منہاج سراج کے اصل الفاظ کا مطالعہ کیجیے۔

اما سلطان غیاث الدین طاب ثراہ شبے در خواب دید کہ او با قاضی وحید الدین مروزی رحمۃ اللہ علیہ کہ بر مذہب اصحاب حدیث بود و مقتداے شفعیان در یک مسجد بودند ناگاہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ درآمدے در محراب رفتے و تحریر نماز پیوستے۔ و سلطان غیاث الدین و قاضی وحید الدین ہر دو بہ امام شافعی اقتدا کردندے۔ چوں از خواب درآمد سلطان فرمان داد تا بامداد قاضی وحید الدین در بارگاہ تذکیر فرمودند۔ چوں بر بالائے کرسی رفت در اثناے سخن گفت کہ اے بادشاہ اسلام! ایں داعی دوش خواہے دیدہ است و عین خوابیکہ سلطان دیدہ بود باز گفت۔ او ہم بہ مثل آں دیدہ بود کہ سلطان چند آنچہ از کرسی فرو درآمد بر بالارفت و بخدمت سلطان در حال سلطان دست مبارک قاضی وحید الدین بہ گرفت و مذہب امام شافعی رضی اللہ عنہ قبول کرو۔ چوں نقل سلطان بہ مذہب اصحاب حدیث شافعی شد بر دل علماے مذہب محمد بن

کرام حمل آمد۔<sup>(۱)</sup>

(یعنی سلطان غیاث الدین غوری نے) اللہ اس کا بہتر ٹھکانا کرے) ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ قاضی وحید الدین مروزی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کہ اہل حدیث میں سے تھے اور شافعیوں کے مقتدی تھے ایک مسجد میں بیٹھے ہیں۔ اچانک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے، محراب میں گئے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلطان غیاث الدین اور قاضی وحید الدین دونوں نے امام شافعی کی اقتدا میں نماز پڑھی۔۔۔ جب سلطان نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دربار میں وعظ و نصیحت کے لیے قاضی وحید الدین کو طلب کیا۔ وہ وعظ کے لیے اپنی نشست پر بیٹھے تو اٹھائے گفتگو میں فرمایا اے بادشاہ اسلام! میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ (وہ خواب انھوں نے بیان کیا تو) بالکل وہی خواب تھا جو سلطان نے دیکھا تھا۔ چنانچہ سلطان نے ان سے کہا کہ اس نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا ہے۔ بعد ازاں سلطان نے قاضی وحید الدین رحمۃ اللہ علیہ کا دست مبارک پکڑا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک قبول کر لیا۔ جب سلطان مذہب اہل حدیث اختیار کر کے مسلک امام شافعی سے وابستہ ہو گیا تو ان علما کو یہ بات سخت ناگوار گزری جو محمد بن کرام کے مذہب کے حامل تھے۔)

یہ واقعہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں ۵۹۵ھ کے حوادث کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ ابن اثیر کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

”اسی سال (یعنی ۵۹۵ھ) میں حاکم غزنہ غیاث الدین غوری اور بعض باشندگان خراسان نے مذہب کرامیہ ترک کر کے شافعی مذہب اختیار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطان غیاث الدین غوری کے مصاحبوں میں ایک شخص

مبارک شاہ تھا۔ وہ شخص شیخ وحید الدین ابوالفتح محمد بن محمود مروزی کو جو ایک شافعی فقیہ تھے سلطان کے پاس لے گیا۔ انھوں نے سلطان کے سامنے مذہب شافعیہ کی خوبیاں بیان کیں اور کرامیہ مذہب کے نقائص کی نشان دہی کی۔ اس سے متاثر ہو کر سلطان نے شافعی مذہب قبول کیا اور پھر شوافع کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے لیے کئی مدرسے قائم کیے۔“

۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں غوری سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ تاریخ میں ان سلاطین کو معزری سلاطین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، سلاطین شہنشاہیہ بھی کہا جاتا ہے، لوگ غور سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ سلطان غیاث الدین تغلق بھی مسلک اصحاب حدیث یا اہل حدیث کا حامل تھا جو ایک صاحب علم حکمران تھا۔ یہ سلطان ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں تخت ہند پر متمکن ہوا اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ربیع الاول ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو وفات پا گیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے محمد خاں تغلق نے ملک کی زمام اقتدار ہاتھ میں لی۔ وہ بھی عالم و فاضل اور متدین و متواضع بادشاہ تھا۔<sup>(۱)</sup>

محمد خاں تغلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا مرکز عقیدت قرار دیتا تھا چنانچہ حضرت امام کے ایک مشہور شاگرد شیخ عبدالعزیز اردبیلی اس کے زمانے میں ہندوستان آئے جو حدیث و فقہ کے جلیل القدر عالم تھے اور بادشاہ ان سے بے حد متاثر تھا۔ ان کے مشورے اور تبلیغ و تجویز سے بادشاہ نے ملک میں بہت سی دینی اصلاحات جاری کیں اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا خاتمہ کیا۔<sup>(۲)</sup>

محمد خاں تغلق نے چھبیس سال ہندوستان پر حکومت کی اور ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو اس کا انتقال ہوا۔

۱۔ ملاحظہ ہو قاضی محمد بن علی شوکانی کی تصنیف البدراہن جلد ۲، صفحہ ۱۸۰۔

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۲، صفحہ ۶۷۔

اس کے بعد اس ملک کا حکمران فیروز شاہ تغلق ہوا، جس نے صالحیت و تقویٰ شعاری میں بڑی شہرت پائی اور بدعات و محدثات کو ختم کرنے کی مہم چلائی، جس میں وہ کامیاب رہا۔ اس نے سترالیس سال حکومت کی اور ۱۳- رمضان المبارک ۷۹۹ھ (۱۰ جون ۱۳۹۷ء) کو وفات پائی۔

سلطان محمود غزنوی، غیاث الدین غوری، غیاث الدین تغلق، محمد خاں تغلق اور فیروز شاہ تغلق کی مثالیں مولانا شبلی نعمانی کے جواب میں دی گئی ہیں، جن کا فرمان ہے کہ ہندوستان کے تمام بادشاہ خفی تھے اور خفی مسلک کو بادشاہوں کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔ ان مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کئی مشہور اور بڑے بادشاہ خفی نہیں تھے۔ مولانا نے جن کو خفی قرار دیا ہے، انھوں نے حنفیت ترک کر دی تھی اور شافعی یا اہل حدیث ہو گئے تھے۔ کتب تاریخ میں ان کی تبدیلی مسلک کی وضاحت وہیں کی گئی ہے، جہاں ان کی حنفیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا نے ”سیرۃ النعمان“ میں یا کسی اور کتاب میں ان کی شافیت کا ذکر نہیں کیا، صرف حنفیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

کیا حکومت سے وابستگی عالی مرتبے کی دلیل ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت کے ایوانوں سے وابستگی اور ارباب اقتدار سے تعلق کو اوجہ فضیلت یا عالی مرتبے کی دلیل قرار دیا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔۔۔! حکومت کے معاملات اور ہیں، اہل علم کے اور ہیں۔ اہل علم اور اصحاب حدیث نے کبھی ارباب اقتدار کے دروازوں پر دستک نہیں دی، وہ ہمیشہ اس سے دور رہے ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ ہارون الرشید سے قرب پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں اس نے حضرت امام سے ”فقہی نوعیت“ کے جو کام لیے، وہ فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہیں اور اس کی تفصیل متعدد کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔ ہارون الرشید بڑے کھلے دل کا اہل علم حکمران تھا۔ وہ حضرت امام ابو یوسف کے ارشاد فرمودہ ”مسائل فہمیہ“ پر نہایت مسرت کا اظہار کرتا اور اپنے ہر من پسند مسئلے پر انھیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔

اس کی بارگاہ خلافت میں قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہوتا تو کہتا۔

هذا لا يعزل ابدا.

(انھیں اس منصب سے کبھی معزول نہیں کیا جائے گا۔)

اب بھی حکومتوں کا یہی طرز عمل ہے۔ ان کے ارکان اعلیٰ عدالتوں کے بعض ججوں سے بہت خوش رہتے ہیں اور بعض سے انتہائی ناراض۔۔۔!

اسی طرح علمائے کرام کے بارے میں بھی ان کا یہی اسلوب فکر ہے۔ بعض آمرتم کے حکمران ان علمائے کو بے حد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے اور انھیں کئی قسم کی منفعت سے نوازتے ہیں جو ان کی تائید کرتے اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ وہ صحیفہ نگار اور اخبار نویس بھی ان کے درباروں میں قدر و منزلت کے مستحق قرار پاتے ہیں جن کے قلم ان کی مدد سرائی میں متحرک رہتے ہیں۔ اور جو ان پر صحت مندانہ تنقید کرتے اور واقعات کی اصل تصویر ان کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک معتبوب گردانے جاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے انھیں پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔





## پندرھواں باب

### مسئلہ تقلید

اب ہم مسئلہ تقلید کے متعلق چند ارشادات پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تقلید کیا ہے اور اس پر عمل کا سلسلہ کب شروع ہوا؟

تقلید کی تعریف اور اس کے معنی

اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تقلید کا لفظ کس چیز پر بولا جاتا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں یہاں چند جلیل القدر اصحاب علم کی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱. التقلید، العمل بقول الغير من غير حجة. <sup>(۱)</sup>

(تقلید اس عمل کا نام ہے جو کسی غیر کے کہنے پر بلا دلیل کیا جائے۔)

۲. التقلید، العمل بقول غيرك من غير حجة. <sup>(۲)</sup>

(تقلید وہ عمل ہے جو تم کسی غیر کے کہنے پر کسی دلیل کے بغیر انجام دو۔)

۳. التقلید، هو قبول قول بلا حجة وليس من طريق العلم لافى

الاصول ولا فى الفروع. (اصول فقہ حنفی ص ۲۵۷)

(تقلید یہ ہے کہ کسی کا قول بلا دلیل قبول کر لیا جائے، وہ قول اصول و فروع

میں طریق علم سے نہ ہو۔)

۴. التقلید، اعتقاد الشیخی لان فلانا قاله مما لم یقم علی صحه

قوله برهان. (احکام۔ ابن حزم ص ۴۰)

(تقلید یہ ہے کہ کسی بات کو محض اس لیے مرکز عقیدت قرار دے لیا جائے کہ

۱۔ مسلم الثبوت ج ۲ ص ۳۵۰۔ ۲۔ مختصر ابن حجب ص ۲۳۱۔

یہ فلاں شخص کا فرمان ہے جب کہ اس کی صحت کی بنیاد کوئی دلیل نہ ہو۔

ان تمام اقوال سے یہ بات مترشح ہوئی کہ تقلید اس اطاعت و اقتدا کو کہا جاتا ہے جو بلا دلیل و برہان کسی بزرگ یا امام کی کی جائے۔ انسانوں میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اقتدا ہی کسی دلیل اور حجت کے بغیر کی جاسکتی ہے۔ یہ کہنا قطعاً قرین صواب نہیں کہ چون کہ فلاں امام اور عالم عظیم شخصیت کے مالک ہیں، بہت پڑھے لکھے ہیں اور کوئی مسئلہ ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہے اس لیے وہ جو کچھ فرمائیں اسے بلا کسی دلیل کے تسلیم کر لینا چاہیے۔

کوئی شخص ایسا نہیں جو تمام علوم پر حاوی ہو اور شرعی اعتبار سے پیش آنے والے ہر مسئلے پر اس کی نگاہ ہو۔ مسائل شرعی میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو حجت مانا جائے گا اور آپ کے ارشادات ہی کو لائق اطاعت گردانا جائے گا۔ آپ کے اقوال و ارشادات کے مقابلے میں کسی امام اور بزرگ کی بات کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ یہ محض خوش فہمی اور حسن ظن ہے کہ فلاں شخص تمام مسائل پر عبور رکھتا ہے۔ یہ بات ہرگز لائق تسلیم نہیں۔ عین ممکن ہے بعض مسائل اس کے ذہن کی گرفت اور علم کی حدود میں نہ ہوں اس لیے مسائل کا خود بھی کھوج لگانا چاہیے۔ تحقیق و تفحص انسان کی فطرت میں داخل ہے کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس سے بہر صورت کام لینا ضروری ہے۔ اپنے آپ کو جمود و تعطل کے سپرد کر دینا علم کی غربت اور تحقیق کے افلاس کی علامت ہے۔ کسی ایک ہی دائرے میں محدود ہو جانا اور سمٹ جانا حق کی فطرت کے خلاف ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ حق فلاں نقطہ فکر کی چار دیواری کے اندر بند ہے اس سے باہر کی دنیا حق سے محروم ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے اور حق کا مذاق اڑاتا ہے۔

یہاں ہم استاد محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے چند سطور مستعار لیتے ہیں۔ وہ ”تقلید کا لفظ کب استعمال ہوا؟“ کے عنوان کے تحت رقم فرماتے ہیں۔

”سنن دارمی، عقد الجید، حجة اللہ البالغہ، دراسات الملیب، میزان شرعی، بیان العلم و فضلہ ابن عبد البر وغیرہ کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کا یہ استعمال جو

اب کیا جا رہا ہے صحابہ کرام اور ائمہ اربعہ کے زمانے میں نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

لا یقلدن رجل رجلا فی دینہ ان امن وامن وان کفر کفر۔  
یعنی کوئی شخص اپنے دین کے معاملے میں کسی شخص کی اس طرح تقلید نہ کرے کہ وہ ایمان لایا تو یہ بھی ایمان لائے گا، اگر اس نے انکار کیا تو یہ بھی انکار کرے گا۔

امام احمد کا بھی یہی فرمان ہے۔ وہ فرماتے ہیں ۱۔  
لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا ولا الاوزاعی وخذا الاحکام من حیث اخلووا۔<sup>(۱)</sup>

یعنی نہ میری تقلید کرو اور نہ امام مالک اور اوزاعی کی تقلید کرو، وہیں سے احکام لو، جہاں سے انھوں نے لیے۔  
”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقلید کا لفظ اس وقت کسی خوش گوار انداز میں استعمال نہیں ہوا۔“<sup>(۲)</sup>

مولانا کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور امام احمد نے تقلید سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ یعنی اس زمانے میں یہ لفظ مستعمل تو تھا لیکن دینی معاملات میں اس پر عمل کرنے سے روکا جاتا تھا۔

### تقلید نہیں، تحقیق

فکر و فقہ کی تاریخ کے دروازے پر دستک دی جائے تو ہم بہت سے ان عالی مرتبت اصحاب فضل سے متعارف ہوں گے جو اپنے آپ کو بعض ائمہ فقہ کی طرف منسوب تو بے شک کرتے ہیں، لیکن متعدد مسائل میں اپنے امام فقہ سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے ہیں اور بر بنائے تحقیق کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ائمہ کی طرف انتساب کے باوصف ہم ان کے لیے ان معنوں میں ”تقلید“ کا لفظ استعمال نہیں کریں گے، جن معنوں میں بالعموم یہ لفظ

۱۔ عقد الجید، ص ۵۳۔ ۲۔ تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۱۳۳۔

استعمال کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا فرمان ہے:  
 ”تقلید کی مصطلح تعریف کے مطابق ایسے بزرگوں کو مقلد کہنا صحیح نہیں معلوم  
 ہوتا، بلکہ یہ رجحان تقلید سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔“  
 ”مختصر الطحاوی میں ایسے بہت سے مسائل ملتے ہیں جن میں طحاوی نے  
 حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف فرمایا ہے، معانی الاثار میں بھی  
 اس کے کافی نظائر موجود ہیں۔“<sup>(۱)</sup>

اس سے آگے بہ صورت مثال حضرت مولانا چند اور معروف اصحاب فضل کے  
 اسمائے گرامی تحریر فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ علامہ کاشانی مولف البدائع والصنائع، علامہ  
 سرخسی، قاضی خان، نسفی، ابن قدامہ، ابن تیمیہ، علامہ ابواسحاق، ابراہیم بن علی  
 بن یوسف صاحب مہذب، اسی طرح زر قانی اور باجی، ابن رشد اور شاطبی  
 وغیرہم سب اپنے ائمہ کے مذاہب کے بارے میں روایت اور درایت کو پیش  
 نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے طریق استدلال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان  
 کے محقق ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس روش کے بعد انھیں اصطلاحاً  
 کیوں کر مقلد کہا جاسکتا ہے؟ اور مقلد کی تعریف ان پر کیسے صادق آئے  
 گی۔؟“<sup>(۲)</sup>

غیر مقلد، بہ صورت طنز

بہت سے مقلد حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اہل حدیث کو ”اہل حدیث“ کہنے کے  
 بجائے ”غیر مقلد“ کہہ کر یاد فرماتے ہیں۔ ”اہل حدیث“ کا لفظ تحریر کرتے وقت ان کے  
 قلم میں لکنت آ جاتی ہے اور بولتے وقت زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ اپنی دانست میں یہ  
 حضرات طنز یہ صورت میں ان کے لیے یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اہل حدیث

کو ان کا غیر مقلد کہنا واقعہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ غیر مقلد ہیں۔ تقلید میں آخر کون سی ایسی خوبی ہے جسے اپنایا جائے۔ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہو بلکہ جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا صحابہ کرام اور ائمہ عظام نے اس سے روکا ہے اس لیے کہ اس کا علم و فکر سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ سوچ بچار کی صلاحیتوں سے دست برداری کا اعلان اور فہم مسائل میں دلیل و ثبوت کو نظر انداز کر دینے کی علامت ہے۔ چنانچہ امام ابن قیم فرماتے ہیں۔

قال ابو عمرو وغيره من العلماء اجمع الناس على ان المقلد ليس معبودا من اهل العلم وان العلم معرفة الحق بدليله، وهكذا كما قال ابو عمرو ورحمة الله عليه فان الناس لا يختلفون ان العلم المعرفة الحاصلة عن الدليل اما بدون الدليل فانما هو التقليد. (۱)

(ابو عمرو (ابن عبد البر) وغیرہ اہل علم کا کہنا ہے کہ علم اس امر پر متفق ہیں کہ مقلد کا شمار اہل علم کے گروہ میں نہیں ہوتا۔ علم کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے کہ انسان کو دلیل کے ساتھ معرفت حق حاصل ہو۔۔۔ اس ضمن میں ابو عمرو (ابن عبد البر) رحمۃ اللہ علیہ کی بات عین حقیقت پر مبنی ہے۔ اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علم اس معرفت حق ہی کو کہا جاتا ہے جو دلیل کی بنیاد پر قائم ہو، اگر دلیل کے بغیر ہو تو اسے تقلید کہا جائے گا۔)

امام ابن قیم کا اس سلسلے میں ایک اور اندراج ملاحظہ ہو۔

لا يجوز الفتوى بالتقليد لانه ليس بعلم والفتوى بغير علم حرام. ولا خلاف بين الناس ان التقليد ليس بعلم وان المقلد لا يطلق عليه لفظ العالم، وهو قول اكثر الاصحاب و قول جمهور الشافعي. (۲)

(اکثر اہل علم اور جمہور شافعی علما کا قول ہے کہ تقلید سے فتویٰ جاری کرنا جائز

نہیں اس لیے کہ مقلد عالم نہیں ہوتا اور فتویٰ بغیر علم کے نہیں دیا جاسکتا۔  
حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے امام غزالی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

انما شان المقلد ان يسكت او يسكت عنه. (۱)  
(مقلد کا معاملہ یہ ہے کہ علمی معاملات میں یا تو وہ خود خاموش رہے یا اس کی بات پر خاموشی اختیار کی جائے۔)

### گستاخ کون؟

بعض مقلد حضرات علما کو تقلید سے اس درجہ محبت اور تعلق خاطر ہے کہ وہ مقلد کہلانے کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک دین کی بنیاد شاید اسی پر قائم ہے۔ وہ بڑی تحدی اور قطعیت کے ساتھ غیر مقلدوں کو گستاخ قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا کردار اور اپنا عمل ہے اس کے متعلق انھیں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جن لوگوں کو اس قسم کے الفاظ کہنے اور دوسروں کو مطعون ٹھہرانے کی عادت پڑ گئی ہے وہ ہرگز اس سے باز نہیں آئیں گے۔ لیکن اگر فہم و فراست کا کوئی شہ ان میں موجود ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ درحقیقت گستاخ کون لوگ ہیں، وہ جو اخذ مسائل کے لیے براہ راست کتاب و سنت سے تمسک کرتے، آیات قرآن اور حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حجت مانتے اور اسی کو حرف آخر قرار دیتے ہیں یا وہ حضرات جو قرآن و سنت کے بجائے برہنہ تقلید کسی امام فقہ کا تتبع کرنے پر مصر ہیں؟ اگر ایک طرف احکام الہی اور ارشادات پیغمبر ہیں اور دوسری طرف قول امام ہے تو وہ قول امام کو ترجیح دیتے ہیں، حالاں کہ امام واضح الفاظ میں اعلان فرماتے ہیں کہ حدیث صحیح کے مقابلے میں ان کے قول کو نہ مانا جائے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

انه روى عن ابى حنيفة رضى الله عنه انه كان يقول: لا ينبغي لمن

۱۔ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی ساعی ص ۱۲۵۔

لم يعرف دليلي ان يفتي بكلامي، وكان رضى الله عنه اذا افتى يقول هذا رأى النعمان بن ثابت. يعنى نفسه وهوا حسن ماقدرونا عليه فمن جاء باحسن منها فهو اولي بالصواب. <sup>(۱)</sup>

(حضرت امام ابوحنيفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی مسئلے میں میری پیش کردہ دلیل کا علم نہیں رکھتا، اسے میرے قول کے مطابق فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ امام صاحب فتویٰ جاری کرتے وقت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ یہ نعمان بن ثابت کی (یعنی میری) ذاتی رائے ہے اور ہماری طاقت کے مطابق بہترین رائے ہے، جو شخص اس سے بہتر بات لائے تو وہ درست ہونے کے زیادہ لائق ہے (یعنی اس کو ماننا زیادہ قرین صواب اور اولیٰ ہے) اب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا ارشاد شاہ صاحب ان الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

وكان الامام مالک رضى الله عنه يقول: ما من احد الا هو ماخوذ من كلامه و مردود عليه الا رسول الله صلى الله عليه وسلم. <sup>(۲)</sup>

(امام مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو بات کسی سے لی گئی ہے وہ اس پر لوٹا دی جائے گی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہمیشہ قائم اور قابل عمل رہے گا۔)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت شاہ صاحب رقم طراز ہیں۔

روى الحاكم والبيهقي عن الشافعي رضى الله عنه انه كان يقول اذا صح الحديث فهو مذهبي وفي رواية اذا رايتم كلامي يخالف الحديث فاعملوا بالحديث واضربوا بكلامي الحائط. <sup>(۳)</sup>

۱۔ حجة الباء ج ۱ ص ۱۵۷۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

(امام حاکم اور امام بیہقی نے امام شافعی رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی مسئلے میں جب صحیح حدیث مل جائے تو سمجھ لو کہ یہی میرا مذہب ہے۔ ایک روایت میں فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ میرا کلام حدیث کے خلاف ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر دے مارو۔)

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے، یہاں ایک اور قول پڑھتے جائیے۔

وكان الامام احمد رضى الله عنه يقول: ليس لاحد جمع الله ورسوله كلام.<sup>(۱)</sup>

(امام احمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں کسی کی بات قابلِ حجت اور لائق تسلیم نہیں۔)

ائمہ کرام کے ان واضح ارشادات کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”گستاخ“ کا اطلاق کن لوگوں پر ہوگا؟ ان لوگوں پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو لائحہ عمل ٹھہراتے ہیں یا ان پر جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں ائمہ کرام کے اقوال کو لائق عمل قرار دیتے ہیں؟

### ایک اور بات

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات حجۃ اللہ البالغہ عقد الجید اور تمہیمات وغیرہ میں مسئلہ تقلید پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بات کتاب و سنت اور آثار صحابہ یا تابعین و تبع تابعین کے اعمال و اقوال سے واضح ہو جاتی ہے اسی کو عمل کی بنیاد بنایا جائے گا۔ اسے چھوڑ کر کسی امام فقہ کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ ائمہ فقہ نے اپنی تقلید سے لوگوں کو روکا ہے اور خیر القرون میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے کسی صحابی کی یا کسی تابعی نے کسی تابعی کی تقلید کی ہو۔ شاہ صاحب تقلید کے سلسلے میں امام ابن حزم کے حوالے سے ایک نہایت عجیب و غریب نکتہ بیان فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔



وایضا فما الذی جعل رجلا من هؤلاء او من غیرہم اولیٰ ان یقلد من عمر بن الخطاب او علی بن ابی طالب او ابن مسعود او ابن عمر او ابن عباس او عائشة ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم؛ فلو ساغ التقليد لکان کل واحد من هؤلاء احق بان یتبع من غیرہ۔ (۱)

(یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ان میں سے یا ان کے علاوہ دوسروں میں سے کون ہے جو عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس یا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے افضل و بہتر ہو۔ اگر تقلید جائز ہوتی تو ان میں سے ہر شخصیت کو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کی تقلید کی جاتی۔)

لیکن یہاں تو صورت حال بالکل مختلف ہے اور تقلید کا سلسلہ قطعی طور سے ختم ہے۔ مسائل کی تحقیق اور استفتاء و افتاء کا سلسلہ زمانہ نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاری ہے۔ آنحضرت کے بعد صحابہ کرام اور پھر تابعین و تبع تابعین قرآن و حدیث کے مطابق مسائل بتاتے تھے اور ان مسائل کو صحیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ تقلید کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تقلید کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں امام عزالدین بن عبد السلام کی ایک عبارت درج کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ومن العجب العجب ان الفقهاء المقلدین یقف احدہم علی ضعف ماخذ امامہ بحیث لا یجد ضعفہ مدفعا وھومع ذالک یقلدہ فیہ ویترک من شھد الکتاب والسنة والاقیسة الصحیحة لمنھبھم جمودا علی تقلید امامہ بل یتخیل لدفع ظاہر الکتاب والسنة ویتا ولھا بالتاویلات البعیة الباطلة نضالاعن مقلدہ۔ (۲)

(عجیب تر بات یہ ہے کہ مقلدین فقہاء کو اپنے امام کے کم زور دلائل کا پتا چل

جاتا ہے، جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود اس مسئلے میں وہ اسی کی تقلید کرتے ہیں اور ان لوگوں کے نقطہ نظر کو ترک کر دیتے ہیں جو کتاب و سنت اور قیاسات صحیحہ سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ وہ اپنے امام کی تقلید کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور ہر صورت میں اس پر جبر رہتے ہیں۔ کتاب و سنت کے ظاہر مطلب سے دور رہنے کی غرض سے وہ بہت سی تاویلیں کرتے اور اپنے امام کی مدافعت کے لیے کئی قسم کی بے بنیاد اور دوراز کار تاویلوں سے کام لیتے ہیں۔)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منسوب بہ حبلیت تھے، لیکن بہت بڑے مجتہد تھے۔ وہ بعض اہم مسائل میں فقہ حبلی کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کا نقطہ فکر یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب و سنت کی نص کو دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا۔ پھر اجماع و قیاس سے کام لیا جائے گا۔ نص کے ہوتے ہوئے تقلید پر قائم رہنا، ان کے نزدیک قرآن کی رو سے اتباع ظن اور خواہشات نفس کی پیروی ہے۔<sup>(۱)</sup>

### اصطلاحی تقلید کی تاریخ

اب اس مسئلے کی طرف آئیے کہ اصطلاحی تقلید کا آغاز کب ہوا؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک کسی امام یا کسی ایک فقہی مذہب کی تقلید کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ الباقیہ میں باب حکایۃ حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

اعلم ان الناس كانوا قبل المائة الرابعة غیر مجمعين على التقليد  
الخالص لمذهب واحد بعينه. (۲)

(یہ بات خوب جان لو کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگ کسی ایک خاص اور

۱۔ فتاویٰ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ج ۳ ص ۳۸۵

۲۔ حجتہ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۲

معین مذہب کی تقلید نہیں کرتے تھے۔)

اس سے آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

انہم کانوا فی المسائل الاجتماعیۃ الی لا اختلاف فیہا بین المسلمین او جمهور المجتہدین لا یقلدون الا صاحب الشرع۔<sup>(۱)</sup>  
(ان اجتماعی مسائل میں، جن میں عام مسلمانوں یا جمهور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لوگ صرف صاحب شریعت (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقلید و اتباع کرتے تھے۔)

شاہ صاحب اس سے آگے مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

واذا وقعت لہم واقعة استفوا فیہا ای مفت وجلدوا من غیر تعین مذہب، وکان من خبر الخاصة انه کان اہل الحدیث منہم یشغلون بالحدیث فیخلص الیہم من احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم و آثار الصحابة مالا یحتاجون منہ الی شئی آخر۔<sup>(۲)</sup>  
(اگر کوئی اہم واقعہ پیش آ جاتا تو عام لوگ اس کے متعلق جو مفتی بھی انھیں میر آتا اس سے فتویٰ طلب کرتے۔ رہے علما تو جوان میں اہل حدیث ہوتے وہ حدیث سے شغف رکھتے تھے، انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہ کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ تھی۔)

### ایک سوال

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب چوتھی صدی ہجری تک کسی معین امام فقہ کی تقلید نہیں کی جاتی تھی اور مسائل کے لیے براہ راست کتاب وسنت سے رجوع کیا جاتا تھا تو اس کے بعد تقلید کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟ پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی گزارش ہے کہ جب بعض حضرات کے نزدیک غیر مقلد ”گستاخ“ قرار پاتے ہیں تو چوتھی صدی ہجری تک کے مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا؟ کیا ان پر بھی اسی لفظ کا اطلاق ہوگا، جس کا اطلاق

موجودہ غیر مقلدین پر کیا جاتا ہے؟ کیا انھیں اپنا اسلام ثابت کرنے کے لیے مقلدین حضرات کی بارگاہ تقلید سے سند لینا پڑے گی؟

یہاں یہ یاد رہے کہ امام مالک کے مقلد بھی دنیا میں موجود ہیں، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی تقلید کرنے والے بھی کہیں زیادہ کہیں کم تعداد میں مختلف علاقوں اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں سختی کا اظہار کرنا اور غیر مقلدوں کو گستاخی کا سرٹیفکیٹ عطا فرمانا، حضرات احناف ہی کا شیوہ ہے۔ ان کی تقلید میں معلوم نہیں اہل حدیث کے خلاف تشدد کے جرائم کیوں کھس آئے ہیں۔ ادھر اہل حدیث کا نام لیا اور ادھر ان کی مقلدیت جوش میں آئی۔ اس ضمن میں احناف کے دونوں مکاتب فکر (دیوبندی اور بریلوی) ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

### حضرت مولانا تھانوی کا فرمان

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے دیوبندی مکتب فکر کے کسی شخص نے پوچھا کہ ہمارے قریب ایک مسجد بریلوی حضرات کی ہے اور ایک اہل حدیث کی۔ ہمیں نماز کس امام کی اقتدا میں پڑھنی چاہیے؟  
ارشاد ہوا بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے اس لیے کہ وہ مقلد ہے۔

### نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

بھم اللہ اہل حدیث کا دامن اس قسم کے بے جا تشدد سے پاک ہے۔ ان کی نماز ہر امام کی اقتدا میں ہو جاتی ہے۔ وہ اس حدیث پر عامل ہیں جو ابو داؤد کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف کے ”باب الامامہ“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براكان او فاجرا.

(یعنی تمہارے لیے نماز باجماعت پڑھنا ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے وہ

مسلمان نیکو کار ہو یا فاجر۔۔۔!)

کسی حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ مقلد امام کی تلاش میں نکل کھڑے ہو، اگر مقلد امام کہیں مل جائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھو۔ اگر مقلد نہ ملے، غیر مقلد ملے تو اس کے پیچھے نہ پڑھو، کیلئے پڑھ لو۔

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا طریق عمل

نماز میں امام کی اقتدا کے سلسلے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا فرمان بھی قارئین کرام کے مطالعے میں آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کے الفاظ بھی ہم نے پڑھے۔ اب مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے عالم حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق عمل پر غور فرمائیے۔ ان کا بہت بڑا حلقہ درس تھا، جس میں دور دراز سے طلباء آ کر تحصیل علم کرتے تھے۔ خاص دہلی شہر میں ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے الگ جمعہ پڑھنا مناسب نہیں سمجھا، وہ بادشاہی مسجد میں حنفی امام کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد احناف کے تشدد اور تعصب کی وجہ سے دہلی میں اہل حدیث اور احناف کے متعدد جمعے قائم ہو گئے۔ (معیار الحق ص ۱۷۲)

یہ واقعہ اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ حضرت میاں صاحب انتہائی روادار اور طبعاً بہ درجہ غایت صلح کل تھے۔ وہ بعض اختلافی مسائل میں نرم رویہ اختیار کرنے کے عادی تھے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مسائل میں سختی کا مظاہرہ کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اندازہ کیجیے کہ وہ غیر مقلد ہیں بلکہ غیر مقلدوں کے سربراہ ہیں۔ مگر مقلدوں کی اقتدا میں نماز پڑھتے اور جمعہ ادا فرماتے ہیں۔ اس کے برعکس مقلدین کا کیا نقطہ نگاہ ہے، اس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے نزدیک نماز مقلد کی اقتدا ہی میں پڑھنی چاہیے، اگرچہ اس کی دینی حالت کتنی ہی پست ہو۔ غیر مقلد کی اقتدا سے بچنا چاہیے، بے شک وہ کتنا ہی متدین اور پابند سنت ہو۔ یعنی چوں کہ وہ پابند تقلید امام نہیں ہے، محض پابند سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، اس لیے اس کی اقتدا میں نماز نہ پڑھی جائے۔

## تقلیدی دور

گزشتہ سطور میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ تقلید کا دور چوتھی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ نہ تھا، اس کے بعد تقلید کا رجحان عام ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی فرماتے ہیں۔

”پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی تہذیب کو بالکل کتاب و سنت کے برابر سمجھا جانے لگا۔ سائل جب علمائے دین سے شریعت کے متعلق سوال کرتا ہے تو ہمارے ملک کے علمائے کرام بلا تامل ہدایہ درمختار شامی اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کی عبارات لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے شریعت کی بات بتادی اور حق ادا کر دیا۔ وہ قرآن و حدیث کا حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتے، بس ایک خاص مکتب فکر کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔“

(معیار الحق مقدمہ ص ۷ ک)

حضرت مولانا نے تو ہدایہ درمختار کے حوالوں کا ذکر فرمایا ہے، اس فقیر نے قدوری اور اصول شامی کے حوالے بھی دیکھے ہیں، بلکہ ”پکی روٹی“ کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں، جب کہ وہ کچی روٹی بھی نہیں ہوتی۔

## اجتہاد کا دروازہ بند

علمائے احناف کے نقطہ فکر کے مطابق چوتھی صدی ہجری کے بعد تقلید کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے ایک ترک عالم شیخ حسین آفندی کی کتاب ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے ترکی کے سلطان عبدالحمید کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب کا نام ہے ”رسالہ حمیدیہ فی حقیقۃ الدیانۃ الاسلامیہ“... اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اب لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ گئی ہیں، عزائم ختم ہو گئے ہیں، سوچ بچار کی قوتیں جواب دے گئی ہیں اور ذہنوں میں پستی آ گئی ہے، لہذا اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں۔

ولكن من عصر اربع مائة من الهجرة النبوية على صاحبها ازكى الصلوة والسلام قال بعض العلماء الا علام كما ينقل من علماء الحنفية ان باب الاجتهاد قد انسد من ذالك التاريخ. (رساله حميديه فى حقيقة الديابة الاسلاميه ص ۳۲۸)

(چوتھی صدی ہجری نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تاریخ سے بعض جلیل القدر علماے حنفیہ کے فرمان کے مطابق اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔)

مطلب یہ کہ جو مسائل پیدا ہونا تھے وہ چوتھی صدی ہجری تک پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا جس پر سوچنے کی ضرورت پڑے۔ پہلے ائمہ کرام نے جو کچھ سوچ لیا اور جس مسئلے کی جو تشریح کر دی، بس وہی کافی ہے، مزید سرکھپانے کی ضرورت نہیں۔

چوتھی صدی ہجری کو گزرے ہوئے ایک ہزار سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ اس اثنا میں امت مسلمہ بے شمار مسائل سے دوچار ہوئی اور ہر لمحہ نئے سے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہوں گے۔ کیا ان پر غور و فکر کے لیے اجتہاد سے کام نہ لیا جائے اور سوچ بچار کے دروازوں پر قفل چڑھا دیا جائے؟ یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کی کوئی باشعور آدمی تائید نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ دینی مسائل کو سمجھنے اور شرعی معاملات پر غور کرنے کے لیے ائمہ اہل سنت نے چار بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) قرآن۔ (۲) سنت۔ (۳) اجماع امت۔۔۔ اور (۴) قیاس۔

جب تک قرآن مجید موجود ہے، سنت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دور دورہ ہے، اجماع امت اور قیاس کو اہمیت حاصل ہے، اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا، تقلید و جمود کے ذریعے اس بنیادی ضرورت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

کسی امام یا فقیہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ امام یا مجتہد ہیں اور فلاں صدی تک ان کے اجتہاد کو ماننا ضروری ہے، اس کے بعد تقلید کا دور شروع ہو جائے گا۔ پھر ان کی تقلید میں مصروف ہو جانا اور غیر مقلدوں اور اجتہاد کے حامیوں کو تنقید کا نشانہ بنالینا۔ اگر یہ کرو گے

تو بیڑا پار ہے اور جنت کے دروازے تمھارے لیے وا ہیں۔  
 مالکی، شافعی اور حنبلی بھی مقلد ہیں۔ مالکی امام مالک کی تقلید کرتے ہیں، شافعی امام شافعی کی اور حنبلی امام احمد کی۔ لیکن ان میں سے کسی کو تقلید کا اتنا شوق نہیں جتنا حضرات احناف کو ہے۔ نہ وہ اس طرح زور اور تسلسل سے غیر مقلدوں کو ہدف طعن ٹھہرانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں، جتنا حنفی علمائے کرام دیتے ہیں۔ حنفی علمائے کرام کی بہت بڑی خدمت دین یہ ہے کہ اہل حدیث کو رگیدا جائے، کبھی غیر مقلد کہہ کر، کبھی گستاخ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بزرگوں کے منکر کہہ کر، کبھی نجدی اور وہابی کہہ کر۔

### تاریخ کا ایک ورق

گزشتہ سطور میں ہم نے کتاب و سنت پر عمل کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار عالیہ کا مطالعہ کیا اور تقلید کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ہمارے علم میں آیا۔ اس ضمن میں حضرت استاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم و مغفور کے بعض اقتباسات بھی ہماری نظر سے گزرے۔ مسئلہ تقلید کی بحث کے سلسلے میں حضرت مولانا سلفی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

”ائمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ولادت اور وفات کے سنن پر غور کیا جائے تو ۸۰ ہجری سے شروع ہو کر امام احمد کی وفات ۲۴۰ ہجری تک یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان ایام کے بعد برسوں اس جمود اور تقلید کا پتا نہیں چلتا جسے آج کل واجب کہا جا رہا ہے اور اس سے اعراض کو بے دینی وغیرہ القاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پر اظہار فخر یا اس کی طرف دعوت کسی صورت میں بھی چوتھی صدی ہجری سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ فتح ہند سے قبل پہلا لشکر جو ساحل ہند پر اترا، اس وقت ان مروجہ مذاہب کا نام و نشان نہ عرب میں تھا نہ عجم میں۔ تقلید ائمہ کے موجودہ انداز سے ذہن بالکل خالی تھے۔

ہند پر پہلا حملہ ۹۳ ہجری میں ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں



ہوا۔<sup>(۱)</sup> عرب میں تو اس وقت تابعین کی کثرت تھی، ائمہ اربعہ کا خیال بھی اس وقت ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ خراسان، ایران اور فارس میں ان دنوں ائمہ حدیث کی کثرت تھی۔ احادیث کا حفظ و ضبط اور نقل و روایت ان حضرات کا محبوب مشغلہ تھا۔ حدیث کی جمع و تدوین کے اس دور میں ائمہ کی (موجودہ) فقہوں کا احساس بھی کسی کو نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے فتوے بلا تخصیص و تعین اہل علم کی نظر میں تھے۔ تقلید کا اس وقت شائبہ تک نہ تھا۔ اسلامی قلمرو کے تمام گوشوں میں یہی مسلک پایا جاتا تھا، جسے آج کل ہم اہل حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔<sup>(۲)</sup>

### مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطہ نظر

اپنی مشہور کتاب ”تذکرہ“ میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) نے بھی اپنے اسلوب خاص میں اس موضوع کو شائستہ التفات ٹھہرایا ہے اور جن الفاظ میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے وہ لائق مطالعہ ہیں۔ جی چاہتا ہے خواندگان محترم مولانا کے افکار عالیہ سے بھی مستفید ہو جائیں۔ مولانا فرماتے ہیں:-

کتب فقہ و واقعات و فتاویٰ و حوادث کی بے شمار تفریعات و محدثات فقہیہ میں جن سے قدامت و ائمہ کو کوئی تعلق نہیں، مگر بے ٹکان لکھ دیا جاتا ہے کہ کذا عند ابی حنیفہ و کذا عند فلان۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کسی قرار دادہ اصل کی بنا پر یہ تفریع ہے اور فلاں اصل جو ہم نے ان کی ٹھہرائی ہے اس کی بنا پر یہ جزئیہ تفریع ہوتا ہے۔ حالانکہ تفریع خود ان کی ساختہ و پرداختہ ہے اور امام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی

۱۔ حضرت مولانا کی مراد دربار خلافت کی طرف سے باقاعدہ اور بھرپور جملے سے ہے جو ۹۳ ہجری میں محمد بن قاسم کی قیادت میں ہوا۔ لیکن اس سے ۷۸ سال قبل ۱۵ ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کے زیرِ کمان حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ کے عہد خلافت میں تھانہ کی بندرگاہ پر بحری حملہ ہو چکا تھا جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۲۱۰-۲۱۱۔

تخریج در تخریج، و تفریع در تفریع، و قیاس در قیاس، و استنباطات را سیہ چند در چند، و افتاح بر بحر، و قواعد منطقہ جزئیات و کلیات و تمثیل و تقسیم و ابعاد بعد و ابھر و ابھر اصلین اسامین کتاب و سنت کی مصیبت عظمیٰ و رزیت کبریٰ ہے جس کی وجہ سے قرآن بعد قرن و سلاً بعد نسل سخت و شدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانہ شرع میں فساد عظیم رونما ہوا۔ ازاں جملہ یہ کہ ناواقف عند ابی حنیفہ دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ فرع امام ابو حنیفہ کا بعینہ مذہب ہے۔ جب مسئلہ عشر فی العشر، اور تحریم اشارہ فی التشہد، و کراہت رفع الیدین عند الرکوع، و کراہت آمین بالجہر، و اقتدائے خلف مخالف، و عدم وجوب طمانیہ، و وجوب لزوم و تعین وغیرہ کی نسبت صاف دیکھ رہے ہیں کہ صریح تصریحات کتب اصول و موطا و جامع وغیرہ کے خلاف لکھا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض کوتاہ آستینان فقاہت کی دراز دستیاں یہاں تک بڑھیں کہ رفع الیدین عند الرکوع اور اشارہ فی التشہد کو فعل کثیر کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے، تو پھر اور باتوں کے لیے ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا؟

درازدستی ایں کوتاہ آستیناں ہیں! (۱)

اس سے آگے مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

حتیٰ کہ بعض دانش مندوں نے تو ایک ہی قاعدہ بنا کر سارے جھگڑے چکا دیے:

اذا كان في المسئلة قول لابی حنیفة وصاحبیه وحديث  
یحکمون بصحته، و جب اتباع قولهم دون الحديث، لانا نظن  
بابی حنیفة وصاحبیه انهم عارضوا الحديث مع صحته وصحة  
الاستنباط.

(یعنی اگر کسی مسئلے میں حدیث صحیح ایک طرف ہو اور دوسری طرف اس کے خلاف امام ابو حنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کا قول تو واجب ہے کہ حدیث کو چھوڑ دیا جائے اور قول امام ہی کی پیروی کی جائے، کیونکہ

آخر کوئی بات تو ہوگی جس کی وجہ سے انھوں نے ایسا کیا)  
تو کیا یہ قاعدہ بھی اس وجود گرامی کا قرار دادہ ہو سکتا ہے جس نے اپنی ساری عمر  
مقدس اس صدائے حق کے اعلان و تکرار میں بسر کر دی کہ اتر کو اقولی لخبیر  
الرسول . پیغمبر کے مقابلے میں میرا قول ترک کر دو۔ اور کیا اس طرح کے قواعد کا ان  
لوگوں کو گمان بھی گزر سکتا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ اذا صح الحديث فهو مذهبی  
فاضر بوا بقولی الحائط (جب صحیح حدیث تمہیں مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو اور  
میرا قول دیوار پر دے مارو) (۱)

مولانا مزید فرماتے ہیں۔

لکھتے لکھتے بات یاد آگئی۔ ہمارے زمانے کے بعض مشہور ملاؤں کی نسبت بھی  
خصوصیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ اسی حیلہٴ زکات پر عمل کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے  
مجھ سے ایک مولوی صاحب کی نسبت کہ مدرس بھی ہیں واعظ بھی ہیں اور جدل و مکاتبات  
کے رسائل کے مصنف بھی بیان کیا کہ وہ ہر سال اپنا اندوختہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے  
ہیں اور پھر وہ نیک بخت اسی کارِ عمل کرتی ہے۔ ان کے استاد جناب مولانا محمود حسن  
صاحب دیوبندی نے یہ سنا تو ایسا کرنے سے روکا کہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ میں نے یہ  
سن کر کہا کہ تقویٰ تو ایک مزید درجہٴ عمل و فضیلت ہے اس کا یہاں ذکر ہی کیا؟ یوں کہنا  
چاہیے کہ سرے سے دین و شریعت کے ہی خلاف ہے اور ایک نہایت غلیظ قسم کا باطنی فسق  
اور کامل قسم کی یہودیت اور اصحاب السبت کے شجرہٴ ضلالت سے پورا پورا استحقاق! خیر  
دنیا کی زندگی ہے اور دنیا والوں کے احکام و انظار سے مقابلہ جو جی میں آئے کر لیں اور  
ابلیس خادع کی ہر کھولی ہوئی راہ کو صراطِ مستقیم سمجھ لیں لیکن ایک دن آنے والا ہے  
جب نیتوں کے جمیدوں کا جاننے والا اور سراڑ و خفایاے قلوب کا دیکھنے والا سامنے ہوگا  
اور اس وقت یہ ساری مکاریاں اور حیلہ بازیاں جو دنیا والوں کو دھوکا دیتی تھیں دھری کی  
دھری رہ جائیں گی۔ (۲)

## مولانا محمد حنیف ندوی کی ایک تحریر

مولانا محمد حنیف ندوی جماعت اہل حدیث کے جلیل القدر عالم اور بہت بڑے مصنف تھے۔ ان کا انداز نگارش نہایت عالمانہ اور انتہائی دلاویز تھا۔ وہ قدیم و جدید پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ہفت روزہ ”الاعتصام“ (لاہور) میں بہت عرصہ پیشتر ”اہل حدیث کا تصور دینی“ کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا جس میں مسئلہ تقلید کو بھی ہدف نظر قرار دیا تھا۔ اس مقالے کا ایک حصہ جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ مولانا ندوی نے ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔۔۔۔۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حدیث کا تصور دینی جس درجہ سادہ سمجھ میں آنے والا اور قلب و روح کو حرارت و تپش عطا کرنے والا ہے یا رلوگوں نے اتنا ہی اسے الجھا دیا ہے اور اس کے بارے میں ایسی ایسی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ سوال کم پڑھے لکھے یا جہال کا نہیں، اچھے خاصے علما کا ہے۔ ان حلقوں میں اگر کسی جانی پہچانی شخصیت کے بارے میں بھی بھولے سے کسی نے یہ کہہ دیا یا لکھ دیا کہ صاحب وہ تو وہابی غیر مقلد یا اہل حدیث ہے تو نہ پوچھیے صرف اتنا کہہ دینے اور لکھ دینے سے اس سے متعلق طبیعت کس تیزی سے بدل جاتی ہے اور اس کے خلاف نفرت و تعصب کے کتنے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نفرت و تحقیر کا یہ بادۂ تلخ انگریز کے استعماری مصالح کے علاوہ اور کن کن مقدس ہاتھوں سے کشید ہوا ہے؟ اور تہمت طرازی کی اس سازش میں کس کس نے حصہ لیا ہے؟ کن کن عناصر نے اہل حدیث کے خلاف اس نفسیاتی مہم کو چلانے میں کامیاب کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک مستقل اور علیحدہ موضوع ہے جو مخصوص تحقیق و التفات چاہتا ہے۔ کیونکہ ”اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔“ تاہم اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ نفرت کی یہ مہم پورے زور شور اور تنظیم کے ساتھ آج بھی جاری ہے، حالانکہ جماعت اہل حدیث کے عقاید و سرگرمیاں اور کارنامے کوئی چیز بھی تو دھکی چھپی نہیں اور کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس میں اسلامی نظریہ و تصور سے کسی

درجے میں بھی انحراف پایا جائے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم تو معتب اور مستوجب تعزیر ہی اس بنا پر ہیں کہ ہم فقہ ہو یا کلام، تفسیر ہو یا حدیث، دین کے معاملے میں ادنیٰ انحراف کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارا سیدھا سادا عقیدہ یہ ہے کہ حق و صداقت کو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول ہی میں محصور و منحصر مانو اور سعی و عمل یا فکر و عقیدے کا جب بھی کوئی نقشہ ترتیب دو تو تابش وضو کے لیے اسی آفتاب ہدایت کی طرف رجوع کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انسانی کے لیے سراج منیر ٹھہرایا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسَوَاجًا مُنِيرًا. (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

(اے پیغمبر ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور خدا کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن!)

یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہم کسی طرح بھی تاریخی ارتقا کے منکر نہیں اور زمانے کے ناگزیر تقاضوں کے تحت فقہ و کلام کے سلسلے میں ہمارے ہاں جلیل القدر علما اور آئمہ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان سے ذرہ برابر صرف نظر کو ہم جائز تصور نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کی فکری و آئینی کاوشیں، امام شافعیؒ کے اصول فقہ و حدیث کے معرکے، امام مالکؒ کا اصحاب مدینہ کے تعامل کو دست بردو زمانہ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے محفوظ کر لینا اور امام احمد بن حنبلؒ کی جمع حدیث کی وسیع تر کوششیں، ہماری تہذیبی انفرادیت کا زندہ ثبوت ہیں اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر ہم جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔

ہم حق کو ان سب مدارس فکر میں جن کی ان بزرگوں نے بنیاد رکھی دائر و سائر تو مانتے ہیں لیکن محصور و منحصر کسی میں بھی نہیں جانتے، کیونکہ ہمارے نقطہ نگاہ سے صحت و صواب کی استواریاں غیر مشروط طور پر صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ (النساء: ۵۹)  
 (اے ایمان دارو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ  
 وسلم) کی اور صاحب امر کی جو تم میں سے ہو اور اگر تم میں کسی چیز پر تنازع ہو  
 جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہ انجام کے لحاظ سے  
 بہتر ہے۔)

ہمارے عقیدے کی رو سے استدلال و تاویل کا یہی دو چیزیں نقطہ آغاز ہیں اور یہی  
 نقطہ آخر۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ سورہ نساء کی اس آیت کو ہم Preamble یا  
 قانونی اساس سمجھتے ہیں۔ اس آیت ہی کے لب و لہجے میں علماء سے کہتے ہیں کہ ہر ہر متنازع  
 فیہ مسئلے میں اول و آخر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیجیے۔ تقلید و عدم تقلید کی اصطلاح  
 میں پڑے بغیر کہ اس میں قدرے الجھاؤ اور جھول ہے، ہم محبت و وفا کی زبان میں دعویٰ  
 داران عشق رسول سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ خدا را آپ ہی بتائیے اگر کسی گروہ نے یہ فیصلہ  
 ہی کر لیا ہو کہ طلب و آرزو کے دامن کو وہ صرف انہی گل بوٹوں سے سجائے گا جو قرآن و  
 سنت کے سدا بہار دستان میں نظر افروز ہیں اور اگر کچھ لوگوں نے ازراہ شوق یہی مناسب  
 جانا ہو کہ ان کی نظر اگر کسب ضو کرے گی تو انہی انوار و تجلیات سے جو چہرہ نبوت کی زیب و  
 زینت ہیں یا زمان و مکان کے فاصلوں کو ہٹا کر اگر کوئی بے تاب اور متحسّس نگاہ اسی جمال  
 جہاں آرا کا براہ راست مشاہدہ کرنا چاہتی ہے جس کی جلوہ آرائیوں نے عشاق کے دلوں  
 میں پہلے پہل ایمان و عمل کی شمعیں فروزاں کیں تو آیا یہ کوئی جرم گناہ یا معصیت ہے؟ اور  
 اگر یہ جرم اور معصیت ہے تو ہمیں اقرار ہے کہ ہم وابستگان دامن رسالت اور اسیران  
 حلقہ نبوت مجرم اور گناہ گار ہیں۔

تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ دراصل فنی و علمی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ٹھیکہ  
 اسلام کی رو سے ہماری اولیں ارادت کا مرکز کون ہے؟ ہماری پہلی اور بنیادی وابستگی کس  
 سے ہونا چاہیے اور پیش آمدہ مسائل میں مشکلات کے حل و کشود کے سلسلے میں ہمیں اول  
 اول کس کی طرف دیکھنا چاہیے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول کی چشم کشا اور ابدی تعلیمات کی

طرف یا فقہی مدارس فکر کی وقتی اور محدود تعبیرات کی طرف؟ اس سے قطع نظر کہ تقلید سے فکر و نظر کی تازہ کاریاں مجروح ہوتی ہیں اور اس سے بھی قطع نظر کہ اس سے خود فقہ و استدلال کے قافلوں کی تیز رفتاری میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور تہذیب و فن کی وسعتیں، زندگی، حرکت اور ارتقا سے محروم ہو جانے کے باعث حد درجہ سمناء اختیار کر لیتی ہیں، اصل نقص اس میں یہ ہے کہ اس سے عقیدت و محبت کا مرکز ثقل یکسر بدل جاتا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ ہماری ارادت و عقیدت کا محور و قبلہ اول و آخر کتاب اللہ اور سنت رسول ہے، ہماری عصمتیں مخصوص فقہی مدارس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور غیر شعوری طور پر قلب و ذہن اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ بحث و تحقیق کے مرحلے میں کتاب و سنت سے کسی نہ کسی طرح مسائل کی وہی نوعیت ثابت ہو جو ہمارے حلقے اور دائرے کے تقاضوں کے عین مطابق ہو، حالانکہ اللہ اور رسولؐ سے ربط و تعلق کی کیفیتیں معروضیت (Objectivity) چاہتی ہیں اور اس بات کی متقاضی ہیں کہ ہر مسئلے اور ہر امر میں نقطہ نظر کسی خاص مدرسہ فکر کی تائید و حمایت کرنا نہ ہو بلکہ اس شے کی تصدیق مقصود ہو کہ اخذ و قبول کے لحاظ سے کون سی صورت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے زیادہ قریب تر ہے۔



## سولھواں باب

# علم حدیث اور علم اسماء الرجال

محدثین اور اہل الحدیث کی خدمت بوقلموں میں سے ایک خدمت جلیلہ علم اسماء الرجال ہے۔ اس علم کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کی تبلیغ و اشاعت کے دائرے نے انتہائی وسعت اختیار کی اور یہ سلسلہ دور دراز تک پھیلا۔ علم حدیث اور علم اسماء الرجال دونوں کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم اسماء الرجال حدیث ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آیا۔ حدیث کا معاملہ نہایت نازک اور بہ درجہ غایت احتیاط کا متقاضی ہے، اسی لیے اس کے ساتھ ایک سلسلہ اسناد و وابستہ ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں کون کون حضرات شامل ہیں اور وہ کس حیثیت کے حامل ہیں، کسی میں کسی قسم کی کوئی کم زوری تو نہیں پائی جاتی، کہیں کسی نوع کا کوئی نقص تو راہ نہیں پا گیا ہے۔ علم میں، عمل میں، گفتار میں، کردار میں، میل جول میں، معاملات میں اور زندگی کے کسی بھی گوشے میں کسی راوی میں کوئی سقم تو نہیں ہے۔ اہل الحدیث نے اس علم کی وساطت سے تمام امور کو مرکز غور و فکر ٹھہرایا ہے اور قبول روایت کی سخت شرائط مقرر کی ہیں۔ اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں ہر پہلو کو منقح کر دیا گیا ہے۔ آئندہ سطور میں اسی کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔

حدیث کیا ہے؟

لفظ حدیث کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تقریر پر ہوتا ہے۔ اکثر خبر اور سنت کے الفاظ بھی انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ حدیث کا لفظ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام اور ارشادات کے لیے پسند فرمایا تا کہ آپ کے اور دوسرے



لوگوں کے کلام اور اقوال میں امتیاز ہو سکے اور آسانی سے نشان دہی کی جاسکے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اور یہ کسی اور کا قول۔ یہی وجہ ہے کہ دینی روایات کے اس دلاویز اور ضوفشاں ذخیرے کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین پر مشتمل ہے ”حدیث“ کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ ”علم الحدیث“ کہلایا۔

### علم اسماء الرجال کے حدود و اطلاق

پھر آگے چل کر علم حدیث میں اس درجہ وسعت اور تنوع پیدا ہوا کہ اس سے متعدد علوم عالم وجود میں آئے اور اس شجرہ طیبہ کی طویل و عریض شاخوں نے گونا گوں اور بوقلموں اصناف علم کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور پروان چڑھایا۔ ان علوم میں ایک نہایت بنیادی اور ضروری علم ”اسماء الرجال“ کا ہے جس کی علم حدیث کے ساتھ بہ درجہ غایت گہری وابستگی ہے۔ جب ہم حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو ذہن بلا کسی ادنیٰ توقف کے فوراً اسماء الرجال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس علم کی کیا تعریف ہے اور اس کے حدود و اطلاق کیا ہیں؟ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ راویان حدیث کے حالات و کوائف سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کی سیرت و سوانح اور تراجم و احوال کو معرض بیان میں لانا ”فن اسماء الرجال“ یا ”علم اسماء الرجال“ کہلاتا ہے۔

### آنحضرتؐ کے فرامین کی تبلیغ و حفاظت کرنے والی اولین جماعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام کے عظیم الشان اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: فلیبلغ الشاهد الغائب۔ یعنی جو لوگ اس مجمعے میں موجود ہیں جو میری زندگی کے لیل و نہار سے واقف ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے میرے عمل و کردار کا مشاہدہ کیا ہے اور جانتے ہیں کہ ان کے سامنے میری حیات دنیوی کس انداز کی رہی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ یہ سب باتیں ان لوگوں تک پہنچادیں جو اس وقت کسی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں یا ابھی اس عالم آب و گل میں نہیں آئے آئندہ

پیدا ہوں گے۔

چنانچہ حضور ﷺ کے جان نثاروں اور آپ کے ہر قول و فعل کی حفاظت کرنے والی عالی قدر جماعت نے جنہیں آپ کے ”صحابہ“ کہا جاتا ہے آپ کے اس ارشاد کو آویزہ گوش بنایا۔ یہ مقدس جماعت، شان نبوت کی ایک ایک اداے دل نواز سے نہ صرف واقف تھی، بلکہ اس پر دل و جان سے فریضہ بھی تھی اور فریضہ رسالت کے تیوروں اور اس کی نزاکتوں سے خوب آگاہ تھی۔

اس طائفہ مقدسہ نے حضور فداہ ابی و امی کے آغاز نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کے تمام واقعات، اوامر و نواہی کے سلسلے کی تمام باتیں اور معاملات و عبادات سے متعلق تمام احکام اپنی اولاد اپنے تلامذہ اپنے رفقا و احباب اور ملنے والوں کو بلا کم و کاست سنائے۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے جن شاگردوں نے اس مسند کو زینت بخشی انہیں تابعین کہا جاتا ہے، تابعین نے بھی تبلیغ و تدوین حدیث میں بدرجہ غایت گرم جوشی کا ثبوت دیا اور نہایت دیانت کے ساتھ اس امانت کو جو انہیں اپنے اساتذہ یعنی صحابہ عظام سے ملی تھی، اپنے شاگردوں کے حوالے کیا۔ تابعین کے شاگرد تبع تابعین کہلاتے ہیں۔ تبع تابعین نے بھی انتہائی کوشش اور سعی مسلسل سے یہ خدمت انجام دی اور اپنے سے بعد کے حضرات کو اس عظیم الشان دولت دینی سے مالا مال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و ارشادات کی تبلیغ و حفاظت کرنے والی اس اولیں مقدس جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے روح پرور حالات، آپ کے اقوال و معمولات اور اسوۂ حسنہ کو علمائے حدیث کی رفیع المرتبت جماعت نے اس نج و اسلوب سے محفوظ و مدون کیا کہ دنیا کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ انہوں نے روایات کی مدد سے حضور کے احوال و کوائف اور اعمال و اقوال کا ایک بے مثال گلستاں سجایا اور اپنی مساعی جلیلہ سے معرفت و ادراک کا ایک پیکر حسین لوگوں کے سامنے لاکھڑا کیا۔

برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

## پانچ لاکھ راویان حدیث

جن بزرگزیدہ ہستیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو روایت کیا یا جن شخصیتوں نے انھیں تحریر و کتابت کی سلک میں پرویا اور ان کے تحفظ و تدوین کی خدمت انجام دی، انھیں روایات حدیث و آثار کے پُر شکوہ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں صحابہ کرام سے لے کر ان کے زمانے سے بعد کی کئی صدیوں تک کے بزرگان دین شامل ہیں۔ مشہور مستشرق سپرنگر کے محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ وہ خوش بخت لوگ جہنوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل کیا، ان میں سے کم و بیش بارہ ہزار افراد کے نام اور حالات، صفحات کتب میں پوری آب و تاب کے ساتھ نقش ہیں۔

ان راویوں سے جو روایات مروی ہیں، وہ حدیث کی کتابوں میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں اس ذخیرہ دینی کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ پھر سیرت اور مغازی کے موضوع سے متعلق مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں معرض تالیف میں آچکی ہیں۔

## روایات و احادیث اور سیرت و مغازی کی جمع و تدوین

سب سے پہلے روایات کی جمع و تدوین کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے سے حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی اور سیرت کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی، جو اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ بعد ازاں مغازی اور سیرت کے موضوع سے متعلق کئی کتابیں ضبط تحریر میں آئیں۔

حدیث، تفسیر اور سیرت وغیرہ کے سلسلے کا بہت سا مواد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں متعدد صحابہ کی کوشش سے صفحات قرطاس کی زینت بن گیا تھا۔ عہد صحابہ و تابعین میں اس ضمن میں مزید تگ و تاز ہوئی، اور جن لوگوں کے پاس زبانی یا تحریری

ضرورت میں یہ سرمایہ بے بہا موجود تھا ان سے حاصل کر کے انتہائی احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا۔ وہ اس باب میں ہر سنی سنائی بات کو شائستہ التفات نہ گردانتے تھے، کیونکہ ان کے پیش نگاہ ہر وقت حضور کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ماسمع. (مسلم)  
یعنی کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کرنا شروع کر دے۔

انھوں نے روایات کے اخذ و قبول کے لیے انتہائی کڑی شرائط وضع کیں اور سخت قسم کے اصول مدون کیے۔

### اخذ روایات کے اصول و قواعد

اصحاب حدیث یا اہل الحدیث نے روایات کے اخذ و قبول کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے اور جو پیمانے اور معیار مقرر کیے ان میں ایک یہ ہے کہ اس راوی کی روایت کو قابل قبول ٹھہرایا جائے جو خود شریک واقعہ اور اس روایت کا راوی اول ہے۔ اگر بالفرض وہ خود شریک واقعہ نہیں تو ان تمام راویوں کا سلسلہ محفوظ ہونا ضروری ہے جو شریک واقعہ تک ساری بات پہنچا دیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازم ہے کہ تمام راویان واقعہ کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں۔ اصل واقعہ تک پورے سلسلہ روات میں کہیں انقطاع نہ ہو۔ پھر اس بات کا اہتمام بھی ضروری ہے کہ کامل تحقیق و تفحص کے بعد یہ فیصلہ بھی کر لیا جائے کہ سند میں جن راویوں کے نام لیے جا رہے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟ حفظ و اتقان میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ روایت و درایت میں کس درجے کے حامل ہیں؟ کس قسم کی فہم و فراست کے مالک ہیں؟ ان کی عدالت و صداقت کیسی ہے؟ ثقاہت میں ان کا کیا مقام ہے؟ معاملات میں کس پایہ کے لوگ ہیں؟ عمل و عقیدہ میں ان کا رجحان کیا ہے؟ باریک بین اور دقیقہ رس ہیں یا کند ذہن اور غبی؟ کب پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ عہد شباب کس طرح گزرا؟ زمانہ کبولت کس طرح بسر ہوا؟ شیخوخت اور پیری کی منزلیں کہاں طے ہوئیں اور کس انداز سے ہوئیں؟ تعلیم و تعلم کے مراحل کس نہج سے گزرے؟ کن اساتذہ

سے تحصیل کی؟ طالب علمی کا زمانہ کیسا تھا؟ نشست و برخاست زیادہ تر کن افکار و خیالات کے لوگوں کے ساتھ رہی؟ علم و تحقیق کے کس مرتبے پر فائز تھے؟ شب و روز کس ماحول میں بسر ہوئے؟ رفقا و احباب کس قسم کے تھے؟ دلچسپیوں کا محور کون لوگ تھے؟ مغفل تو نہ تھے؟ خلفاء و ملوک سے کوئی تعلق رکھتے تھے یا نہیں؟ اگر رکھتے تھے تو متعلق اور خوشامدی تو نہ تھے؟ زہد و عبادت کا کیا حال تھا؟ اعزہ و اقارب سے کس قسم کے تعلقات رکھتے تھے؟ متاہل تھے یا نہیں؟ توہمات کا شکار تھے یا نہیں؟ کسی معاملے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تھا یا نہیں؟ کوئی راوی سفیہ یا فاجر افسل تو نہیں تھا؟ اگر اسے سفاہت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا تو اس کی کون سی مرویات دور سفاہت سے پہلے کی ہیں اور کون سی بعد کی؟ اس میں اختلاف تھا یا نہیں؟ راوی کا تعلق اہل ہوئی یا زنادقہ سے تو نہیں تھا؟ مزاج میں عبوسیت یا بوسیت پائی جاتی تھی یا نہیں؟ توازن و اعتدال کا کیا حال تھا؟ غرض ہر راوی کے بارے میں اس قسم کی جزئیات اور تفصیلات کی پوری چھان بین کی جاتی تھی۔

یہ تھے وہ پیمانے اور معیار جو مختلف محدثین و اہل الحدیث نے قائم کیے اور ان کی روشنی میں اخذ و قبول و روایت کے اصول مقرر فرمائے۔

### راویوں کے مدارج اور طبقات

پھر روایات کے مدارج اور طبقات قائم کیے۔ ظاہر ہے بعض راوی ذہانت و فطانت اور فہم و فراست کے بہ درجہ غایت اونچے درجوں پر فائز تھے اور انتہائی دقیقہ رس اور اصحاب عدل و صدق تھے اور بعض حضرات ان اوصاف و کمالات میں کم درجے کے تھے۔ اس کے لیے طبقہ اولیٰ، طبقہ ثانیہ، طبقہ ثالثہ، طبقہ رابعہ وغیرہ کی اصطلاحیں، معرض وجود میں آئیں اور جو کوئی جس طبقے یا درجے کا مالک تھا اس کو اسی چوکھٹے میں موزوں کیا گیا۔

یہ طبقات سند کے اعتبار سے بھی ہیں اور حفظ و عدالت کے اعتبار سے بھی۔

محدثین عالی مقام نے یہ خدمت نہایت دیانت داری اور بلا خوف لومۃ لائم سرانجام دی۔ راویوں کی تدلیس کی وضاحت کی، ان کی مراہیل کی نشان دہی کی اور موقوفات کو صراحت سے بیان کیا۔ راویوں کے ضعف و غرابت کو واضح فرمایا اور ان کے

ذہول اور نسیان کو اجاگر کیا۔ ان کے تعصب فی المذہب کو صاف الفاظ میں نمایاں کیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور اس میں کھرے کھوٹے کا امتیاز اسی طرح ممکن تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے تحفظ و استناد کی کوئی صورت نہ تھی۔

اگر کسی راوی میں محدثین کی قائم کردہ شرائط پائی جاتیں تو اس کی روایت قبول کر لی جاتی، ورنہ اسے ترک کر دیا جاتا۔ اس ضمن میں یحییٰ بن سعید قطان سے کسی نے کہا:

اما تخشى ان يكون هؤلاء الذين تركت حديثهم خصمانك يوم القيامة؟

’کیا آپ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کی روایت کو آپ نے ترک کیا ہے وہ قیامت کے روز آپ سے جواب طلبی کریں؟‘  
اس کے جواب میں ان کے الفاظ یہ تھے۔

لان يكون هؤلاء خصمي احب الي من ان يكون خصمي رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لم لم تذب عن حديثي؟  
(یعنی ان لوگوں کی مجھ سے جواب طلبی کرنے سے کہیں بڑھ کر مجھے یہ خوف لاحق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے جواب طلبی کریں اور پوچھیں کہ تم نے میری حدیث کا دفاع کیوں نہیں کیا؟)

روایت حدیث میں اسناد کا التزام

پھر محدثین نے سند کا التزام کیا اور ہر روایت با اسناد بیان کی۔ ان کے نزدیک سند کو دین کے جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہے۔ امام عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے۔

الاسناد من الدين، لولا الاسناد لقال فيه من شاء بما شاء .  
(اسناد کا معلوم کرنا دین کا حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہو تو پھر ہر شخص دین کے بارے میں جو چاہے بیان کرتا پھرے۔)

عبد اللہ بن مبارک مزید فرماتے ہیں۔

بیننا وبين القوم القوائم یعنی الاسناد۔<sup>(۱)</sup>

(ہم میں اور ان واضعین حدیث میں اسناد کا فرق ہے۔ یعنی ہم اسناد کا التزام کرتے ہیں اور یہ لوگ اسناد کی پروا کیے بغیر جو بیجا ہے بیان کر دیتے ہیں۔)

راویان حدیث کے حالات و کوائف کی تلاش

روایات حدیث کے حالات و کوائف کا علم حاصل کرنے اور ان کو مختلف طبقات و درجات میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں محدثین نے بے پناہ کام کیا اور اس خدمت کی انجام دہی میں عمریں کھپا دیں۔ انھوں نے دور دراز بلاد و امصار کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، ہزاروں میل کی خاک چھانی، طویل و عریض مسافتیں طے کیں، شہر شہر اور قریہ قریہ گھومے پھرے، راویوں سے ملے اور ان کے بارے میں ہر نوع کی معلومات حاصل کیں۔ جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہیں تھے اور ان سے پہلے وفات پا چکے تھے ان سے ملنے والوں سے یا ان کے ذریعے سے دوسرے قابل اعتماد لوگوں سے، جو ان کی مقرر کردہ شرائط پر پورا اترتے تھے، ان کے حالات معلوم کیے اور اس طرح وہ عظیم الشان فن معرض وجود میں آیا، جسے ”فن اسماء الرجال“ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ فن جو روایات حدیث و آثار کے اسماء، القاب، کنیتوں، سوانح حیات، سیرت اور اوصاف کی وضاحت کرتا ہے۔ نیز ان کے بارے میں جرح و تعدیل اور ان کے طبقات و درجات کی تعیین کا آئینہ دار ہے۔ یہی وہ فن ہے جس کے بارے میں معروف مستشرق سپرنگر کا کہنا ہے:

”دنیا میں نہ کوئی قوم ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے محدثین کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔“<sup>(۲)</sup>

جن اسلاف کرام نے اس اہم اور بنیادی کام کی تکمیل اور انجام دہی کا بیڑا اٹھایا وہ

۱۔ صحیح مسلم جلد اول شرح نووی ص ۱۲۔ طبع نور محمد اصح الطالع و کارخانہ تجارت کتب، کراچی

۲۔ علامہ شبلی سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۳۹ (حاشیہ)

اپنے دور کے نہایت محنتی اور انتہائی مستعد لوگ تھے۔ وہ اس سلسلے میں نہ کسی کے دباؤ میں آئے نہ کوئی دنیوی حرص و طمع ان کے سدراہ ہوا اور نہ کوئی بڑے سے بڑا مفاد ان کے قلم کی بے پناہ رفتار میں رکاوٹ پیدا کر سکا۔ انھوں نے اپنی اس سعی مسلسل میں حدیث کے بارے میں تمام شبہات کا ازالہ کر دیا اور شک و ریب کی کوئی صورت باقی نہیں رہنے دی۔ چنانچہ سمجھ جیسا متعصب مستشرق بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

”یہاں سورج کی پوری روشنی جمع ہو گئی ہے جو ہر چیز پر براہ راست پڑ رہی ہے اور ہر شخص تک پہنچ سکتی ہے۔“

بے شبہ وہ تمام حالات کتب اسلاف میں محفوظ ہو گئے ہیں جن کا کسی بھی نسخے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے کوئی بھی تعلق تھا۔ ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ محدثین اور اہل الحدیث نے جس لگن اور قلبی تعلق کے ساتھ اس فن کو لائق اعتنا ٹھہرایا اور جس محنت سے اس علم کو معراج کمال تک پہنچایا اس میں کوئی دوسرا گروہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

### جرح و تعدیل کے چند ائمہ کرام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تو لاریب سب کے سب عدول و صدوق تھے ہی لیکن ان کے تلامذہ میں سے اور پھر ان کے تلامذہ کے تلامذہ میں سے بہت سے حضرات نمایاں ہو کر ابھرے جنھیں روایات کے بارے میں جرح و تعدیل کے بہت بڑے امام مانا جاتا ہے مثلاً بہ ترتیب زمانی ان میں سے بعض ائمہ کے اسماء گرامی یہ ہیں:

سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، شعبی، محمد بن سیرین، سلیمان اعمش، معمر، شعبہ، سفیان ثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد، امام مالک، عبد اللہ بن مبارک، بشر بن مفضل، وکیع بن جراح اور سفیان بن عیینہ۔ رحمہم اللہ اجمعین

### فن اسماء الرجال کی کتابیں، تیسری صدی ہجری کے آخر تک

فن اسماء الرجال اور اس سلسلے کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس



موضوع پر سب سے پہلے ابوسعید یحییٰ بن سعید بن فروخ نے کتاب لکھی، ان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی، لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔ ان کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد جستانی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

اسماء الرجال کے سلسلے میں جو کتابیں دست یاب ہیں، ان میں سب سے پہلے امام بخاری کی تالیفات پر نگاہ ڈالیے جن کے نام یہ ہیں: التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، الضعفاء الصغیر، کتاب الکئی۔ پھر مختلف حضرات نے ان کتابوں کے ذیل لکھے۔ خطیب بغدادی نے الموضح لادھام الجمع والتفریق کے نام سے تعقب لکھا۔ ابن ابی حاتم نے التاریخ پر استدراک سپرد قلم کیا بعض دیگر حضرات نے بھی یہ خدمت سرانجام دی۔

اس فن میں امام بخاری کے بعد امام مسلم نے کتاب الکئی اور کتاب المتفردات والوحدان تصنیف کیں۔ امام مسلم ہی کے زمانے میں احمد بن عبد اللہ عجمی نے کتاب الثقات قلم بند کی۔ امام نسائی نے کتاب الضعفاء والمتر وکین تالیف کی۔ یہ نہایت اختصار کے ساتھ ان چند مشہور کتابوں کا ذکر ہے جو تیسری صدی ہجری کے اوائل تک اسماء الرجال کے فن میں لکھی گئیں۔

### اس موضوع پر چوتھی صدی ہجری کی کتابیں

چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر محدثین میں سے جھنوں نے اسماء الرجال پر قابل قدر ذخیرہ چھوڑا، چار بزرگوں کے اسماء گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ ان میں ایک محمد بن احمد بن خمار الدولابی ہیں، جو ۳۱۰ھ میں فوت ہوئے اور کتاب الاسماء والکئی تصنیف کی۔ اس کتاب میں راویان حدیث کے ناموں اور کنیتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے ابن ابی حاتم ہیں جو الجرح والتعدیل کے مصنف شہیر ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب الکئی اور کتاب المراسیل ان کی تصانیف ہیں، جو اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔ تیسرے امام دارقطنی ہیں، جنہوں نے ۳۸۵ھ میں وفات پائی اور ضعیف راویوں کے حالات میں کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ اسی صدی کے چوتھے بزرگ ابو احمد عبد اللہ بن عدی ہیں، جن کا سال

وفات ۳۶۵ھ ہے۔ انھوں نے فن اسماء الرجال پر الکامل فی الجرح والتعديل کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کتاب کو الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتر وکین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کا نام الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمحدثین بھی لکھا ہے۔ متقدمین کے نزدیک یہ کتاب اپنے فن کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے جو سات جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

ابو احمد عبداللہ بن عدی کی ایک کتاب اسماء الصحابہ ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

### پانچویں صدی ہجری کی کتابیں

اسی فن میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز کے ایک مشہور محدث عبدالغنی مقدسی نے جن کا سن وفات ۴۰۹ھ ہے، الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کی تہذیب و تکمیل یوسف بن ذکی ہزلی نے تہذیب الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے کی۔ یہ کتاب بائیس جلدوں پر محیط ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ بارہ جلدوں میں ابو عبداللہ علاء الدین المغلطائی بن قلیج نے اکمال تہذیب الکمال کے نام سے اس کا تکمیلہ لکھا۔ پھر حافظ ذہبی نے اس کی تلخیص کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بزرگوں نے اس کی تلخیص کی اور بعض نے اس پر اضافے کیے۔

دیار اندلس کے معروف محدث ابن عبدالبر نے صحابہ کرام کے حالات میں ”الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب“ تالیف کی۔ ان کا پورا نام ابو عمرو جمال الدین یوسف بن عمر بن عبدالبر ہے۔ قرطبہ کے اس عالم کو ان کے حفظ و اتقان اور وسعت علم کی وجہ سے ”احفظ اہل المغرب“ کہا جاتا ہے۔ ان کا سال وفات ۴۶۳ھ ہے۔

### چھٹی صدی ہجری کے مصنفین اور تصنیفات

اس اہم موضوع کے چھٹی صدی ہجری کے مؤلفین میں سے امام ابن جوزی کی دو کتابیں لائق تذکرہ ہیں۔ ایک کتاب الضعفاء والمتر وکین اور دوسری اسماء الضعفاء والواضعین۔ ابن جوزی نے ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ امام ذہبی نے ابن جوزی کی کتاب

الضعفاء والمتردین کی تلخیص بھی کی اور اس کے دو ذیول بھی قلم بند کیے۔

### ساتویں صدی ہجری کی تصنیفات

ساتویں صدی ہجری میں جن ائمہ عظام نے اس بنیادی موضوع کو قابل توجہ ٹھہرایا، ان میں امام نووی کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا سال وفات ۶۷۶ھ ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک تہذیب الاسماء اور دوسری المہمات من رجال الحدیث۔

### آٹھویں صدی ہجری کی کتابیں

آٹھویں صدی ہجری کے جن اعاظم رجال نے فن رجال کو ہدف تحریر ٹھہرایا، ان میں بعض حضرات کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں ایک حافظ ذہبی ہیں، جن کا سن وفات ۷۴۸ھ ہے۔ ان کی اس موضوع سے متعلق کم سے کم چھ کتابوں کا پتا چلتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، المستبہ فی اسماء الرجال (اسے مشتبہ النسبہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے) المغنی، الکاشف، میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔

دوسرے مشہور مفسر و محدث حافظ ابن کثیر ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر ہے۔ انھوں نے ۷۴۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ امام ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں۔ فن اسماء الرجال میں تکمیل معرفۃ الشقاۃ والضعفاء والمجاہل ان کی تصنیف ہے۔

### نویں صدی ہجری کا کام

نویں صدی ہجری میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا۔ اس عہد کے ایک مشہور ماہر فن رجال ابن مزی تھے۔ ان کا پورا نام ناصر بن احمد بن یوسف فرازی مسکری ہے۔ انھوں نے ۸۰۳ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس عالم حدیث نے تاریخ روایات حدیث کے بارے میں ایک بہت ضخیم کتاب تصنیف کی تھی، جو سوا جزا کا احاطہ کیے ہوئے تھی، لیکن انھوں نے یہ کتاب دست بردار مانہ کی نذر ہو گئی۔

اس دور کے مشاہیر مصنفین میں سے ایک حافظ ابن حجر ہیں، جن کا سال ارتحال

۸۵۲ھ ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑا کام کیا اور اس سے متعلق قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تہذیب الصحابہ، تہذیب العزیز، تقریب العزیز، لسان المیزان وغیرہ لائق تذکرہ ہیں۔

### دسویں صدی ہجری کی تصنیفات

پھر دسویں صدی ہجری کے بالکل آغاز میں سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے زوائد الرجال علی تہذیب الکمال کے نام سے اس موضوع پر کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس باب میں تحقیق و تفحص کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جو پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا۔ حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے بھی اس مسئلے کو زیر بحث ٹھہرایا اور کتابیں لکھیں۔

### صحاح کے راویوں کے نام اور کنیت وغیرہ کے سلسلے میں

بعض حضرات نے صرف صحاح کے راویوں کے بارے میں کتابیں لکھیں، بعض نے فقط صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے روایات پر کتابیں تصنیف کیں۔ بعض نے المؤتلف والمختلف وغیرہ نام کی کتابوں میں راویوں کے آپس میں ملتے جلتے ناموں میں التباس و اشتباہ کو رفع کرنے کی طرف عنان توجہ ملتفت کی اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ یعنی ایسے روایات کا ذکر کیا جو اپنے نام، کنیت، لقب وغیرہ میں سے کسی ایک کے ساتھ مشہور ہیں، لیکن سلسلہ سند میں ان کا وہ مشہور نام یا لقب یا کنیت وغیرہ نہیں آیا بلکہ غیر مشہور نام یا لقب آ گیا ہے۔ ان کتابوں میں اصل حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔

بہر تنسی و حدیث کے موضوع پر بھی کتابیں تصنیف کی گئیں، یعنی کسی شخص نے کسی وقت کوئی روایت بیان کی لیکن بعد میں اس کو یہ روایت بتائی گئی تو وہ بھول چکا تھا۔ ایسا بھی ہے کہ کچھ راویوں یا ان کے آباء و اجداد کے نام یا کنیتیں یا القاب یا نسبتیں باہم ملتی جلتی ہیں۔ اس سے التباس اور اشتباہ پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے بھی محدثین نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔

## آخری دور کی خدمات

فن اسماء الرجال پر تحقیق کا یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں بلکہ دسویں صدی ہجری تک چلا۔ اس عرصے میں حدیث اور رجال حدیث پر بے پناہ کام ہوا اور مختلف محدثین نے اس میں عمریں صرف کر دیں۔ آخری دور یعنی نویں صدی ہجری میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس موضوع سے متعلق بہت کام کیا۔ اسی اثنا میں ابن مزیٰ، حافظ سخاوی اور امام سیوطی نے اس فن کو مرکز تحقیق و تخصص ٹھہرایا اور واقعہ یہ ہے کہ انہی حضرات پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان کے بعد روایات حدیث پر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ کوئی شخص اس علم میں اب مزید اضافہ نہیں کر سکتا اور نئی معلومات سے اہل علم کو بہرہ ور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اب نہ وہ دور باقی رہا ہے اور نہ اس پر اضافہ ممکن ہے۔ اس موضوع پر استفادے کے لیے انہی اصحاب حدیث کی تصنیفات سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ان کتابوں میں روایات کے تراجم اور حالات اور ان کے ذہنی، علمی، فنی اور علمی کوائف کا پوری طرح استیعاب کیا گیا ہے۔

## طبقات سے متعلق کتابیں

فن اسماء الرجال نے یہاں تک وسعت اور تنوع اختیار کیا کہ اہل علم نے ہر فن اور ہر مسلک کے رجال پر طبقات کے عنوان سے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً طبقات القراء، طبقات الشعراء، طبقات المفسرین، طبقات الصوفیاء، طبقات الاولیاء، طبقات الحکماء، طبقات الادباء، طبقات الجناب، طبقات الشافعیہ، طبقات المالکیہ، طبقات الحنفیہ، طبقات الاطباء، طبقات اللغویین والنحاة، طبقات الخطاطین وغیرہ۔

## اہل الحدیث کی عظیم خدمت

بہر کیف حدیث کے ساتھ فن اسماء الرجال کا گہرا تعلق ہے اور اس پر اہل الحدیث اور محدثین عظام نے جو کام کیا، وہ عدیم المثال ہے۔ دنیا کی اور کسی قوم اور جماعت نے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے حالات اس محنت اور جاں فشانی سے جمع نہیں کیے، جس طرح

کہ محدثین نے کیے۔ انھوں نے اپنے اسلاف اور اکابر کے متعلق تمام امور کو مصرح کر دیا ہے اور کھرے کھوٹے کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ جس پر فخر کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھان بین اور نقد و تفحص کے سلسلے میں خالص علمی اور تحقیقی انداز کی طرح ڈالی، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

محدثین کی ان مساعی جیلہ کے متعلق مشہور مستشرق گولڈزہیر اپنے انتہائی تعصب کے باوجود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اہل الحدیث کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طلب حدیث کے جذبے کے تحت شرق و غرب کا سفر اختیار کیا، اس میں کسی مبالغہ آرائی کا دخل نہیں۔



## سترہواں باب

### اصحاب حدیث اور فقہات

بعض حضرات نے اصحاب حدیث اور محدثین پر تنقید کو اپنے آپ پر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ ان کا ارشاد گرامی ہے کہ محدثین صرف الفاظ حدیث کے ناقل تھے الفاظ کی سطح سے باہر نکل کر معنی حدیث کی تہہ تک پہنچنا اور اس میں سے فقہات کے چھپے ہوئے جوہر تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی حیثیت عطار کی سی تھی جس کا کام محض دوائیں جمع کرنا اور فروخت کرنا ہے۔ فقہاء کی مثال ان کے نزدیک ماشاء اللہ طیب کی سی ہے جو مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتے، اس کی بیماری کی تشخیص کرتے اور نہایت محنت اور انتہائی مناسب طریقے سے کُز، قدوری اور پکی روٹی وغیرہ کتابوں سے شفا بخشنے والے نسخے نکال کر مریض کے علاج کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس قسم کے کُتر رس اور عاقل و فہیم اطباء و حکما حضرات کی خدمت میں ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی چند عبارتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان حضرات کی تسلی تو بے شک نہیں ہوگی، جنہوں نے محدثین کے بارے میں ایک نظریہ قائم کر رکھا ہے، لیکن جن کے دل صاف ہیں، امید ہے ان پر بات واضح ہو جائے گی۔ ہمارا کام نہ کسی سے لڑنا جھگڑنا ہے، نہ کسی کو نشانہ طعن یا ہدف تنقید بنانا ہے، ہمارا کام صرف صحیح صورت حال بیان کرنا ہے۔ کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں مانتا اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

حضرت شاہ صاحب محدثین و فقہاء کی فقہات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفی شرح موطا میں لکھتے ہیں۔

بایدانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ بردو وچ بودند۔ کچھ آپ کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع می کردند و ازاں جا استنباط می نمودند و ایں

اصل راہ محدثین است۔۔۔ دیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح و تہذیب  
 آں گروہ کردہ اند یا دی گیرند بے ملاحظہ ماخذ آ نہا۔ پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد  
 جواب آں از ہماں قواعد طلب می کردند و ایں طریقہ اصل راہ فقہا است۔<sup>(۱)</sup>  
 (یہ جان لینا چاہیے کہ سلف امت میں مسائل و فتویٰ کے استخراج و استنباط  
 کے بارے میں دو طریقے رائج تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث  
 اور آثار صحابہ جمع کرتے اور انھیں بنیاد قرار دے کر ان کی روشنی میں پیش  
 آئند مسائل کو زیر غور لاتے تھے۔ یہ محدثین کا طریق ہے۔ دوسرا طریقہ یہ  
 مروج تھا کہ مسائل کے سلسلے میں جو قواعد کلیہ ائمہ نے واضح اور منہج کر دیے  
 ہیں انہی کو اصل ٹھہرایا جائے اور انہی کی روشنی میں مسائل و فتاویٰ پر عمل کیا  
 جائے۔ اصل ماخذ (قرآن و حدیث اور آثار صحابہ) کو تلاش کرنے کی  
 ضرورت نہیں۔ یہ فقہا کا طریقہ ہے۔)

یعنی جو ائمہ نے فرمادیا وہ صحیح ہے اس لیے کہ انھیں تمام مسائل کا علم تھا۔ ان سے  
 زیادہ نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ جاننے کی ضرورت ہے۔  
 حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

كان عندهم انه اذا وجد في المسئلة قرآن ناطق فلا يجوز  
 التحول منه الى غيره واذا كان القرآن محتملاً لوجوه فالسنة  
 قاضية عليه فاذا لم يجدوا في كتاب الله اخذوا سنة رسول الله  
 صلى الله عليه وسلم سواء كان مستفيضاً دائر اربابين الفقهاء او  
 يكون مختصاً باهل بلد او اهل بيت او بطريق خاصة سواء عمل  
 به الصحابة او الفقهاء اولم يعملوا به ومتى كان في المسئلة  
 حديث فلا يتبع فيها خلاف اثر من الآثار ولا اجتهاد احد من  
 المجتهدين ، واذا فرغوا جهدهم في تتبع الاحاديث ولم يجدوا



فی المسئلة حديثاً اخذوا باقوال جماعة من الصحابة والتابعين ولا يتقيدون بقوم دون قوم ولا بلد دون بلد كما كان يفعل من قبلهم، فان اتفق جمهور الخلفاء والفقهاء على شئ فهو المقنع، وان اختلفوا اخذوا بحديث اعلمهم علماً وأورعهم ورعاً واكثرهم ضبطاً او ما اشتهر عنهم فان وجدوا شيئاً يستوى فيه قولان فهي مسئلة ذات قولين، فان عجزوا عن ذلك ايضاً تاملوا في عمومات الكتاب والسنة وايماء اتهماء. واقتضاء اتهماء وحملوا نظير المسئلة عليها في الجواب. (۱)

(یعنی محدثین کا قاعدہ یہ تھا کہ جب وہ کسی مسئلے میں قرآن کو ناطق پاتے تو پھر کسی دوسری طرف عنان توجہ مبذول نہ کرتے، قرآن کے حکم پر عمل فرماتے اور اگر قرآن کا مسئلہ متعدد معانی کا محتمل ہوتا تو پھر حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فیصلہ لیتے۔ خواہ وہ حدیث فقہاء میں مشہور ہوتی، خواہ کسی شہر یا لوگوں سے مخصوص ہوتی یا کسی صحابی یا تابعین کے نزدیک معمول بہا ہوتی یا نہ ہوتی۔ جب کسی مسئلے سے متعلق انھیں حدیث دست یاب ہو جاتی تو پھر اس اثر صحابی اور مجتہد کے اجتہاد پر عمل نہ کرتے جو حدیث کے خلاف ہوتا۔ لیکن جب بے حد تلاش و سعی کے باوجود کسی پیش آمدہ معاملے میں حدیث نہ پاتے تو جماعت صحابہ و تابعین کے اقوال پر عمل کرتے، یہ خیال کیے بغیر کہ وہ صحابہ و تابعین کس قبیلے یا شہر یا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح عمل کرتے جس طرح کہ ان سے پہلے لوگوں کا طریق عمل تھا۔ جس مسئلے پر اکثر خلفاء و فقہاء کا اتفاق ہوتا، اسے لائق اعتماد قرار دیتے۔ اگر ایسا مسئلہ نہ ملتا جس پر خلفاء و فقہاء متفق ہوتے تو پھر کتاب و سنت کے عمومات و مقتضیات کو زیر غور ٹھہراتے۔ پھر جو بات نص کے نقطہ نظر سے سمجھ

میں آتی 'اس کی نظیر کو اس پر محمول کرتے۔)

معلوم نہیں بعض لوگوں کو محدثین سے اتنی چڑکیوں ہے۔ انھوں نے تدوین حدیث کے اہم مرحلے طے کیے اور احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ اہل علم کے لیے جمع کیا، لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کے باوجود بعض لوگوں کے نزدیک یہ معتبور رہے اور انھیں ”فقہ“ نہ مانا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد اسماعیل سلفی فرماتے ہیں۔

”صحیح بخاری، نسائی، ترمذی، موطا، ابن ماجہ وغیرہ کے مصنفین نے تبویب کی ہے، احادیث سے مسائل استنباط فرمائے ہیں، جن سے انسان میں قوتِ استنباط پیدا ہوتی ہے۔ مذاہب اربعہ کی کتب فقہ تو مسائل کی نقل ہے۔ ان کتابوں سے استنباط کا ملکہ مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ضخیم کتابوں کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ فقہ نہیں۔ ان کا کام الفاظ حدیث کا حفظ تھا۔۔۔ ایک پڑھا لکھا شخص جو حدیث کی کتابوں پر سرسری نظر بھی رکھتا ہو، یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ائمہ حدیث غیر فقہ تھے۔

”امام بخاری کی تبویب نے بڑے بڑے ارباب فقہ و بصیرت کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ باقی محدثین ابوداؤد، نسائی، ترمذی، موطا، ابن ماجہ کی تبویب نے ان کے تفقہ اور فقہی بصیرت کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں تک احادیث سے مسائل کے استخراج اور فہم کا تعلق ہے، ائمہ حدیث کی تبویب میں صحیح اور معیاری فقہ پائی جاتی ہے۔

”اگر فقہ فرضی صورتوں کا نام ہے اور اس سے غیر موجود بلکہ ناممکن الوقوع معاملات اور احکام کا تعلق ہے تو واقعی اہل حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث میں اس کا ثبوت نہیں ملے گا۔ یہ خوبی فقہ العراق میں ہوگی۔ لیکن یہ دراصل فقہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ائمہ حدیث کا مقام معطل فقہاء سے کہیں بلند ہے۔“ (۱)

محدثین پر تنقید کرنے سے معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ ان کے

۱۔ تحریک آزادی گجرات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تہذیبی مساعی میں ۹۸۶ء۔

نزدیک ائمہ حدیث فقیہ نہیں ہیں۔ ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، صرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مرتبہ فقہت کے بارے میں چند اہل علم کی آرا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ما اخرجت خراسان مثل محمد بن اسماعیل فقیہا انه فقیہ هذه الامة .  
(خراسان میں امام محمد بن اسماعیل جیسا کوئی فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ بلاشبہ وہ اس امت کے فقیہ تھے)

فتح الباری کے مقدمے میں امام بخاری کے بارے میں امام دارمی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔  
قد رايت العلماء بالحرمين والحجاز والشام والعراق فما رأيت  
فيهم اجمع من محمد بن اسماعيل هو اعلمنا وافقهنا واكثرنا  
طلباً.

(میں نے حریم، حجاز، شام اور عراق کے اصحاب علم کو دیکھا ہے۔ ان میں سے کسی کو امام محمد بن اسماعیل بخاری جیسی جامع شخصیت نہیں پایا۔ وہ ہم سب سے زیادہ عالم، سب سے بڑے فقیہ اور علم کے طالب ہیں۔)  
امام صاحب کے بارے میں اہل علم کا یہ مشہور مقولہ ہے۔

فقه البخاری فی تراجمہ۔

یعنی امام بخاری کی فقہت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو تراجم بخاری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حدیث کے ایک ایک باب سے وہ متعدد مسائل مستنبط کرتے ہیں۔  
مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی فرماتے ہیں۔

فقد وجد بعد علم ايضاً ارباب الاجتهاد المستقل كابى  
ثورالبغدادى وداؤد الظاهرى ومحمد بن اسماعيل البخارى  
وغيرهم على مالا يخفى على من طالع كتب الطبقات.<sup>(۱)</sup>  
(جو حضرات کتب طبقات کے مطالعہ سے شغف رکھتے ہیں، ان پر مخفی نہیں کہ

ائمہ اربعہ کے بعد بہت سے اصحاب علم مستقل ارباب اجتہاد ہوئے ہیں جیسے  
امام ثور بغدادی، امام داؤد ظاہری اور امام محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ  
فیض الباری میں مولانا انور شاہ کا شمیری کا فرمان ہے۔

ولكن الحق ان البخاري مجتهد. (بے شک امام بخاری مجتہد ہیں)  
اگر فقہ کی چند درسی کتابیں پڑھنے اور ناممکن الوقوع مسائل کی گردان کرنے کا نام فقہ  
ہے تو محدثین نے واقعی وہ کتابیں کسی مسجد کے مدرس سے نہیں پڑھی تھیں۔ نہ انھوں نے  
کسی فقیہ نام دار سے قدوری کا درس لیا تھا اور نہ شرح وقایہ یا ہدایہ کے لیے کسی عالی قدر  
استاد کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا تھا نہ فقہ کی وہ ضخیم کتاب پڑھی تھی جو ہندوستان میں  
اورنگ زیب عالم گیر نے علمائے کرام کی ایک بہت بڑی جماعت سے مرتب کرائی تھی جسے  
فتاویٰ عالمگیری یا فتاویٰ ہندیہ کہا جاتا ہے۔ نہ اصول فقہ کی اصول شاشی یا ملا جیون  
ایٹھوی کی نور الانوار تک محدثین میں سے کسی کی رسائی ہو سکی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جس انداز سے اہل حدیث اور اہل رائے کے  
متعلق اظہار رائے فرمایا ہے اس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کے نزدیک  
محدثین کی فقہات احادیث و آثار صحابہ پر مبنی تھی اور وہ اسی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اب اس  
باب میں عمرانیات کے ماہر اور فلسفہ تاریخ کے بانی علامہ ابن خلدون کا نقطہ نظر بھی ملاحظہ  
فرمائیے۔ وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں۔

انقسم الفقہ منہم الی طریقین طریقة اہل الراى والقیاس وہم  
اہل العراق وطریقة اہل الحدیث وہم اہل الحجاز، وكان  
الحدیث قلیلاً فی اہل العراق لما قدمناہ، فاستکثروا من القیاس  
ومہروا فیہ فلذلک قیل لہم اہل الراى ومقدم جماعتہم الذی  
استقر المذہب فیہ وفی اصحابہ ابو حنیفہ وامام اہل الحجاز  
مالک ابن انس والشافعی من بعد.

(یعنی دو گزشتہ کے لوگوں میں فقہ کے دو طریقے رائج ہو گئے تھے۔ ایک

طریقہ اہل راے کا تھا، وہ عراق والوں کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ اہل حدیث کا تھا، وہ حجاز والوں کا طریقہ ہے۔ عراق والوں میں حدیث کا علم کم تھا، اس لیے انھوں نے زیادہ تر قیاس سے کام لیا اور قیاس ہی میں انھوں نے مہارت پیدا کی، اسی بنا پر انھیں اہل راے کہا گیا۔ اس جماعت کے سربراہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور حجاز والوں کے سربراہ امام مالک بن انس اور ان کے بعد امام شافعی کو ان کی سربراہی کا اعزاز حاصل ہوا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔)

اہل حدیث کے نزدیک یہ تمام حضرات لائق تکریم ہیں اور وہ ان سب سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مسئلے سے متعلق ان سے پوچھا جائے گا تو ان کا جواب وہی ہوگا جو قرآن و حدیث سے ہم آہنگ ہوگا، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

وكان ابن عباس اذا سئل عن الامر فان كان في القرآن خبر به وان لم يكن في القرآن وكان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خبر به، وان لم يكن فعن ابي بكر وعمر فان لم يكن قال فيه براه. (۱)

(یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر وہ قرآن مجید میں ہوتا تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ اگر قرآن مجید میں نہ ہوتا تو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع فرماتے اور اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ اگر حدیث میں بھی نہ ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق جواب دیتے۔ اگر وہاں بھی نہ پاتے تو اپنی راے سے جواب دیتے۔)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جواب مسئلہ میں پہلے قرآن، پھر حدیث اور پھر صحابہ کرام کے قول و عمل کو دیکھنا چاہیے۔۔۔۔ اور اہل حدیث کا یہی نقطہ نظر اور یہی طریق عمل ہے۔ لیکن ہمارے ان معزز دوستوں کا جو مقلد کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، طریقہ یہ ہے کہ فقہ کی وہ کتابیں دیکھو اور انہی سے استفادہ کرو، جو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کئی سو سال بعد لکھی گئیں۔

### اٹھارھواں باب

## کیا ائمہ اربعہ اہل حدیث نہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ربیع الاول ۱۱ ہجری میں ہوا، اس طرح ۱۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک ختم ہو گیا۔۔۔ پھر صحابہ کا زمانہ ۱۱۰ ہجری (یعنی ننانوے برس) تک چلا۔ آخری صحابی حضرت ابو طفیل نے ۱۱۰ ہجری میں وفات پائی۔۔۔ تابعین کا زمانہ ۱۸۰ ہجری تک چلتا ہے اور تبع تابعین کا ۲۲۰ ہجری تک۔۔۔!

یہ قرون ثلاثہ ہیں، جنہیں قرونِ خیال کہا جاتا ہے۔ ائمہ اربعہ کا زمانہ بھی یہی ہے، جن کی اب تقلید کی جاتی ہے۔ صرف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیس برس اس مدت سے زائد ہیں۔ ائمہ اربعہ کے زمانے کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ہجری میں بغداد میں ان کا انتقال ہوا۔

۲۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۹۳ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور ۱۷۹ ہجری میں مدینہ منورہ ہی میں انھوں نے جنت الفردوس کا عزم کیا۔

۳۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۵۰ ہجری میں علاقہ عسقلان کے ایک مقام غزہ میں ہوئی اور ۲۰۴ ہجری میں قاہرہ (مصر) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۴۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں ۱۶۴ ہجری کو پیدا ہوئے اور ۲۴۱ ہجری کو بغداد ہی میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔

ان سے قبل یا ان کے زمانے میں یا ان کے بعد چوتھی صدی ہجری تک کسی امام کی کسی نے تقلید نہیں کی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان الناس كانوا قبل المائة الرابعة غير مجمعين على التقليد

الخالص لمنہب واحد بعینہ۔<sup>(۱)</sup>

(یاد رکھو کہ لوگ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کسی ایک معین مذہب کی تقلید پر جمع نہ تھے۔)

ائمہ اربعہ تقلید کے مخالف تھے اور وہ لوگوں کو سختی کے ساتھ تقلید سے منع فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے۔

اذا صح الحدیث فهو مذہبی۔<sup>(۲)</sup>

(جب کسی مسئلے میں صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔)

نیز حضرت امام نے فرمایا:

لا یحل لاحد ان یأخذ بقولنا ما لم یعلم من این اخذنا۔<sup>(۳)</sup>

(کسی شخص کے لیے اس وقت تک ہماری بات پر عمل کرنا جائز نہیں جب تک

اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے وہ بات کہاں سے لی ہے۔)

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ سے اس طرح کے متعدد اقوال منقول ہیں۔

اب آئیے حدیث وقفہ کے دوسرے جلیل القدر رکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف وہ بھی واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

انما انا بشر اخطئی واصیب ، فانظروا فی رأی فکلما وافق

الکتاب والسنة فخذوه وکلما لم یوافق الکتاب والسنة فاتركوه۔

(میں بھی انسان ہوں، کبھی اجتہاد میں غلطی کر جاتا ہوں اور کبھی مسئلے کی صحت

تک پہنچ جاتا ہوں، اس لیے تم میری بات کے متعلق غور کرو، جو قرآن و حدیث

کے مطابق ہو، اسے قبول کرو اور جو قرآن و حدیث کے مطابق نہ ہو، اسے

ترک کر دو۔)

تیسرے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

۲۔ فتاویٰ شامی جلد ۲ صفحہ ۳۶۔

۱۔ حجة الله بالآلة جلد اول صفحہ ۱۵۲۔

۳۔ البحر الرائق جلد ۲ صفحہ ۲۹۳۔

اذا صح الحديث فهو مذهبي. (۱)

(جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے)

ایک موقع پر حضرت امام نے فرمایا:

كل مسئلة صح فيها الخبر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

بخلاف ماقلت فان اراجع في حياتي وبعد موتي. (۲)

(ہر وہ مسئلہ جس کے بارے میں میری رائے صحیح حدیث کے خلاف ثابت ہو

جائے تو میں اپنی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی اس حدیث کی طرف

رجوع کرتا ہوں۔)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ چوتھے امام فقہ ہیں ان کا ارشاد ہے۔

لا تقلدني ولا تقلدنا مالكا والا وزاعى ولا النخعي ولا غيرهم

فخذوا احكام من حيث اخذوا من الكتاب والسنة. (۳)

(تم نہ میری بات بلا دلیل مانو اور نہ مالک، اوزاعی اور نخعی وغیرہ کی بات پر یہ

صورت تقلید عمل کرو بلکہ احکام دین وہیں سے لو جہاں سے خود انھوں نے

لیے ہیں، یعنی قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرو۔)

یہ ان ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے ارشادات گرامی ہیں جن کی اب تقلید کی جاتی ہے۔ ان

ارشادات میں صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ احکام شرعی اور اصول دین میں قائل عمل

قرآن و حدیث ہیں، فہم مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ ائمہ اربعہ اہل حدیث تھے وہ عامل بالمحدیث اور حاملین حدیث تھے۔ وہ لوگوں کو بار بار

تاکید کرتے اور صریح الفاظ میں حکم دیتے ہیں کہ مسائل و احکام میں ہماری رائے کے

بجائے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرو اور اسی کو مدد عمل ٹھہراؤ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔ ۲۔ اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۲۶۴۔

۳۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔



واجعل الكتاب والسنة امامك وانظر فيهما بتامل وتدبر  
واعمل بهما ولا تغتر بالقال والقليل والهوس.<sup>(۱)</sup>  
(صرف کتاب و سنت کو پیش نگاہ رکھو، انہی دونوں کو ہدف غور و فکر ٹھہراؤ، پھر  
انہی دونوں کو مدارِ عمل قرار دو، کسی کی ادھر ادھر کی باتوں اور خواہشوں کے  
دھوکے میں نہ آؤ۔)

اہل حدیث کا یہی نقطہ نظر ہے، یہی ان کی تبلیغ اور یہی ان کی تلقین ہے کہ کتاب و سنت  
کو مرکز التفات ٹھہرایا جائے اور اسی کی بنیاد پر عمل کی دیواریں استوار کی جائیں۔  
ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے ان ارشادات کی روشنی میں بتایا جائے کیا وہ اہل حدیث نہیں؟  
یقیناً وہ اہل حدیث ہیں جو لوگوں کو واضح الفاظ میں سختی کے ساتھ کتاب و سنت پر عمل  
کرنے اور سائل رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔



برصغیر میں اہل حدیث کی آمد

## انیسواں باب

### چند فرقے

کتاب کے مختلف مقامات پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اہل حدیث، اسلام کا کوئی فرقہ نہیں، عین اسلام ہے اور اسلام کے احکام و اوامر کی صحیح صحیح ترجمانی ہے، اس کی اصلی اور بنیادی تعبیر ہے۔ اس کا کسی فرقے اور کسی امام فقہ کی تقلید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تقلید سے ذہنوں میں جمود کے آثار ابھرتے اور غور و فکر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور اجتہاد کے کواڑوں پر قفل چڑھا دیا جاتا ہے۔

اہل حدیث کا تعلق براہ راست کتاب و سنت سے ہے، ان کے نزدیک وہی شے لائق عمل اور وہی بات شائستہ التفات ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ اور ارشادات خداوندی اور فرامین پیغمبر سے ہم آہنگ ہے۔

مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے اور وہ تمام فرقے اپنے بانی کی طرف منسوب ہیں اور ان سب میں کوئی نہ کوئی شخصیت جلوہ گر ہے۔ لیکن اہل حدیث میں یہ بات کہیں دکھائی نہیں دیتی، ان کا انتساب سیدھا حدیث رسول اور احکام خاتم النبیین کی طرف ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

عہد اسلام میں جن فرقوں نے جنم لیا اور جس انداز اور جس پس منظر میں لیا اور جس شخص کی وجہ سے لیا، اس کی تفصیل اس موضوع کی مختلف کتابوں میں مرقوم ہے۔ ان کتابوں میں ابو الحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین اور شہرستانی کی الملل والنحل وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔ اس موقع پر تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل طور پر چند فرقوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ عہد اسلامی میں جو پہلا فرقہ پیدا ہوا، وہ ”سبائی فرقہ“ تھا۔ اس کے عالم وجود

میں آنے کا پس منظر یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دور میں ایک یہودی عبداللہ بن سبائے ظاہری طور سے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نظام خلافت کو ہدف تنقید ٹھہرانا شروع کیا۔ اس مسئلے کو اس نے اس قدر اچھالا کہ باغیوں کی ایک مستقل جماعت منظم ہو گئی اور پھر ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو ان لوگوں کے بلوے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر لیا گیا۔ اس زمانے میں علاقہ شام کے والی (گورنر) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہاں کے لوگوں اور حضرت عثمان کے حامیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لیا جائے۔ حضرت علی نے فرمایا چند روز صبر کرو میں ضرور بدلہ لوں گا۔ لیکن معاملہ آگے بڑھا تو اہل شام اور حامیان عثمان نے حضرت علی کے مقابلے میں حضرت معاویہ کو خلیفہ مقرر کر لیا۔ اب سبائیوں نے حضرت علی کا ساتھ دیا اور پھر صفین کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی۔

اسی دوران حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان طے پایا کہ دونوں طرف سے دو منصف مقرر کر لیے جائیں، وہ جو فیصلہ کریں، اسے مان لیا جائے۔ چنانچہ حضرت علی کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اور حضرت معاویہ کی طرف سے حضرت عمرو بن عاص کو منصف مقرر کیا گیا، اسلامی تاریخ میں ان دونوں منصفوں کے تقرر کو ”تجسیم“ کہا جاتا ہے۔ سبائی فرقے کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا کیا جائے، وہ صلح بالکل نہیں چاہتے تھے۔ اب انھوں نے اعلان کیا کہ (العیاذ باللہ) حضرت علی نے اللہ کی نافرمانی کی ہے اور انھوں نے اللہ کے مقابلے میں ایک انسان کو منصف مقرر کر لیا ہے جو شرک ہے، قرآن کا فرمان ہے:

أَفْعِزَّ اللَّهُ أَبْتِغَىٰ حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا...

(الانعام: ۱۱۴)

(کیا میں غیر اللہ کو حکم مانوں حالانکہ اس نے یہ واضح کتاب تم پر اتاری)

(ہے۔)

انھوں نے مسلمانوں میں فساد کی حدود کو وسعت دینے کی غرض سے حضرت علی کے موقف کو شرک سے تعبیر کیا اور اعلان کیا کہ مشرک کی اطاعت جائز نہیں۔ چنانچہ وہ حضرت علی کے حلقہ اطاعت سے خارج ہو گئے۔ پھر وہ اس معاملے میں یہاں تک آگے بڑھے کہ ہر کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیا اور کہا کہ کبائر کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

۲۔ یہ لوگ جو تحکیم کے مسئلے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہو گئے تھے خارجی کہلائے۔ اب تک اس فرقے کو خارجی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۳۔ ان کے مقابلے میں ایک گروہ کو شیعہ کہا جانے لگا، یعنی ”ھیعیان علی“، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور ان کی رفاقت اختیار کیے رکھی۔

۴۔ عبدالملک بن مروان جو خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتا تھا، ۶۵ ہجری سے ۸۶ ہجری تک اکیس برس تخت خلافت پر متمکن رہا۔ اس کے زمانے میں بصرہ کے ایک شخص معبد کا ظہور ہوا، وہ تقدیر کا منکر تھا۔ امام عبدالرحمن بن عمرو جو امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہیں، ملک شام کے معروف امام فقہ تھے اور تبع تابعی تھے، انھوں نے ۱۵۷ ہجری میں وفات پائی۔ ان کا فرمان ہے کہ معبد نے انکار تقدیر کا عقیدہ ایک نصرانی سے لیا تھا، جس کا نام سون تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن پھر اسلام ترک کر کے ارتداد کی راہ اختیار کر لی تھی۔۔۔ منکرین تقدیر کو ”قدریہ“ کہا جانے لگا اور انھوں نے ایک مستقل فرقے کے طور پر شہرت پائی۔

۵۔ ان فرقوں میں سے ایک ”فرقہ جمیہ“ ہے۔ یہ فرقہ کوفہ کے ایک شخص جم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔ جم بڑا سان اور فصیح البیان تھا، وہ ایک شخص جعد بن درہم کا شاگرد اور عقیدت مند تھا، جو صفات الہیہ کا منکر تھا اور اسے فتنہ پھیلانے کی وجہ سے شہر واسط میں قتل کر دیا گیا تھا۔ جم بن صفوان اس کے افکار کا زبردست مبلغ تھا، اسے ۱۲۸ ہجری میں حاکم خراسان نصر بن سیار کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

۶۔ ایک مشہور فرقے کو فرقہ معتزلہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ

حضرت حسن بصری (متوفی ۱۱۰ ہجری) سے ان کے حلقہ درس میں کسی نے سوال کیا کہ خوارج کبیرہ گناہ کو کفر قرار دیتے ہیں اور اس کا مرتکب ان کے نزدیک کافر ہے، لیکن مرجئہ کا کہنا ہے کہ مومن کو گناہ سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا، اس سلسلے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ امام حسن بصری اس سوال کا ابھی کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کہ ان کے ایک شاگرد واصل بن عطاء نے کہا کہ مرتکب کبیرہ کا حکم ان دونوں کے درمیان ہے، یعنی نہ وہ مومن ہے نہ کافر۔۔۔ واصل یہ الفاظ کہتا ہوا ایک ستون کی طرف چلا گیا اور ان سے الگ ہو گیا۔ اس پر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اعتزل عنا الواصل

(یعنی واصل ہم سے الگ ہو گیا۔)

اعتزال کے لفظی معنی الگ ہو جانے کے ہیں، اصطلاحی معنی ہیں اہل سنت کے عقائد سے انحراف کی راہ پر گامزن ہونا۔۔۔ تو جس شخص نے قولاً و عملاً عقیدہ اہل سنت سے انکار کیا وہ معتزلی کہلایا۔ گویا معتزلہ کا بانی واصل بن عطا ہوا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) کے زمانے میں ایک مشہور معتزلی عالم ابوہذیل تھا۔ مامون اس کے افکار و نظریات سے بے حد متاثر ہوا، اور مملکت اسلامی میں جبراً ان افکار و نظریات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، جس کی وجہ سے ائمہ اہل سنت کو شدید امتلا کے مراحل سے گزرنا پڑا۔

۷۔ تمام فرقوں کے بارے میں بہت سی تفصیلات پائی جاتی ہیں، جو ہم نے ترک کر دی ہیں ان میں ایک فرقہ مرجئہ ہے، اس کی بحث بھی بڑی طویل ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا کافی ہے کہ ارجا کے معنی تاخیر کرنا بھی ہے اور امید دلانا بھی۔ لہذا اس کا اطلاق مندرجہ ذیل امور پر ہوتا ہے۔

☆ عمل کو ایمان سے موخر کرنا

☆ مرتکب کبیرہ کے حکم کو قیامت پر موخر کرنا اور اس دنیا میں اس کے متعلق کوئی قطعی حکم نہ لگانا، یعنی یہ رائے نہ دینا کہ وہ اصحاب جنت میں سے ہے یا اصحاب جہنم میں

سے۔

☆ ایمان کی موجودگی میں گناہوں کا ضرر نہ پہنچانا اور فقط ایمان پر نجات کی امید رکھنا۔  
۸۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں ایک شخص ابو عبد اللہ محمد بن کرام بھستانی کا ظہور ہوا۔ اس شخص کو ابن کرام بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے صفات البہیہ کو اس انداز میں ثابت کرنے کی مہم کا آغاز کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مجسم بنا دیا گیا (معاذ اللہ) یعنی اس کے ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ تمام اعضا کو حقیقت کا درجہ دے دیا گیا۔ ان افکار کے حامی فرقے کا نام ”کرامیہ“ تھا جو اپنے بانی ابو عبد اللہ محمد بن کرام کی طرف منسوب ہوا۔

محمد بن کرام ملک شام میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس نے ۲۵۶ ہجری میں زعرہ کے مقام پر وفات پائی۔

۹۔ عباسیوں کا عہد حکومت تھا کہ ۲۶۱ ہجری میں ایک شخص حمدان بن اشعث نے سر نکالا۔ یہ شخص ”قرمط“ کے نام سے معروف تھا۔ اس نے ایک عجیب و غریب فرقہ پیدا کیا جسے اس کے بانی کے نام کی نسبت سے ”قرامطہ“ بھی کہا جاتا ہے اور اس کے باطنی مطالب و معانی کی بنا پر ”فرقہ باطنیہ“ سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس فرقے نے بے حد شہرت پائی، سیاسی اعتبار سے بھی اور مذہبی اعتبار سے بھی۔۔۔!

سیاسی اعتبار سے اس طرح کہ باشندگان جنابہ میں سے ایک شخص ابوسعید جنابی نے علاقہ بحرین کی زمام حکومت ہاتھ میں لی اور پھر اسے اس درجہ قوت حاصل ہوئی کہ عباسی خلفاء بھی اس سے خوف زدہ ہو گئے۔۔۔ اس کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی بڑی مضبوطی اور دھڑلے سے حکومت کی۔

مذہبی اعتبار سے یہ فرقہ بہت بڑے فتنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے ماننے والوں نے ارکان اسلام یعنی نماز روزہ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کا سلسلہ بالکل الٹ دیا اور جو چیزیں شریعت نے حلال یا حرام کی ہیں ان کی تمام حدود کو اپنی خواہشات کے قالب میں ڈھال لیا اور سب امتیازات ختم کر ڈالے۔ یہاں تک کہ ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی وغیرہ میں حلت و حرمت کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ یہ اسلام میں ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو رونما ہوا۔

انہوں نے ہر طرف کثیر تعداد میں اپنے مبلغین بھیج دیے تھے جو لوگوں کو خواہش پرستی اور مذہبی قیود سے آزادی کی تعلیم دیتے تھے۔

اس قسم کے ملحد فقیر اب بھی برصغیر کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں، جن کے دام ترویج میں بہت سے لوگ پھنس جاتے ہیں اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

ان فرقوں کے علاوہ اور بھی متعدد فرقے جبرئیہ و عیدئیہ، مجسمہ وغیرہ عالم وجود میں آئے۔ لیکن اصل اور قابل عمل دین وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لے کر آئے، جس پر صحابہ کرام نے عمل کیا، جس کی تابعین و تبع تابعین نے تبلیغ کی اور جس کی نشر و اشاعت کا فریضہ ائمہ حدیث و فقہ نے انجام دیا، بحمد اللہ اہل حدیث اسی پر عامل ہیں اور اسی کے احکام کی ترویج ان کا مقصد حیات اور اسی کے نفاذ کی کوشش ان کا اصول زیست ہے۔



بیسواں باب

## برصغیر میں اہل حدیث کی خدمات ایک نظر میں

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، برصغیر کے لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت (۱۵ ہجری) میں اسلام سے آشنا ہو گئے تھے اور اس کی تعلیمات کے بعض گوشے یہاں پہنچ گئے تھے۔ لیکن پوری قوت کے ساتھ اسلام محمد بن قاسم کے حملہ سندھ کے نتیجے میں ۹۳ ہجری میں یہاں آیا۔ اس وقت محمد بن قاسم کی عمر اٹھائیس برس تھی۔

وہ ۶۵ ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور ۸۳ ہجری میں ان کو فارس اور شیراز کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ ۹۲ ہجری میں وہ ستائیس برس کو پہنچے تو انھیں سندھ پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اپنے مسکن فارس سے روانہ ہو کر وہ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے حدود سندھ میں وارد ہوئے تو ان کا کاروان حیات اٹھائیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا اور ان کی فوج بیس ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ ۹۳ ہجری کا واقعہ ہے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف نے ملک شام کی جو تربیت یافتہ فوج انھیں دی تھی اس کے علاوہ کافی تعداد میں فوجی ان کے ساتھ تھے۔

وضم ستة آلاف من جند اهل الشام.

(فتوح البلدان - صفحہ ۴۲۴)

یعنی حجاج بن یوسف نے شام کے چھ ہزار فوجیوں کو محمد بن قاسم کی کمان میں روانہ کیا تھا، لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ان کے لشکر میں شامل تھے۔

چچ نامہ کی روایت کے مطابق وہ جس جس مقام پر رکتے اور پڑاؤ کرتے گئے، لوگ



ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ اس طرح اصل فوج کے علاوہ کئی ہزار رضا کاران کی رکاب میں تھے۔ جب حدودِ سندھ میں داخل ہوئے اس وقت وہ بیس ہزار سے زیادہ فوج کی کمان کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کی یہ بات بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ پر حملہ کیا تھا اور ان کے فوجیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ یہ محض افسانوی اور ناواقعاتی باتیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اتنے بڑے ملک پر اتنی قلیل تعداد کی فوج کے ساتھ ہرگز حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس فوج کو سترہ سال کا کم سن لڑکا سمندر پار سے لاکر حملہ کرنے نہ اسے عقل مانتی ہے اور نہ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

برصغیر میں اہل حدیث نے کیا خدمات سرانجام دیں ذیل کی سطور میں ان کی خدمات گوناگوں کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔ اگر قلم و قرطاس سے رابطہ رہا اور اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو ان شاء اللہ اہل حدیث کی مندرجہ ذیل خدمات تفصیل سے بیان کی جائیں گی۔

### ۱۔ تدریسی و تعلیمی خدمات

عرب مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فاتح کی حیثیت سے آنے کے بعد سب سے زیادہ زور وہاں کے باشندوں کی تعلیم پر دیا اور اس کے لیے مراکز تدریس قائم کیے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے پہلی وحی میں حصول علم ہی کا حکم دیا گیا تھا۔ ”الہند فی العہد الاسلامی“ کے صفحہ ۱۳۴ پر مرقوم ہے کہ:

”محمد بن قاسم نے دہلی فتح کرنے کے بعد وہاں ایک مسجد تعمیر کی جسے چار ہزار بچوں کی تعلیم کا مرکز کہا جاتا ہے اور وہ پنڈت جو اس سے قبل قیدیوں کی نگرانی کرتا تھا محمد بن قاسم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا اسے دہلی کا نائب مقرر کیا گیا۔ یہ پنڈت اس دور کا بہت بڑا عالم، مشہور ادیب اور عاقل و فہیم شخص تھا۔

فوج البلدان میں بتایا گیا ہے کہ محمد بن قاسم نے راجستھان کے علاقے نیرون اور اور فتح کیے اور پنجاب کے شہر ملتان پر قبضہ کیا تو وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ”دہلی کے قدیم

مدارس“ کے مصنف کے بیان کے مطابق یہی مسجدیں ہندوستان کے نو مسلموں کے اولیں تعلیمی مراکز تھے اور اس کے بعد صدیوں تک مسجدیں ہی مراکزِ تعلیم رہیں۔ اب بھی دینی تعلیم زیادہ تر مسجدوں میں دی جاتی ہے۔

سندھ میں منصورہ وغیرہ شہر آباد کیے گئے، تو ان میں بھی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ برصغیر میں یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا اور اسے شروع کرنے والے حاملینِ حدیث رسولؐ تھے اور یہ ان کی بہت بڑی بنیادی تدریسی خدمت تھی۔

اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ محمود غزنویؒ نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے ایک روایت کے مطابق گیارہ اور ایک روایت کی رو سے سترہ حملے کیے۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے لاہور پر حملہ کیا اور اس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ تذکرہ نگاروں نے اسے اپنے دور کا بہت بڑا عالم اور فقیہ قرار دیا ہے۔۔۔ وہ ۹۹۷ء میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ تریسٹھ سال عریا کر ۱۰۳۰ء میں فوت ہوا، اس نے ۳۴ برس حکومت کی۔ وہ ایک کشور کشا اور مدبر بادشاہ تھا۔ علامہ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں، عبد الجبار عتبی نے تاریخِ یمنی میں، ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں، ان اشیر نے تاریخ الکامل میں اور امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی نے ”مغیث المخلوق فی ترجیح القول الحق“ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

فرشتہ رقم طراز ہے کہ جب محمود غزنویؒ نے قنوج فتح کیا تو اس نے اس شہر میں ”مساجد و مدارس تعمیر کر دے“ یعنی مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے۔

افغانستان اور سرحد کے علمائے کرام اور اصحابِ تاریخ نے سلطان محمود غزنویؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مسلکِ اہل حدیث سے منسلک ہو گیا تھا۔

محمود غزنویؒ اور دیگر غزنوی حکمرانوں کے دور میں ملک کے دوسرے مقامات کی طرح لاہور کی علمی حالت بالکل بدل گئی تھی اور مختلف ملکوں کے بے شمار علما و فضلا یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ تاریخِ سلاطین آل غزنوی کا مصنف ہمیں بتاتا ہے۔

”جوق جوق تشنگانِ علوم از سائر بلادِ ہند و ولایت ہائے کاشغرو ماوراء النہرو

عراق و بخارا و سمرقند و خراسان و غزنی وغیرہ ذالک ازاں خیرات متفع می  
شدند چند انکہ یک آبادانی در حدود لاہور پیدا آمد۔“

یعنی دورِ غزنویہ میں بلادِ ہند، کاشغر، ماوراء النہر، عراق، بخارا، سمرقند، خراسان اور غزنی وغیرہ ممالک سے لوگوں کے گروہ کے گروہ لاہور آنے اور یہاں کے علم و فضل سے نفع اندوز ہونے لگے۔

محمود غزنوی کے سلسلے میں ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ برصغیر میں جہاں علما اہل حدیث نے مدارس قائم کرنے اور علوم کو پھیلانے کی کوشش کی وہاں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں اور ان کے وزرا و امرا نے بھی اس سلسلے میں بے حد خدمات سر انجام دیں۔ ان بادشاہوں میں محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق بھی شامل ہیں جو امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں سے متاثر تھے۔

قدیم علما برصغیر میں سے شیخ مسعود فرید الدین پاک پتن، شیخ نظام الدین اولیا، شیخ حسین بن احمد بخاری جہانیاں جہاں گشت اوج شریف، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے فرزندان گرامی، مرزا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی، میاں سید نذیر حسین دہلوی، امرتسر کے خاندان غزنویہ کے علما، کرام لکھوی خاندان کے علما، عالی قدر روپڑی اصحاب علم، حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے وغیرہ بے شمار علما اہل حدیث نے علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑھ چڑھ کر خدمات سر انجام دیں، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

یہ سلسلہ اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ موضوع بہت تفصیل طلب ہے۔ چند صفحات میں اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ اس موضوع کی کتاب میں بیان ہوگی۔

## ۲۔ تصنیفی و تالیفی خدمت

اب آئیے تصنیف و تالیف کی طرف۔ اس سلسلے میں علما اہل حدیث کے عمل و سعی کا

داس انتہائی وسیع ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفاسیر و تراجم کے باب میں بھی خوب کام کیا، کتب احادیث کے حواشی و شروح کو بھی لائق التفات ٹھہرایا، درسی کتابیں بھی تصنیف کیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا۔

قرآن مجید کے سلسلے میں تھا حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خان کی خدمات دس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ پورے برصغیر میں اس باب میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ وہ کثیر التصانیف عالم ہیں اور ان کی تصانیف نہایت اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں لکھا اور بہ درجہ غایت محققانہ انداز میں لکھا۔ نواب صاحب کے علاوہ برصغیر کے بہت سے علمائے کرام نے اپنے اپنے انداز میں قرآن مجید کی خدمت کی اور مختلف زبانوں میں کی۔ اس موضوع کی کتاب اس فقیر نے حروف تجلی کی ترتیب سے مکمل کر دی ہے، الحمد للہ علی ذالک۔

حدیث پاک کی شروح و حواشی کے باب میں نواب صدیق حسن خاں، حضرت مولانا بشم الحق ڈیوانوی، مولانا عبدالرحمن مبارک پوری، مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا محمد بن عبداللہ علوی، مولانا شرف الدین دہلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور دیگر حضرات کی خدمات کی جتنی بھی تحسین کی جائے بجا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے سلسلے میں اردو میں حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی عربی کتاب ”الرحیق المختوم“ نہایت اونچے درجے کی تصانیف ہیں۔ الرحیق المختوم کا اردو ترجمہ جو کئی سال پیشتر خود اس کے مصنف شہیر نے کیا تھا اور مکتبہ سلفیہ (لاہور) نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا، متعدد دفعہ چھپ چکا ہے اور اس ترجمے نے ہر حلقے میں بے حد مقبولیت حاصل کی ہے۔

مصری مصنف محمد حسین ہیکل کی سیرت کے متعلق کتاب ”سیرت محمد“ کا اردو ترجمہ جو مولانا ابوبکری امام خاں نوشہروی نے کیا، بہت مقبول ہوا، بہت چھپا اور بہت پڑھا گیا۔

رحمۃ للعالمین تو اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے اور بہ یک وقت متعدد ناشرین نے شائع کی ہے۔ اس کا عربی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ سب سے پہلے حضرت قاضی محمد سلیمان مرحوم کے فرزند گرامی قاضی عبدالعزیز مرحوم نے کیا تھا جو ”پاکستان ٹائمز“ میں چھپتا رہا ہے۔ اس پر نظر ثانی قاضی عبدالباقی صاحب نے کی جو قاضی محمد سلیمان کے پوتے اور قاضی عبدالعزیز کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان شاء اللہ یہ کتاب جلد چھپ جائے گی۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ رحمۃ للعالمین کا ترجمہ بنگلہ زبان میں بھی ہمارے محترم دوست ڈاکٹر مجیب الرحمن نے کر دیا ہے جو اس وقت امریکہ میں مقیم ہیں۔

پھر روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل کی کتب فتاویٰ کی شکل میں اہل حدیث علمائے عظام نے کتاب وسنت کی روشنی میں اور اقوال صحابہ و ائمہ دین کے حوالوں سے وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں علمائے غزنویہ کا فتاویٰ غزنویہ، حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی کا فتاویٰ نذیریہ، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کا فتاویٰ ثنائیہ، حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کا فتاویٰ اہل حدیث، حافظ عبدالستار دہلوی کا فتاویٰ ستاریہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ طویل عرصے سے ہفت روزہ ”الاعتصام“ میں مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی کے فتوے بالائتزام شائع ہو رہے ہیں جن سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی خدمت دین ہے جو اہل حدیث کی طرف سے کی جا رہی ہے۔

### ۳۔ شعری خدمات اسلام

شعر و نظم میں بھی اہل حدیث اصحاب علم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میدان میں انھوں نے علمی، تاریخی اور سیاسی اعتبار سے بہترین خدمات انجام دیں۔ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر پنجابی زبان میں نظم کی صرف و نحو کے قواعد فارسی زبان میں نظم کیے۔ فقہی اور اصلاحی مسائل سے متعلق انواع محمدی، احوال الآخرت، زینت الاسلام وغیرہ کتابیں پنجابی اشعار میں، حافظ محمد لکھوی کی تصانیف ہیں جو کسی زمانے میں پنجاب کے ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں، لاتعداد لوگ ان سے مستفید ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اردو نظم میں بے حد شہرت پائی اور چنستان، بہارستان وغیرہ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں سیاست، مذہب، تنقید، طنز، ردِ مرزائیت، تردید، بدعت، نعت اور حمد وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ سعودی حکومت کی تعریف و تعارف میں بھی انھوں نے بہت کچھ نظم کیا ہے۔

ہمارے محترم دوست علیم ناصری صاحب نے شاہ نامہ بالاکوٹ کے نام سے جماعت مجاہدین کی پوری تاریخ نظم کر دی ہے اور ان کے جہاد کے تمام واقعات شعری زبان میں عمدگی کے ساتھ تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ یہ ان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجاہدین کی ان سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے جو انھوں نے پنجاب کی سکھ شاہی اور برصغیر کی انگریزی حکومت کے خلاف انجام دیں۔ شاہنامہ بالاکوٹ میں تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی خوب جلوہ دکھا رہی ہے۔ حمد و نعت میں بھی علیم ناصری کا بلند پایہ شعری مجموعہ ”طلع البدر علینا“ قابل ذکر ہے۔

حمد و نعت اور اصلاحی کلام کے باب میں ہمارے مرحوم دوست راسخ عرفانی اور الاعتصام کے سابق ایڈیٹر قاری نعیم الحق نعیم بھی ایک خاص مقام پر فائز ہیں۔ اہل حدیث کی فارسی اور اردو شاعری میں ایک بہت بڑا نام حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا ہے اور عربی شاعری میں قاضی طلاپشاوری اور قاضی یوسف حسین خان پوری کا بھی ایک مقام ہے۔ اسی طرح پنجابی شاعری میں مولانا نور حسین گھر جاکھی، عبدالستار علی محمد مصصام، سعید الفت، عبدالکریم گرنٹھی وغیرہ حضرات نے بڑی مسلکی خدمت کی۔ ان کے علاوہ ابوالبلیان حماد، محمد سعید (وساوے والا) اور دیگر بہت سے ہندوستان اور پاکستان کے شعرا بہ صورت نظم اردو زبان و ادب اور دین کی خدمت کر رہے ہیں۔

#### ۴۔ مرزائیت کی تردید

مرزائیت کی تردید میں اہل حدیث علما نے بے حد خدمات سرانجام دیں۔ سب سے پہلے مرزا غلام قادیانی پر کفر کا فتویٰ حضرت مولانا محمد حسین بنالوئیؒ نے مرتب کیا اور اس پر

سب سے پہلے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلویؒ نے دستخط کیے اور مہر لگائی۔ پھر مولانا بنالویؒ نے ہندوستان کے علمائے کرام سے اس فتوے پر دستخط کرائے۔

۱۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو مرزا قادیانی سے مناظرے کے لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری قادیان گئے۔ ان کے علاوہ اس سے قبل کوئی عالم مرزا قادیانی سے مناظرے کے لیے قادیان نہیں گئے تھے۔ مرزا صاحب کو خود اپنے گھر قادیان میں مولانا امرتسری کے مقابلے میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے مولانا کو فاتح قادیان قرار دیا۔

مرزا قادیانی کی وفات بھی اس بددعا کے نتیجے میں ہوئی جس میں انھوں نے خود ہی ۱۵/۱۱ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار میں مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کے سلسلے میں لکھا تھا کہ ”جھوٹا سچے کی زندگی میں مرجائے“ چنانچہ اس سے تیرہ مہینے گیارہ دن بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا صاحب لاہور میں مر گئے اور مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس سے چالیس سال بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے اہل حدیث عالم مولانا محمد حنیف ندویؒ نے کیا۔ وہ ہفت روزہ ”الاعتصام“ کے ایڈیٹر تھے اور میں معاون مدبر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے پر مامور تھا۔ انھوں نے ”الاعتصام“ کے اجرا کے فوراً بعد ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں مرزائیت کے بارے میں مضامین لکھے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے، بلکہ خود مرزائیوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان کے آئین کی ترتیب کے وقت مرزائیوں کے مسئلے پر شدید الجھن پیدا ہوگی، انھیں چاہیے کہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انھیں اقلیت شمار کیا جائے۔ اس ضمن میں ”مرزائیت نئے زاویوں سے“ کے نام سے ۱۹۵۳ء کے شروع میں مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب بھی شائع ہوئی تھی جو چند روز میں ختم ہو گئی تھی۔ اب یہ کتاب طارق اکیڈمی فیصل آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس پر اس فقیر نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس مقدمے میں مرزائیت سے متعلق اختصار کے ساتھ اہل حدیث کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔

مرزائیت کے باب میں اہل حدیث کی اولیات ایک مستقل مضمون نہیں بلکہ مستقل کتاب کی متقاضی ہیں اور اس موضوع کی کتاب کی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے جو ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد بہاء الدین کی تصنیف ہے، اس کتاب میں مرزائیت کی تردید کے بارے میں اہل حدیث کی خدمات کو خوب صورت انداز اور حوالوں کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ آزادی وطن سے پہلے بھی اور آزادی وطن کے بعد بھی پاکستان میں مرزائیت کے خلاف جتنی تحریکیں اٹھی ہیں، ان میں اہل حدیث نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے علمائے کرام نے بھی عوام نے بھی۔۔۔! تصنیفات کی صورت میں، تقریروں اور مناظروں کی صورت میں، قید و بند اور گرفتاریوں کی صورت میں، یہ ہمیشہ آگے رہے۔ لیکن انھوں نے اپنی ان سرگرمیوں اور کوششوں کو اس انداز سے کتابی شکل میں لانے کی طرف توجہ نہیں کی، جس طرح دوسری جماعتوں کے لوگ کرتے ہیں۔ اب یہ خدمت ڈاکٹر محمد بہاء الدین سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ فقیر بھی تاریخ اہل حدیث کے سلسلے میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان شاء اللہ ہر اس چھوٹے بڑے کا ذکر کیا جائے گا جس نے اس اہم تحریک میں حصہ لیا اور جس انداز میں لیا۔

## ۵۔ صحافتی خدمات

صحافت کے میدان میں بھی اہل حدیث نے خوب کام کیا۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے۔ اب تک برصغیر کے مختلف مقامات سے اہل حدیث کے کم و بیش دو سو اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہو چکے ہیں جن میں سے بعض بند ہو گئے ہیں اور بعض کا سلسلہ اشاعت جاری ہے۔ جاری رسائل و جرائد میں سے پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث (کراچی) ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث (لاہور) ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) اور ہفت روزہ اہل حدیث (لاہور) نے اللہ کے فضل سے بڑی عمر پائی۔ دعا ہے ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ برکت پیدا فرمائے اور یہ اپنے مسلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں۔ جو اخبار کسی وجہ سے بند ہو گئے، ان میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے اخبار ”اہل حدیث“ نے



سینتالیس سال عمر پائی اور ملک و قوم اور ملک کی بے حد خدمت کی۔

## ۶۔ سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں

اب چند الفاظ اہل حدیث کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں!

اہل حدیث عوام و خواص نے برصغیر کی سیاست میں ہمیشہ پُر جوش انداز سے حصہ لیا۔ ۱۸۲۶ء میں تحریک مجاہدین نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف سلسلہ جہاد شروع کیا تو ابتدائی دور میں اس میں اکثریت اہل حدیث کی تھی۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں حضرت سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے بہت سے رفقاء کرام نے جام شہادت نوش کیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد اس جماعت کا انگریزی حکومت سے مقابلہ شروع ہوا تو یہ پوری جماعت اہل حدیث حضرات پر مشتمل تھی اور پھر ہمیشہ یہی حال رہا، یہ نہایت صبر آزما اور جرأت مندانہ اقدام تھا جو آزادی وطن یعنی ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ تحریک مجاہدین نے تقریباً ایک سو پچیس سال عمر پائی اور وہ پاک باز لوگ انگریزوں کے خلاف پوری قوت کے ساتھ پنجہ آزمایا ہے۔ اب بھی یہ سلسلہ غیر اسلامی طاقتوں کے خلاف کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں بھی اہل حدیث نے بے حد تگ و تاز کی اور ان کے بے شمار لوگ انگریزی حکومت کی مخالفت کے نتیجے میں شہید ہوئے۔ پھر ان پر وہابی مقدمات قائم ہوئے۔ یہ مقدمات عظیم آباد (پٹنہ) انبالہ راج محل، مالدہ وغیرہ میں قائم کیے گئے۔ ان مقدمات میں جن اہل حدیث علمائے کرام کو گرفتار کیا گیا تھا، ان میں سے بعض کو پھانسی کی سزائیں سنائی گئیں اور بعض کو عمر قید کر کے جزائر انڈمان یعنی کالے پانی بھیجا گیا اور بعض وہیں وفات پا گئے۔ ان کی جائیدادیں انگریزی سرکار نے ضبط کیں اور ان کے ذرائع آمدنی مسدود کر دیے۔ ان میں زیادہ تر اصحاب ثروت لوگ تھے، ان کو سزائیں دے کر ان کے بچوں کو مالی اور معاشی اعتبار سے شدید ابتلاؤں میں ڈالا گیا۔ یہ موضوع بھی دیگر موضوعات کی طرح بہت تفصیل طلب ہے۔ اس ضمن میں یہاں اتنی بات عرض کروں گا کہ اہل حدیث نے برصغیر کی ہر اس تحریک میں نہایت جوش و خروش

سے حصہ لیا جس کا نقطہ نظر اس خطہ ارض کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ اس پورے ملک پر ہزار سال سے مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور انگریزوں نے یہ ملک مسلمان حکمرانوں سے چھینا تھا اس لیے قدرتی طور پر یہاں کے مسلمان اپنے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے بے تاب تھے چنانچہ انھوں نے ان تمام تحریکوں سے تعاون کیا اور ان میں شمولیت کی جو اس کی آزادی کے لیے عالم وجود میں آئی تھیں بلکہ بعض سیاسی جماعتیں خود اہل حدیث علما کے قائم کیں۔ مثلاً جمعیت علما ہند ۱۹۱۹ء کے آخر میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز و تحریک سے قائم ہوئی، مجلس خلافت، تحریک ریشمی رومال، حزب اللہ اور مجلس احرار کے قیام میں بھی علما اہل حدیث کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بنگال میں مولانا شریعت اللہ کی رہنمائی میں فرانسیسی تحریک نے جنم لیا، وہ اہل حدیث بزرگ تھے جو ۱۷۸۰ء میں فیروز پور (بنگال) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محسن خاں نے باپ کی جگہ لی۔ محسن خاں کو دو دھومیاں کہا جاتا تھا۔ ان کی ولادت ۱۸۱۹ء میں ہوئی اور ۱۸۶۲ء میں انھوں نے وفات پائی۔ پھر نثار علی عرف تیتو میاں نے آزادی کی تحریک چلائی۔ یہ بھی مولانا شریعت اللہ سے متاثر تھے اور انہی کی طرز پر تحریکی کام کرتے تھے۔ آگے چل کر ان کی تحریک میں تشدد آ گیا تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ آزادی کی دیوی کسی ایک ہی دروازے سے محسن چمن میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف دروازوں پر دستک دیتی ہوئی، کسی ایک دروازے پر آرتھی اور محسن چمن میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ آزادی برصغیر کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یہاں بے شمار تحریکیں اٹھیں اور حصول آزادی کے آخری باب کا آخری فخرہ اپنے پیچھے ایک طویل پس منظر اور لمبی داستان چھوڑ گیا، جس کا مطالعہ اس موضوع کی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM



## مآخذ و مصادر

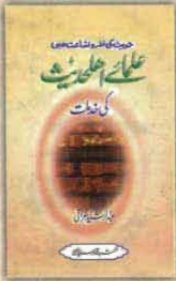
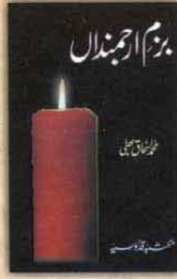
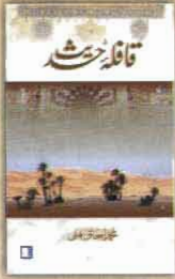
اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

- ۱۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالمیم ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر مقدسی طبع لندن
- ۲۔ احسن البیان فی سیرۃ النعمان مولانا عبد العزیز رحیم آبادی
- ۳۔ الادب المفرد امام محمد بن اسماعیل بخاری
- ۴۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر اندلسی طبع مصر
- ۵۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابوالحسن عزالدین علی ابن اثر جزری
- ۶۔ اسلام کا نظام اراضی مفتی محمد شفیع طبع کراچی
- ۷۔ اسلامی عہد کی عظمت رفتہ قاضی اطہر مبارک پوری طبع دہلی
- ۸۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ حافظ ابن حجر عسقلانی طبع مصر
- ۹۔ اعلام الموقعین امام ابن قیم
- ۱۰۔ الاملۃ والسیاسة ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری طبع مصر
- ۱۱۔ کتاب الاموال ابو عبیدہ قاسم بن سلام طبع حیدر آباد (دکن)
- ۱۲۔ کتاب الانساب ابوسعید عبد الکریم سمعانی
- ۱۳۔ البدایہ والنہایہ ابوالفد اسماعیل ابن کثیر دمشقی طبع مصر
- ۱۴۔ البیان والتبیین ابو عثمان عمرو بن بحر جاحظ طبع مصر

- ۱۵۔ تاج العروس من جواهر القاموس سید مرتضیٰ زبیدی بکراچی۔ طبع کویت
- ۱۶۔ تاریخ بغداد ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی
- ۱۷۔ تاریخ ابن خلدون عبدالرحمن بن محمد بن خلدون۔ مصر
- ۱۸۔ تاریخ سندھ سید ابوظفر ندوی۔ دارالمنصفین۔ اعظم گڑھ
- ۱۹۔ تاریخ الکامل ابن اثیر۔
- ۲۰۔ تاریخ الملوک والامم ابو جعفر محمد جریر طبری۔ مصر
- ۲۱۔ تاریخ معصومی میر محمد معصوم بکراچی۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی
- ۲۲۔ التاريخ الكبير امام محمد بن اسماعیل بخاری۔ حیدر آباد (دکن)
- ۲۳۔ تاریخ یعقوبی احمد بن ابی یعقوب یعقوبی۔ طبع بیروت
- ۲۴۔ تجرید اسماء الصحابہ حافظ ذہبی۔ حیدر آباد (دکن)
- ۲۵۔ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی
- ۲۶۔ تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ مولانا محمد اسماعیل سلفی۔ طبع لاہور
- ولی اللہ کی تجدیدی مساعی
- ۲۷۔ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد
- ۲۸۔ تذکرۃ الحفاظ حافظ ذہبی حیدر آباد (دکن)
- ۲۹۔ تقسیمات الہیہ شاہ ولی اللہ محدث
- ۳۰۔ تقریب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی۔ مصر
- ۳۱۔ تقویم البلدان عماد الدین اسماعیل۔ طبع پیرس
- ۳۲۔ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی۔ مصر
- ۳۳۔ جامع ترمذی ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی۔ کراچی

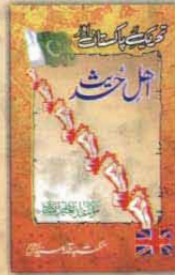
- ۳۴ - کتاب الجرح والتعديل ابو محمد عبدالرحمن بن ابوجاتم رازی۔ حیدر آباد (دکن)
- ۳۵ - جمهرة انساب العرب ابن حزم اندلسی۔ مصر
- ۳۶ - معجم نامہ علی بن حامد بن ابوبکر۔ سندھی ادبی بورڈ۔ حیدر آباد
- ۳۷ - حجة الله البالغة شاہ ولی اللہ دہلوی۔ طبع لاہور
- ۳۸ - کتاب الخراج قاضی ابویوسف۔ طبع مصر
- ۳۹ - کتاب الخراج یحییٰ بن آدم قرشی۔ مصر
- ۴۰ - خلافت امویہ اور ہندوستان قاضی اطہر مبارک پوری۔ سکھر۔ سندھ
- ۴۱ - رجال السند والہند قاضی اطہر مبارک پوری۔ طبع مصر
- ۴۲ - سيرة المرجان في آثار ہندوستان سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی
- ۴۳ - سنن ابی داؤد سلیمان بن اشعث ابوداؤد سجستانی۔ کراچی
- ۴۴ - سنن نسائی ابو عبدالرحمن احمد بن شعيب نسائی۔ طبع لاہور
- ۴۵ - سیرت ابن ہشام ابو محمد عبدالملک بن ہشام۔ طبع مصر
- ۴۶ - سیرت العثمان مولانا شبلی نعمانی
- ۴۷ - صفوة الصفوة ابو الفرج عبدالرحمن ابن جوزی۔ حیدر آباد (دکن)
- ۴۸ - طبقات الامم ابو القاسم صاعد بن احمد اندلسی۔ مصر
- ۴۹ - العمر في خبر من غمر حافظ ذہبی۔ کویت
- ۵۰ - طبقات خلیفہ بن خیاط خلیفہ بن خیاط مصری۔ طبع دمشق
- ۵۱ - عجائب الہند بزرگ بن شہر یار۔ برل
- ۵۲ - عرب و ہند عہد رسالت میں قاضی اطہر مبارک پوری۔ دہلی

- ۵۳۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن قاضی اطہر مبارک پوری۔ طبع مصر  
ورود فیما من الصلحۃ والتابعین
- ۵۴۔ القہر ست محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق  
۵۵۔ الکامل فی التاریخ ابن اثیر جزری  
۵۶۔ کشف الظنون حاجی خلیفہ  
۵۷۔ لسان العرب محمد بن کرم بن منظور افریقی۔ طبع مصر  
۵۸۔ لسان المیزان حافظ ابن حجر عسقلانی۔ حیدرآباد (دکن)۔  
۵۹۔ مجمع بحار الانوار محمد طاہر بن خنی  
۶۰۔ کتاب الحجر ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی، حیدرآباد  
(دکن)
- ۶۱۔ المسالك والممالك محمد بن عبد الکریم شہرستانی۔ مصر  
۶۲۔ معجم البلدان یاقوت حموی  
۶۳۔ منهاج السنۃ امام ابن تیمیہ، المکتبۃ السلفیۃ لاہور  
۶۴۔ مروج الذهب علی بن حسین مسعودی۔ مصر  
۶۵۔ مقالات الاسلامیین ابوالحسن اشعری  
۶۶۔ مقالات سید سلیمان ندوی مرتب صباح الدین عبدالرحمن۔  
دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۶۷۔ میزان الاعتدال حافظ ذہبی۔ حیدرآباد (دکن)  
۶۸۔ نزہۃ الخواطر سید عبدالحی لکھنوی۔ حیدرآباد (دکن)  
۶۹۔ وفيات الاعیان ابن خلکان۔ طبع قاہرہ
- ۷۰۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں قاضی اطہر مبارک پوری  
۷۱۔ کتاب الہند ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی، حیدرآباد (دکن)



تاریخ اور شخصیات  
سے متعلق  
ہماری معیاری کتب  
کا مطالعہ کریں

اور



اسلاف کے تذکرے سے  
اپنے قلوب واذہان  
کی دنیا کو  
روشن کریں۔

